BNUR101DCT

اردو زبان و ادب کی تاریخ

بی۔ اے۔ (آنرس)

چار سالہ پروگرام

پہلا سمسٹر (اردو)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

Copyright © 2025, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-992584-6-4
Course : Urdu Zaban-o-Adab ki Tareekh
First Edition : September 2025
Copies : 4100
Price : 170/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor (Urdu), CDOE, MANUU, Hyderabad

Editorial Board/Editors

Prof. Nikhath Jahan, Professor Urdu
CDOE, MANUU

Prof. Md Naseemuddin Farees, Urdu Consultant
CDOE, MANUU

Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor
CDOE, MANUU

Dr. Md Nehal, Asst. Prof. (C) / Guest Faculty,
CDOE, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Prof. (C) / Guest Faculty, CDOE, MANUU

Dr. Mohd Jafar, Asst. Prof. (C) / Guest Faculty,
CDOE, MANUU

Production

Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu)
CDOE MANUU

Mr. P. Habibulla
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan
Assistant Professor (C)/Guest Faculty,
CDOE MANUU

Mohd Abdul Naseer
Section Officer, CDOE MANUU

Shaik Ismail
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by Dr. Md Nehal, Faculty of Urdu, CDOE, MANUU

Printed at : Karshak Print Solutions Limited, Hyderabad

فہرست

اکائی نمبر	اکائی کا نام	مصنف	صفحہ نمبر
	پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
	پیغام	ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
	کورس کا تعارف	کورس کو آرڈی نیٹر	7
1۔	ہند آریائی اور اردو	ڈاکٹر ارشاد احمد	9
2۔	اردو کی ابتدا: مختلف نظریات	ڈاکٹر ارشاد احمد	27
3۔	اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ	ڈاکٹر میر محبوب حسین	47
4۔	شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر	پروفیسر عرشیہ جبیں	65
5۔	دبستان دہلی	ڈاکٹر محمد شمس الدین	81
6۔	دبستان لکھنؤ	پروفیسر محمد ظفر الدین	99
7۔	شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا: فورٹ ولیم کالج سے قبل	پروفیسر مسرت جہاں	117
8۔	جنوبی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر	ڈاکٹر نشاط احمد	134
9۔	بہمنی دور میں اردو ادب	ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	150
10۔	عادل شاہی دور میں اردو ادب	پروفیسر نکہت جہاں	166
11۔	قطب شاہی دور میں اردو ادب	پروفیسر نکہت جہاں	183
12۔	ولی اور سراج کا عہد	پروفیسر محمد نسیم الدین فریس	200
13۔	فورٹ ولیم کالج	ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد	217
14۔	دہلی کالج۔ جامعہ عثمانیہ	ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی	236
15۔	علی گڑھ تحریک	ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی	267
16۔	ترقی پسند تحریک	پروفیسر مسرت جہاں	283
	نمونہ امتحانی پرچہ		302

مصنفین کی تفصیلات

(Writer's Details)

Dr. Irshad Ahmad, Asst. Prof. (Urdu),CODE, MANUU	ڈاکٹر ارشاد احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد
Dr. Meer Mahboob Hussain, Dept of Urdu, Hyderabad Central University, Hyderabad	ڈاکٹر میر محبوب حسین، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Arshiya Jabeen, Dept of Urdu, Hyderabad Central University, Hyderabad	پروفیسر عرشیہ جبیں، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد
Dr. Shamsuddin, ARD, SRC MANUU، Va ransi, U.P.	ڈاکٹر محمد شمس الدین، اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر، ایس آر سی، مانو، وارانسی، اترپردیش
Prof. Mohd Zafaruddin, Formar Dirctor ,CUCS, MANUU, Hyderabad	پروفیسر محمد ظفر الدین، سابق ڈائرکٹر، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت، مانو، حیدرآباد
Prof. Mosarrat Jahan, HoD, Dept of Urdu, MANUU, Hyderabad	پروفیسر مسرت جہاں، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Dr. Nishath Ahmad, Asst. Prof., Dept of Urdu, Hyderabad Central University, Hyderabad	ڈاکٹر نشاط احمد، اسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد
Dr. BiBi Raza Khatoon, Associate Professor, Dept of Urdu, MANUU, Hyderabad	ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Nikhath Jahan, Professor (Urdu), CDOE, MANUU	پروفیسر نکہت جہاں مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد
Prof. Md Naseemuddin Farees, Consultant (Urdu), CDOE, MANUU, Hyderabad	پروفیسر محمد نسیم الدین فریس، کنسلٹنٹ (اردو) مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد
Prof.. Shamshul Hoda Dariyabadi, Dept. of Urdu, MANUU, Hyderabad	پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Majeed Bedar (Retd.),HoD, Dept of Urdu, Osmania University, Hyderabad	پروفیسر مجید بیدار (سبکدوش)، سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

پروف ریڈرس(Proofreaders):

1. ڈاکٹر محمد نہال افروز
2. ڈاکٹر محمد اکمل خان
3. ڈاکٹر محمد جعفر

ٹائٹل پیج(Title Page):

ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ +A حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری / گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات و اطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہوگا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم و تدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو / ہندی / انگریزی / عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جا رہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضااللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم (نظامت فاصلاتی تعلیم)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے طلبا کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر اردو زبان وادب کی تاریخ کے موضوع پر درسی مواد تیار کیا ہے۔ یہ مواد چار سالہ بی۔اے۔ پروگرام کے پہلے سمسٹر کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یو نیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبا کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یو جی سی کی اسی ہدایت کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا ہے۔ یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی۔ موجودہ تعلیمی ضرورت کے پیش نظر این ای پی 2020 (NEP-2020) کے تحت اردو طلبا کے لیے خود اکتسابی مواد تیار کیا جارہا ہے۔ یہ مواد چار سالہ (آٹھ سمسٹر) کورس کے لیے تیار کیا جارہا ہے جس کی تیاری میں ملک بھر کے مختلف جامعات اور تعلیمی اداروں کے ماہر اساتذہ اپنا تعاون کر رہے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے نہ صرف اردو طلبا کی ضرورت کی تکمیل ہوگی بلکہ اردو داں طبقے کے لیے بھی یہ مواد قدر مفید ثابت ہوگا۔

نئے نصاب کی تیاری میں مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم کی موجودہ کتب میں دستیاب مطلوبہ مواد کو ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور نئے نصاب کے تقاضوں کے پیش نظر نئی اکائیاں بھی لکھوائی گئی ہیں جو کورس کے خود اکتسابی مواد کا حصہ بنی ہیں۔

اس کتاب میں مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی ہے جو یکساں نصاب کے تحت روایتی اور فاصلاتی تعلیم دونوں کی ضرورتوں کو بیک وقت پورا کر سکے۔ ہر اکائی کے تحت موضوع سے متعلق مواد کے علاوہ' اکتسابی نتائج، کلیدی الفاظ، نمونہ امتحانی سوالات اور تجویز کردہ اکتسابی مواد کی فہرست بھی دی گئی ہیں۔ امید ہے یہ معلومات طلبا کے لیے بے حد معاون ہوں گی۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم چار سالہ بی۔اے۔ کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ پہلے سمسٹر کے اس پرچے کا عنوان ''اردو زبان وادب کی تاریخ'' ہے۔ اس پرچے میں کل سولہ اکائیاں ہیں۔ یہ پرچہ اردو زبان وادب کی تاریخ کے تمام اکتسابی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جس میں اردو زبان کی تاریخ، اردو زبان کے مختلف نظریات، دبستان، ادارے اور تحریکات وغیرہ پر تفصیلی مواد پیش کیا گیا ہے۔

یہ نصابی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی بیش قیمت آرا ہمیں اس کتاب کو مزید بہتر، کارآمد اور مفید بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد
کورس کوآرڈی نیٹر

اردو زبان وادب کی تاریخ

بلاک : I اُردو زبان کا آغاز و ارتقا

اکائی 1 : ہند آریائی اور اردو

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 زبان کی تعریف

1.2.1 زبان اور بولی

1.3 ہند آریائی کا پس منظر

1.3.1 ہندوستان میں مختلف لسانی گروہ کی آمد

1.3.2 زبانوں کا گھر ہندوستان

1.4 ہند آریائی کا ارتقا

1.4.1 ہند آریائی کے ادوار

1.4.1.1 قدیم ہند آریائی دور

1.4.1.2 وسطی ہند آریائی دور

1.4.1.3 جدید ہند آریائی دور

1.5 جدید ہند آریائی اور اردو

1.5.1 مغربی ہندی اور اردو

1.5.2 مغربی ہندی کا علاقہ

1.5.3 مغربی ہندی کی بولیاں اور اردو سے ان کے رشتے

1.6 اکتسابی نتائج

1.7 کلیدی الفاظ

1.8 نمونۂ امتحانی سوالات
1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

انسان اپنے احساسات، جذبات، خیالات اور تجربات دوسروں تک پہنچانے اور آپس میں بات چیت کرنے کے لیے جس وسیلے کا استعمال کرتا ہے، اسے زبان کہتے ہیں۔ زبان کسی بولی یا بولیوں کے مجموعے سے بنتی ہے۔ انسان عام بول چال کے لیے بولیوں کا استعمال کرتا ہے۔ بولیاں مسلسل تبدیلیوں کے بعد زبان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ زبانیں باہم مختلف بھی ہوتی ہیں اور ان میں مماثلتیں بھی ہوتی ہیں۔ زبانوں کا علم جاننے والوں نے زبانوں کے ان اختلافات اور مماثلتوں کی بنیاد پر انھیں کئی خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس اکائی میں ہم زبانوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور ارتقا کی بنیاد پر زبانوں کے مختلف ادوار اور ان کے خاندانوں کے بارے میں تفصیل سے سمجھیں گے۔ اردو زبان کا تعلق زبانوں کے کس دور اور کس خاندان سے ہے، یہ بھی پڑھیں گے۔ اس کے علاوہ مغربی ہندی کی بولیوں اور اردو سے ان کے رشتوں کے بارے میں پڑھیں گے۔ اکائی کے آخری حصے میں اکتسابی نتائج اور مشکل الفاظ کے معنی دیے جارہے ہیں، جس سے آپ اس اکائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں، جن میں معروضی جوابات کے حامل سوالات، مختصر جوابات کے حامل اور طویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔ ان کی مدد سے آپ اپنے امتحان کی بہتر تیاری کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر کئی کتابوں میں اہم مواد موجود ہے۔ یہ کتابیں کتب خانوں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، ان میں سے چند کتابیں مزید مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتابیں اس موضوع کی بہتر تفہیم کے لیے آپ کی معاون ہوں گی۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- زبان کی تعریف، زبان اور بولی سے رشتے بیان کر سکیں۔
- ہندوستان میں مختلف لسانی گروہ کی آمد اور ہند آریائی کے آغاز سے واقف ہو سکیں۔
- ہندوستان میں ہند آریائی کے مختلف ادوار کو سمجھ سکیں۔
- مغربی ہندی کی بولیوں اور اردو سے ان کے رشتوں کو واضح کر سکیں۔

1.2 زبان کی تعریف

انسان کی سماجی زندگی کا تصور زبان کے بغیر محال ہے کیونکہ انسان اپنی زندگی کی ضروریات کے لیے سماج پر منحصر ہے اور سماج کا قیام

انسانوں کے باہم اشتراک سے عمل میں آیا ہے۔اس باہمی اجتماع کے لیے میل جول اور اظہار و ترسیل کے لیے زبان سب سے موثر ذریعہ ہے۔اس لیے انسانوں کے سماج پر انحصار کی ضرورت نے ہی زبان پیدا کی۔ انسان ہر چیز یا عمل کے لیے، خواہ وہ مرئی ہو یا غیر مرئی، ایک لفظ اختراع کرلیتا ہے، جیسے لفظ 'پانی' جسے انسان نے اپنی پیاس بجھانے کی بنیادی ضرورت کے لیے اختراع کیا ہے۔ انسانی سماج کے دوسرے گروہوں میں پانی کی جگہ جل، آب، واٹر جیسے دوسرے متعدد الفاظ رائج ہیں جو ایک ہی چیز کے لیے انسانوں نے اختراع کیے ہیں۔ یہ سبھی الفاظ صوتی علامتیں ہیں، جس سے انسان ایک ہی چیز پانی مراد لیتا ہے۔ صوتی علامتیں وہ ہیں جو انسان کے صوتی اعضاء کی مدد سے تلفظ ہو کر لفظوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور کسی چیز یا عمل کی نمائندگی کرتی ہیں۔ڈاکٹر اقتدار حسین خان لسانیات کی رو سے زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے سماج میں اظہار خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔" شکیل الرحمان کے مطابق "زبان جذبات کے اظہار کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔زبان جذبات کی سانس ہے۔"

زبان انسان کے اعضائے تکلم سے نکلنے والی آوازیں ہیں جنہیں وہ اپنے ذہن کے خیالات سے وہ دوسرے انسانوں کو واقف کرانے کے مقصد سے نکالتا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کے مطابق زبان چند ایسی مخصوص آوازوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو صوتی اعضاء کے عمل سے وجود میں آتے ہیں۔ ان آوازوں سے الفاظ بنتے ہیں۔ الفاظ جب مخصوص ترکیبوں میں آتے ہیں تو جملے وجود میں آتے ہیں۔ اس طرح آواز سے جملے تک ایک نظام ہوتا ہے۔یعنی آوازوں کی کسی خاص ترتیب سے کسی خاص معنی کے لیے کوئی لفظ تشکیل پاتا ہے۔

پروفیسر نسیم الدین فریس زبان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "زبان ارادے کے ساتھ نکالی گئی آوازوں کا مجموعہ ہے۔ ... ارادے سے مراد یہ کہ ہم اپنے خیالات یا جذبات کے اظہار کے لیے یا اپنی ضروریات کی تکمیل کی غرض سے ایسی آوازیں نکالتے ہیں، جنھیں کہنے والا اور سننے والا، دونوں آپس میں سمجھتے ہیں۔ گویا ان آوازوں کا کوئی معنی و مطلب ہوتا ہے۔"جب کسی انسانی گروہ یا سماج کے افراد باہم تبادلہ ءخیال کے لیے زبان کا استعمال کرتے ہیں تو وہ صوتی اور غیر صوتی دونوں شکلوں کو سمجھتے ہیں۔ صوتی شکلیں زبان کی بولی جانے والی شکلیں ہیں جب کہ غیر صوتی شکلیں وہ علامات ہیں جنہیں ہم کسی شاہراہ سے گذرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، جیسے ٹریفک نظام کے لیے ہدایات سرخ، سبز اور زرد روشنی کے ذریعے یا کسی اسکول، اسپتال کی موجودگی کی اطلاع کے لیے مخصوص شکلیں ایسی ہی علامات ہیں۔ کسی زبان کی تحریری شکل بھی غیر صوتی علامات ہیں جن کا معنی اور مطلب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ 'پانی' تحریری شکل میں ہو تو اس تحریر کو دیکھنے والا اس لفظ سے وہی معنی اور مطلب سمجھے گا جو لفظ 'پانی' کی صوتی ادائیگی سے سمجھے گا۔ زبانیں غیر صوتی اظہار کے لیے جن شکلوں کا استعمال کرتی ہیں اسے رسم خط کہتے ہیں۔ کسی زبان کی تحریری شکل اس کا غیر صوتی اظہار ہے۔

1.2.1 زبان اور بولی:

زبان کا صوتی اظہار بول کر ہوتا ہے۔ اس لیے زبان کے لیے عام طور پر بولی کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ زبان اپنے ابتدائی دور میں بولی یعنی صرف بولی جانے والی زبان کی شکل میں ہوتی ہے۔ جب کوئی بولی اپنی ارتقا کی اس سطح تک پہنچ جاتی کہ اس کی قواعد متعین ہو جائے اور اسے ادبی اظہار کے لیے استعمال کیا جانے لگے تو وہ بولی کی سطح سے اوپر اٹھ کر زبان کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے۔ یعنی زبان بولی

کی معیاری اور معین شکل ہے۔ جب زبان کے بولنے والوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور وہ مختلف علاقوں میں استعمال ہونے لگتی ہے تب اس میں تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں کسی زبان کی کئی شاخیں بولیوں کی شکلوں میں فروغ پاتی ہیں۔ یہ شکلیں اپنی اصل زبان سے کسی حد تک مختلف بھی نظر آتی ہیں۔ کسی زبان کی اصل اور معیاری شکل سے مختلف لیکن بنیادی طور پر اکثر مماثلتوں کی وجہ سے انھیں اس زبان کی بولیاں کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی یوپی اور مشرقی یوپی کی اردو زبان میں جس حد تک فرق ہے اسی طرح شمالی بہار اور جنوبی بہار کی اردو زبان کے استعمال میں ہے۔ کشمیر، حیدرآباد، پنجاب، ممبئی وغیرہ کی بولیاں اردو زبان کی ہی علاقائی شکلیں ہیں جنھیں اردو کی بولیاں کہہ سکتے ہیں۔

علم زبان کے چند ماہرین کے نزدیک کسی وسیع علاقے میں بولی جانے والی زبان میں طویل عرصے کے بعد مقامی زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مقامی رنگ اور خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ رنگ لوگوں کی گفتگو اور لب ولہجے پر اس حد تک اثر انداز ہوتا ہے کہ یہ اصل زبان سے مختلف نظر آتی ہے۔ ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں جب یہ فرق اور اختلاف واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے تو اسے کسی زبان کی ذیلی شاخ یا بولی کہتے ہیں۔ بولی کا تعلق زبان کی تقریری شکل سے ہے جب کہ تحریری شکل زبان کی اصل اور معیاری شکل ہوتی ہے کیونکہ وہ قواعد اور لغات کی پابندیوں کی گرفت میں ہوتی ہے۔ سیاسی اور تہذیبی مرکز میں زبان کی معیاری شکل رائج ہوتی ہے، جیسے دلی کی اردو کو معیاری تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب مغلوں کا پایہ تخت آگرہ تھا تو برج بھاشا کا دور دورہ تھا جو اس علاقے کی زبان تھی۔ جب مغلوں کا پایہ تخت دہلی منتقل ہوا تو یہاں کی بولی کھڑی بولی کا اس قدر عروج ہوا کہ اسی کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل نے اردو زبان جیسی اہم زبان کا درجہ حاصل کیا۔ میکس مولر کا بھی خیال ہے کہ متعدد بولیوں کے باہمی اختلاف کم سے کم ہوتے چلے گئے اور وہ ایک منظم زبان کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔

1.3 ہند آریائی کا پس منظر

1.3.1 ہندوستان میں مختلف لسانی گروہ کی آمد:

ہندوستان دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ایک وادی سندھ کی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ ہندوستان سندھ کے علاوہ گنگا، جمنا، نرمدا، کرشنا جیسی متعدد اہم دریاؤں کی وادیوں اور زرخیز میدانوں کا خطہ رہا ہے۔ اس کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں ایک کے بعد ایک دنیا کے مختلف خطوں سے انسانی کارواں آتے رہے اور ہندوستانی دریاؤں کے زرخیز میدانوں میں آباد ہوتے گئے۔ اس خطے کی فضا، آب وہوا، زرخیز زمینوں کی تلاش میں آنے والے یہاں مستقل بس گئے۔ ہندوستان میں زبانوں اور بولیوں کی کثرت اور تنوع اسی حقیقت کا ثبوت ہے۔

یہاں آکر بسنے والوں میں سب سے پہلے افریقی قبائل 'نگریٹو' تھے، پھر فلسطین سے آنے والے 'پروٹو آسٹرلوائیڈ' تھے۔ ان کے بعد بحیرہ روم سے 'آسٹرک' آئے۔ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح 'دراوڑ' آئے۔ یہ بحیرہ روم اور ایشیائے کوچک کے باشندے تھے اور یہاں آنے سے قبل عراق میں طویل عرصہ رہے تھے۔ آج بھی جنوبی ہندوستان میں یہ دراوڑ اپنی ممتاز تہذیبی شناخت کے ساتھ آباد ہیں۔ آریاؤں سے قبل ہندوستان میں انھوں نے ترقی یافتہ قوم کے طور پر عروج حاصل کیا۔ ہڑپا اور موہنجوداڑو جیسے قدیم انسانی تہذیب کے مراکز انھوں نے ہی قائم کیے۔ آج کی ہندوستانی تہذیب کی بنیاد دراوڑی تہذیبی عناصر ہیں۔ منگول، یونانی، شک، کشان اور ہون کا گروہ بھی

ہندوستان آیا لیکن ان کے اثرات اتنے گہرے مرتب نہیں ہوئے جتنے دراوڑ جیسی قوم کے مرتب ہوئے۔

دراوڑ قوم کے بعد ہندوستان آکر بسنے والی قوموں میں سب سے اہم 'آریا' قوم ہے جو1500 قبل مسیح میں وسط ایشیا سے چل کر طویل عرصے ایران میں قیام پذیر ہوئی۔ ایران سے یہ چھوٹے بڑے کاروان کی شکل میں ہندوستان میں وارد ہوتے رہے۔

ہندوستان میں ان کا سامنا دراوڑ جیسی ترقی یافتہ قوم سے ہوا۔ آریوں کے یلغار نے دراوڑوں کو جنوبی ہندوستان میں دھکیل کر انھیں جنوبی ہند تک محدود کر دیا۔ آریاؤں کی تہذیب نے دراوڑی تہذیب سے اختلاف کے باوجود اشتراک اور اختلاط کے مراحل طے کیے۔ آج کی ہندوستانی تہذیب میں دراوڑ کے علاوہ آریائی تہذیبی کے عناصر خلط ملط ہیں۔

دسویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں عرب، ترک، افغان اور ایرانیوں کی آمد شروع ہوئی۔ یہ تاجروں اور صوفیوں کی مختصر تعداد کے علاوہ حملہ آوروں کی شکل میں مختلف قوموں کی افواج کے ساتھ قابل لحاظ تعداد میں ہندوستان آئے۔ تیرہویں صدی میں جب منگولوں کے حملوں نے بغداد اور مسلم دنیا کے کئی ملکوں کو تباہ وبرباد کر دیا تو پناہ گزینوں کی کثیر تعداد ہندوستان میں در آئی۔ سترہویں صدی عیسوی کے بعد پرتگیزی، ڈچ، فرانسیسی، انگریز اور دیگر یوروپی ملکوں کے باشندے بھی ہندوستان آئے جن میں انگریزوں کی تعداد غالب تھی۔

1.3.2 زبانوں کا گھر ہندوستان:

جب دراوڑی تہذیب ہندوستان میں عروج پر تھی آریاؤں کے قافلے وسط ایشیا کے خشک کوہستانی علاقوں کو چھوڑ کر ایران اور افغانستان جیسے مقامات ٹھہرتے ہوئے ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں وارد ہونے لگے۔ ان نو وارد قافلوں کا ٹکراؤ دراوڑوں سے ہوا اور آریاؤں نے دراوڑوں کو جنوبی ہندوستان کی جانب ڈھکیل دیا اور شمالی ہند کے وسیع میدانی علاقوں پر قابض ہو گئے۔

آریاؤں کی تہذیب اور زبان شمالی ہند میں پھیلنے لگی۔ آریوں نے دراوڑی تہذیب کے بہترین زندہ عناصر کو آریائی تہذیب میں ضم کر کے انھیں آریائی تہذیب کا ناگزیر حصہ بنا دیا۔ آریاؤں کی سب سے اہم دین زبان ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے براہمی رسم الخط کو فروغ دیا جو اردو کے علاوہ شمالی ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آریائی سماج ہندوستان آنے کے بعد اونچے اور نچلے طبقے میں منقسم ہو چکا تھا۔ برہمن طبقہ آریاؤں کے عقائد کی تشریح کرتا تھا۔ آریوں کے عقائد کو محفوظ کرنے کے لیے برہمنوں نے ویدوں کو مدون کیا۔ اس عہد کے سماج میں برہمن اعلی اور تعلیم یافتہ حیثیت کا حامل طبقہ تھا۔ برہمنوں کی زبان سنسکرت تھی جس کے قواعد مرتب کر کے اس کی حد بندیاں سختی کے ساتھ کی گئیں تاکہ یہ صرف برہمنوں یا خواص کے لیے مخصوص رہے۔ اس عہد کا تہذیبی سرمایہ سنسکرت میں ہی محفوظ ہے۔ سنسکرت ڈراموں میں برہمن اور حکمراں طبقہ کے مکالمے سنسکرت میں ہوتے جب کہ عام لوگ اور خواتین مقامی پراکرت زبانوں میں اپنے مکالمے ادا کرتیں۔ اس طرح پراکرت عام لوگوں کی زبان بن گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کا فروغ ہونے لگا۔

آریائی تہذیب اور زبان کے شمالی ہند میں غلبہ اور فروغ کی وجہ سے ہند آریائی شکل کو استحکام ملا۔ ہند آریائی شکل کے اختیار کرنے سے قبل اسے ہند ایرانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیوں کہ وسط ایشیا سے جب آریائی قبائل ہندوستان وارد ہونے لگے تو تقریباً پانچ سو سال تک کا عرصہ انھوں نے ایران میں گزارا۔ ہندوستان میں ان کے آنے اور بسنے کا دور1500 قبل مسیح سے 1200 قبل مسیح ہے۔ آریاؤں کی

زبان، زبانوں کے ہند یوروپی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو زبانوں کا سب سے بڑا اور اہم خاندان تسلیم کیا جاتا ہے۔ زبانوں کا مطالعہ کرنے والے ماہرین زبان یا ماہر لسانیات نے دنیا بھر کی سینکڑوں زبانوں کو ان کی مماثلتوں اور اختلافات کی بنیاد پر آٹھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے جنھیں زبانوں کا خاندان یا لسانی خاندان کہا جاتا ہے۔ یہ لسانی خاندان ہیں: 1۔ سامی، 2۔ افریقی بانتو، 3۔ دراوڑی، 4۔ ہند چینی، 5۔ ملائی خاندان، 6۔ منڈا، 7۔ امریکہ کی عہد قدیم کی زبانیں، 8۔ ہند یوروپی خاندان۔ ان میں سب سے اہم خاندان ہند یوروپی خاندان کی مشہور شاخیں یہ ہیں: 1۔ آرمینین، 2۔ بالٹک یا سلافی خاندان، 3۔ البانوی، 4۔ یونانی، 5۔ اطالوی، 6۔ کیلٹک، 7۔ ٹیوٹانی، 8۔ ہند ایرانی۔ اس اکائی کے موضوع ہند آریائی کا تعلق ہند ایرانی سے ہے۔ ہند ایرانی کی بھی دو شاخیں ہیں: 1۔ ہند ایرانی اور 2۔ ہند آریائی

1.4 ہند آریائی کا ارتقا

1.4.1 ہند آریائی کے ادوار:

ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1۔ قدیم ہند آریائی، 2۔ وسطی ہند آریائی، 3۔ جدید ہند آریائی

1.4.1.1 قدیم ہند آریائی دور:

قدیم ہند آریائی کا دور 1500 قبل مسیح سے 500 قبل مسیح کے درمیان رہا جو تقریبا 1000 سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ قدیم ہند آریائی کے دو ادوار ہیں: 1۔ ویدک سنسکرت اور 2۔ کلاسیکل سنسکرت۔

ویدک سنسکرت: ویدک سنسکرت، کلاسیکل سنسکرت یا سنسکرت کی ہی قدیم شکل ہے۔ سنسکرت کے معنی شدھ بھاشا یا پاک صاف، مقدس اور افضل زبان ہے۔ سنسکرت کے پہلے دور کو ویدک سنسکرت کا دور اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس دور میں برہمنوں کی مقدس کتابیں تحریری شکل میں محفوظ کی گئیں جنھیں وید مقدس کہتے ہیں۔ وید چار ہیں: رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید۔ ان کے علاوہ اپنشد بھی ضبط تحریر میں لائے گئے۔ یہ مذہبی کتابیں برہمن عالموں کے حافظے میں تھیں۔ جب ہندوستان میں آریاؤں کا مقابلہ دراوڑ جیسی ترقی یافتہ تہذیب سے ہوا تب برہمنوں کو یہ تشویش ہوئی کہ کہیں وید کی زبان اور عقائد دیگر زبانوں اور عقائد سے متاثر یا آلودہ نہ ہو جائیں لہذا انھیں تحریری شکل دی گئی۔

کلاسیکل سنسکرت: اس دور کو کلاسیکل سنسکرت کا دور اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ سنسکرت کی اعلی اور کلاسیکی تصنیفات جو آفاقی حیثیت رکھتی ہیں، اسی دور میں سامنے آئیں۔ ان میں رامائین اور مہابھارت جیسی شہرہ آفاق تخلیقات شامل ہیں۔ اس دور میں سنسکرت زبان کا فروغ اور توسیع ہوئی اور سنسکرت شمالی ہند کے مرکزی علاقہ کے علاوہ مشرقی اور مغربی خطے میں بھی رائج ہو گئی جہاں مقامی پراکرت زبانوں سے اس کا اختلاط شروع ہوا اور تین مقامی بولیاں وجود میں آئیں۔ مشرقی خطے میں رائج بولی کو 'پراچیہ'، شمال مغربی خطے میں رائج بولی 'ادیچیہ' اور ان دونوں کے درمیانی علاقے کی بولی کو؛ مدھیہ دیشیہ' کہا گیا۔ مدھیہ دیشیہ کے علاقہ میں بعد میں 'مغربی ہندی' کی بولیاں جیسے کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا وغیرہ آج بھی بولی جاتی ہیں۔

1.4.1.2 وسطی ہند آریائی:

وسطی ہند آریائی کا دور 500 قبل مسیح سے 1000 عیسوی تک ہے۔ وسطی ہند آریائی کے تین ادوار ہیں: 1۔ پالی، 2۔ پراکرت، 3۔ اپ بھرنش۔ جب سنسکرت کی توسیع ہوئی اور یہ شمالی ہند کے محدود مرکزی علاقہ سے باہر نکل کر شمال مغربی اور مشرقی علاقوں تک پھیل گئی تو یہ زبان بالکل بدل گئی۔ سنسکرت کی بدلی ہوئی یہ شکل پراکرت کہلائی۔ تبدیلی کے اس دور کو وسطی ہند آریائی دور کہتے ہیں۔ اس دور میں مختلف پراکرتوں کا فروغ ہوا۔

پالی: پالی کو وسطی ہند آریائی کی اولین زبان کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے اسے پہلی پراکرت یا ابتدائی پراکرت بھی کہا جاتا ہے۔ پالی پراکرت کی دو شکلیں ہیں: 1۔ پالی، 2۔ اشوکی پراکرت

پالی: اس زبان کو ویدک اور کلاسیکل سنسکرت دور کے اہم مذاہب 'بدھ' اور 'جین' مذاہب کی مذہبی تصانیف کے لیے استعمال کیا گیا۔ گوتم بدھ اور مہاویر جین نے اپنے مذاہب کی تبلیغ اور اپنے پیروؤں کو تلقین کے لیے اسی زبان کو استعمال کیا۔

اشوکی پراکرت: پہلی پراکرت کی دوسری شکل کو اشوکی پراکرت کہتے ہیں کیوں کہ سمراٹ اشوک نے بدھ مذہب کی تبلیغ کے لیے اس زبان کو استعمال کیا اور بڑی بڑی لاٹوں (ستونوں) پر بدھ تعلیمات کو کندہ کروا کر ملک کے طول و عرض میں نصب کروایا۔

پراکرت: پراکرت 'پرکرتی' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے فطرت۔ سنسکرت جسے برہمنوں شدھ مانتے تھے اور اسے دیو بانی کہتے تھے، کسی حد تک گڑھی ہوئی پر تصنع زبان تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ زبان فطری طور پر پروان چڑھی، اس لیے اسے پراکرت کہا گیا۔ یہ ایک زبان نہیں بلکہ ایک جیسی کئی زبانوں کو پراکرت کہا جاتا تھا۔ ان پراکرتوں میں جلد ہی ادب تخلیق کیا جانے لگا اور یہ ڈراموں میں بھی استعمال ہونے لگیں۔ یہ ادبی پراکرتیں پانچ تھیں:

شورسینی پراکرت: یہ پراکرت اس علاقہ میں پھلی پھولی جو قدیم ہند آریائی دور میں "مدھیہ دیشیہ" کہلاتا تھا۔ اس پر سنسکرت کے بہت گہرے اثرات تھے اور سنسکرت ڈراموں میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ شورسینی پراکرت سنسکرت کے بعد ملک کی سب سے ترقی یافتہ ادبی زبان تھی۔

ماگدھی پراکرت: یہ جنوبی بہار کے مگدھ علاقہ کی زبان تھی جو قدیم آریائی دور میں 'پراچیہ' بولی کا علاقہ تھا۔ یہ سنسکرت ڈراموں کے نچلے طبقے کے کرداروں کے مکالموں کی زبان تھی۔

اردھ ماگدھی: یہ شورسینی اور ماگدھی پراکرت کے درمیانی علاقہ یعنی بہار اور الہ آباد کے بیچ کی زبان تھی۔ جین مذہب کی تصانیف بھی اس زبان کی قدیم شکل میں ملتی ہے۔

مہاراشٹری پراکرت: یہ مہاراشٹر کے علاقہ کی ادبی پراکرت تھی جس کا استعمال موسیقی میں بھی کیا جاتا تھا۔

پشاچی پراکرت: یہ پراکرت پنجاب اور کشمیر کے وسیع علاقہ میں بولی جاتی تھی جس پر ایرانی زبانوں کے اثرات بھی تھے۔

اپ بھرنش: اپ بھرنشوں کا دور پراکرتوں کے بعد 500 عیسوی سے 1000 عیسوی کا دور ہے۔ اپ بھرنش کے معنی بھرشٹ اور

بگڑی ہوئی زبان ہے۔ جب پراکرتوں نے ادبی اور معیاری زبان کا درجہ حاصل کر لیا اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کی زبان بن گئی تو عام لوگوں سے ان کا رشتہ کم ہو گیا۔ عام لوگوں نے ان پراکرتوں کو اپنی سہولت آزادانہ طریقہ سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان میں تبدیلیاں آئیں اور یہ اپ بھرنش کی شکل میں فروغ پانے لگیں۔ ان تبدیلیوں کو فطری نہ مان کر تعلیم یافتہ طبقہ نے انھیں زبان کے بگاڑ اور بھرشت ہونے سے تعبیر کیا گیا۔

زبانوں میں تبدیلیوں کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ جس طرح سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئیں اسی طرح پراکرتوں کے علاقوں میں اپ بھرنشیں پیدا ہوئیں۔ اس طرح اپ بھرنشیں بھی پانچ ہیں: 1۔ شورسینی پراکرت سے شورسینی اپ بھرنش، 2۔ ماگدھی پراکرت سے ماگدھی اپ بھرنش، 3۔ اردھ ماگدھی پراکرت سے اردھ ماگدھی اپ بھرنش، مہاراشٹری پراکرت سے مہاراشٹری اپ بھرنش، 5۔ شمال مغربی جس کی دو شاخیں 1۔ پراچڑ اور 2۔ کیکئی اپ بھرنشیں ہیں۔

1.4.1.3 جدید ہند آریائی دور:

اپ بھرنشوں کو بھی تعلیم یافتہ طبقہ نے اپنا لیا اور یہ اپ بھرنشیں بھی ادبی اور معیاری زبانیں بن کر پراکرتوں کی طرح محدود ہو گئیں۔ ان اپ بھرنشوں سے جدید ہند آریائی بولیاں پیدا ہوئیں۔ اس کا آغاز 1000 عیسوی سے ہوتا ہے۔ اس دور میں جدید زبانیں اور بولیاں مختلف علاقوں میں رائج اپ بھرنشوں سے پیدا ہوئیں۔ اس لیے ان میں ان علاقوں کی مقامی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ان ہی علاقائی خصوصیات کی بنیاد پر جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کو علم زبان کے ماہر جارج گریرسن نے چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ گروہ اور ان کی بولیاں درج ذیل ہیں:

1۔ اندرونی زبانیں: مغربی ہندی (کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی)، مشرقی پنجابی، گجراتی، راجستھانی (مارواڑی / میواڑی، مالوی، جے پوری، میواتی)، بھیلی، خاندیشی۔
2۔ بیرونی زبانیں: مغربی پنجابی، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، میتھلی، مگہی، بھوج پوری۔
3۔ وسطی زبانیں: مشرقی ہندی (اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی)۔
4۔ پہاڑی بولیاں: نیپالی / گورکھالی، کمایونی / گڑھوالی، شملہ اور اطراف کے پہاڑی علاقوں کی بولیاں۔

1.5 جدید ہند آریائی اور اردو

جدید ہند آریائی زبانوں میں اہمیت اور مقبولیت کے اعتبار سے اردو زبان کا خاص مقام ہے۔ یہ جنوب ایشیا کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور دنیا کی متعدد یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ خاص ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان کی آفیشیل زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اردو کا ہند آریائی زبانوں سے رشتہ سنسکرت، شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش کے سلسلے سے ہوتا ہوا شورسینی اپ بھرنش کی اہم شاخ مغربی ہندی کی بولیوں سے استوار ہوتا ہے۔ اس لیے اردو اور ہند آریائی کے رشتے کو سمجھنے کے لیے مغربی ہندی اور اس کی بولیوں سے اردو کے راست رشتوں کو تفصیل سے سمجھنا ضروری ہے۔

1.5.1 مغربی ہندی اور اردو:

مغربی ہندی، ہند آریائی زبانوں میں ایک اہم پڑاؤ ہے۔ شور سینی اپ بھرنش کی بول چال کو ماہر لسانیات گریرسن نے 'مغربی ہندی' کا نام دیا۔ وسطی ہند آریائی کے تیسرے دور یعنی اپ بھرنش اور جدید ہند آریائی دور کی زبانوں کے درمیانی اور عبوری دور میں مدھیہ دیش کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح مغربی ہندی کا تعلق ایک طرف شور سینی اپ بھرنش سے اور دوسری طرف جدید ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ مغربی ہندی کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ دہلی اور اس کے اطراف کی پانچ بولیوں کا اجتماعی نام ہے۔ مغربی ہندی کی ان پانچ بولیوں میں سے تین بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا نے جدید ہند آریائی زبان اردو کے آغاز وارتقا میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شور سینی اپ بھرنش سے ہے۔ یہ اپ بھرنش شور سینی پراکرت کے علاقے میں بولی جانے والی اپ بھرنش ہے۔ شور سینی اپ بھرنش اس عہد کی بولیوں میں سب سے ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی اور اس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔

مغربی ہندی اسی شور سینی اپ بھرنش کی جانشین ہے۔ مغربی ہندی دراصل کسی مخصوص زبان کا نام نہیں بلکہ یہ شور سینی اپ بھرنش سے نکلنے والی پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ بولیاں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ یہ پانچ بولیاں ہیں: (1) کھڑی بولی (2) ہریانی (جاٹو یا بانگڑو)، (3) برج بھاشا، (4) قنوجی اور (5) بندیلی۔ ان سبھی بولیوں کو گریرسن نے مغربی ہندی کا اجتماعی نام دیا ہے کیونکہ یہ لسانیاتی اعتبار سے باہم مماثلت رکھتی ہیں۔ ان بولیوں کی اپنی صوتی اور صرفی و نحوی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس لسانی گروہ کو ایک علاحدہ اور ممتاز حیثیت دی گئی ہے۔ انھیں مغربی ہندی اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ مشرقی ہندی کے علاقے کے مغرب میں بولی جانے والی بولیاں ہیں۔ ''مشرقی ہندی'' کی لسانی اصطلاح بھی گریرسن نے استعمال کی ہے۔ مشرقی ہندی تین بولیوں کا ایک اجتماعی نام ہے جس میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں اور یہ مغربی ہندی کے علاقے کے مشرق میں بولی جاتی ہیں۔

دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کی نشاندہی سب سے پہلے امیر خسرو (1253-1325) نے اپنی مشہور مثنوی '' نہ سپہر'' (1318) کے تیسرے سپہر میں کی ہے۔ امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں اپنے عہد کے ہندوستان کی بارہ زبانوں کی فہرست دی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب میں یہ فہرست اس طرح درج کی ہے :

> ''(۱) سندھی، (۲) لاہوری (پنجابی)، (۳) کشمیری، (۴) کبر یا دگر ؟، (۵) دھور سمندری (کنڑ۔ دور سمندر' کرناٹک کا ایک مشہور قدیم شہر تھا۔ موجودہ ہلے بید ، (۶) تلنگی، (۷) گجر (گجراتی)، (۸) معبری (تمل، معبر) موجودہ اضلاع مدورا، رام ناد اور تنے ویلی، (۹) گوری (مغربی بنگال کے گوڑ یا لکھنوتی کی زبان)، (۱۰) بنگال (اس سے مراد مشرقی بنگال کی زبان ہے)، (۱۱) اَود (اودھی)، (۱۲) ''دہلی و پیرامنش'' کی زبان یعنی زبانِ دہلوی اور اس کے نواح کی کھڑی بولی اور ہریانوی۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص۷۸)

خسرو نے اپنے عہد کے ہندوستان کی گیارہ زبانوں کے علاوہ بارہویں زبان کا نام '' دہلی و پیرامنش ''یعنی دہلی اور اس کے نواح کی

زبان بتائی ہے۔ خسرو ہندوستان کی سبھی بارہ زبانوں کو ہندوی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی زبان کو ہندوی کے علاوہ ''ہندی'' بھی کہا گیا ہے۔ یہ دونوں نام شورسینی اپ بھرنش سے 1000ء کے بعد وجود میں آنے والی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کے لیے ہی استعمال کیے گیے ہیں۔ یہ بولیاں کھڑی بولی اور ہریانی (جاٹو یا بانگڑو) ہیں۔ ان میں کھڑی بولی دہلی کے شمال مشرق میں بولی جاتی ہے جب کہ ہریانوی دہلی کے مغرب میں۔ ان زبانوں کو ''دہلوی'' بھی کہا گیا ہے کیونکہ دہلی میں جمنا کے دونوں جانب یہی بولیاں ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی بھی ہیں اور متاثر بھی کرتی ہیں۔ ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق مغربی ہندی کی ان دو بولیوں میں مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد عربی وفارسی الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دہلی ونواحِ دہلی کی اسی زبان کے تین نام دہلوی، ہندوی اور ہندی ہیں۔ شمالی ہند میں آنے والے مسلمان فاتحین نے ہندوستان کی مناسبت سے یہاں کی بولیوں کو 'ہندی' کے نام سے موسوم کیا۔ گریرسن نے شمالی ہند کی ان ہی بولیوں کو علاقائی بنیاد پر دو گروہ میں تقسیم کر کے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی کے نام دیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''گریرسن نے مسلمانوں کے دیے ہوئے اسی لفظِ ''ہندی'' کو لے کر اس کا دائرہ بڑھا دیا اور اس کے تحت ہریانہ، دہلی، اترپردیش، اتراکھنڈ، مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کے وسیع علاقے میں بولی جانے والی آٹھ بولیوں کو شامل کر لیا جن میں تین بولیاں: اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی 'مشرقی ہندی' کہلائیں اور بقیہ پانچ بولیوں: کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو 'مغربی ہندی' کے نام سے موسوم کیا گیا۔'' (اردو کی لسانی تشکیل، ص155)

ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے دہلی اور نواح کی بولیوں میں مغربی ہندی کی تین بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا کو شامل کیا ہے اور قدیم اردو پر ان کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح گریرسن کے لسانی گروہ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے تین اہم بولیوں کا تعلق خسرو کی اصطلاح ''دہلی اور پیرامنش'' سے ہے جسے ہندوی، ہندی اور دہلوی کا نام دیا گیا ہے۔ مغربی ہندی کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ سبھی ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا کا تعلق اسی مغربی ہندی کی بولیوں سے ہے۔ اس طرح اردو کا تعلق مغربی ہندی کے توسط سے شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے استوار ہوتا ہے۔ اردو کے علاوہ شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کا آغاز بھی اسی مغربی ہندی سے ہوا ہے۔

1.5.2 مغربی ہندی کا علاقہ:

گریرسن کے مطابق ہندوستان میں آریا الگ الگ گروہوں کی شکل میں آئے۔ ان کا پہلا گروہ ہندوستان کے جس علاقے میں آباد ہوا وہ مدھیہ دیش یا وسطی علاقہ تھا۔ اسی علاقے میں قدیم ہند آریائی دور (1500 سے 500 قبل مسیح) کی سنسکرت کی معیاری شکل کا ارتقا ہوا تھا۔ وسطی ہند آریائی دور (500ق م سے 000 1 سن عیسوی) میں شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کا فروغ بھی اسی علاقے میں ہوا۔ شورسینی اپ بھرنش سارے شمالی ہند کی لنگوا فرینکا کی حیثیت رکھتی تھی جو گجرات اور مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔ 1000ء کے بعد جدید ہند آریائی دور میں شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی متعدد بولیوں کا تعلق بھی مدھیہ دیش کے علاقے سے ہے۔ ان

جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں میں مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کے علاوہ پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی کا ارتقا ہوا۔ اس طرح مغربی ہندی کا علاقہ لسانی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے اہم علاقہ مدھیہ دیش ہے۔ یہ علاقہ موجودہ ہندوستان کی پانچ ریاستوں ہریانہ، دہلی، اترپردیش، اتراکھنڈ اور مدھیہ پردیش پر مشتمل ہے۔ اگر ہم دیگر جدید ہند آریائی زبانوں اور مغربی ہندی کے علاقے کو دیکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے اور جنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی کی بولیاں ہیں۔ شمال میں یہ پہاڑی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مسعود حسین خاں نے مدھیہ دیش کو ہی مغربی ہندی کا علاقہ قرار دیا ہے۔

> ”مغربی ہندی کے حدود تقریباً وہی ہیں جو مدھیہ دیش کے ہیں۔ یہ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک، شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیاچل اور بندیل کھنڈ تک بولی جاتی ہے۔ اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب، جنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی۔ شمال میں یہ پہاڑی بولیوں (جونسری، گڑھوالی اور کمایونی) سے گھری ہوئی ہے۔ اندرونی زبان کی شاخ میں صرف مغربی ہندی ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں بلکہ اگر پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کی ملواں حیثیت پر نظر رکھیں تو اندرونی گروہ کی نمائندہ محض مغربی ہندی ہے۔ مغربی ہندی کا یہ نام مدھیہ دیس کی زبان کو گریرسن نے دیا ہے، جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی مدھیہ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے، کیونکہ اسی علاقہ میں سنسکرت شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش پروان چڑھتی ہیں جن کی سچی جانشین اس علاقے کی جدید بولیاں کھڑی بولی (ہندوستانی)، برج بھاشا، ہریانی، بندیلی اور قنوجی ہیں جن کے مجموعے کو گریرسن مغربی ہندی کا جدید نام دیتا ہے۔“
>
> (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص56)

1.5.3 مغربی ہندی کی بولیاں اور اردو سے ان کے رشتے:

کھڑی بولی : کھڑی بولی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں میں ایک اہم بولی ہے۔ یہ دہلی کے شمال مشرق کی بولی ہے جس کا علاقہ جمنا پار کرتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جمنا کے مشرق میں دریائے گنگا ہے اس لیے اس علاقے کو بالائی دوآبہ کہا جاتا ہے۔ گنگا کے مشرق اور مغرب میں کھڑی بولی کا خاص علاقہ ہے جو مغربی اترپردیش کے کئی اضلاع پر مشتمل ہے۔ ان اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے اور ان کی تہذیب و ثقافت کے گہرے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ کھڑی بولی کی کئی شکلیں ہیں جن میں سے دو کی نشاندہی گریرسن نے کی ہے۔ اس کی ایک شکل گنگا کے مشرقی جانب مراد آباد، بجنور، رام پور اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ اس کی دوسری شکل گنگا کے مغرب میں میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کی بولی ہے۔ مظفر نگر میں تشدید کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور افعال کی صورت یہ ہے کہ ”میں مارتا ہوں“ کے ساتھ ”میں ماروں ہوں“ بھی کہا جاتا ہے۔ اسما کی جمع (اں) سے بنائی جاتی ہے مثلاً عورتاں، قلماں، مکاناں وغیرہ۔ ضمیر میں تیرا

کی جگہ تجھ مجھ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ کھڑی بولی شمال میں دہرہ دون اور اترا کھنڈ کے میدانی علاقے میں بھی بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ضلع انبالہ کی تحصیل انبالہ اور ضلع بلند شہر کے شمالی حصے میں یہ رائج ہے۔ کھڑی بولی کے شمال میں پہاڑی بولیوں کا علاقہ ہے۔ اس کے شمال مغرب میں ہریانوی، جنوب میں برج بھاشا اور جنوب مشرق میں قنوجی بولی جاتی ہے۔ اس طرح کھڑی بولی کے علاقے کے تین جانب مغربی ہندی کی بولیوں کا علاقہ ہے۔ مسعود حسین خاں نے مغربی روہیل کھنڈ کے اضلاع بجنور، مراد آباد اور رام پور کی کھڑی بولی کو معیاری اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے۔

کھڑی بولی دوسری بولیوں کے مقابلے میں قدیم ترین ہے۔ یہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی میرٹھ اور اس کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔ اس بولی کی جھلک اپ بھرنش کی قدیم ترین تصنیفات میں ملتی ہے۔ اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ یہ اپنے علاقے سے آگے بڑھ کر پنجابی کو بھی متاثر کرتی رہی ہے۔ لیکن پندرہویں صدی سے قبل اس بولی کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہے۔ دکن میں اس کا پہلا مستند نمونہ ملتا ہے جو فخر دین نظامی بیدری کی تصنیف ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' (1421 سے 1445 کے درمیان) کی شکل میں موجود ہے۔ شمالی ہند میں امیر خسرو کے غیر مستند ہندوی کلام کے علاوہ صوفیا کرام کے چند فقرے ہی ملتے ہیں۔

کھڑی بولی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اردو جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے' براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اپنے ایک مقالے ''اردو کے آغاز کے نظریے'' میں اسی بات پر شدت کے ساتھ زور دیتے ہیں کہ ''اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔'' اردو کی اصل و اساس کھڑی بولی ہے اور اس کا ڈھانچہ اور کینڈا سب کچھ کھڑی بولی کا ہے۔ اردو کے ماخذ کے سلسلہ میں اکثر عالموں کا کھڑی بولی پر اتفاق ہے جو دوآبے کے علاقے کی شورسینی اپ بھرنش کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اردو میں اگرچہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کھڑی بولی سے پیدا ہوئی۔ جس زمانے میں شمالی ہندوستان میں سیاسی طور پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں' اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں بعض ایسی بولیاں سر اٹھا رہی تھیں جن کے بہت سے لفظوں کا ڈھانچا کھڑا تھا یعنی جن کے بیشتر الفاظ ''الف'' یا 'آ'' کی آواز پر ختم ہوتے تھے۔ کھڑی بولی ان میں سے ایک ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے بھی اردو کو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو کا ارتقا کھڑی بولی سے ہی ہوا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کھڑی بولی نے ہی اردو کا روپ اختیار کر لیا اور دھیرے دھیرے معیاری اور ترقی یافتہ بنتی گئی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو کھڑی بولی اور اردو دونوں ایک ہی ہیں۔ ہر چند کہ قدیم اردو بالخصوص دکنی اردو پر ہریانوی کے بھی اثرات ہیں، لیکن اردو کا بنیادی ڈھانچہ اور کینڈا کھڑی بولی ہی کا ہے۔ زمانۂ حال کی ہندی بھی جو ناگری یا دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے، کھڑی بولی سے ہی پیدا ہوئی ہے لیکن اس کا ادبی ارتقا اردو کے ادبی ارتقا کے بعد ہوا ہے۔''
>
> (اردو کی لسانی تشکیل، ص158)

ہریانوی: مغربی ہندی کی ایک اور بولی ہریانوی ہے جو دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہریانہ صوبہ میں بولی جاتی ہے۔ ہریانہ کے اضلاع رہتک، حصار اور کرنال خالص ہریانوی کے علاقے ہیں۔ ہریانوی کے شمال میں پنجابی، شمال مشرق میں کھڑی بولی اور جنوب مغرب

میں راجستھانی بولی جاتی ہے۔

ہریانوی سب سے زیادہ پنجابی سے متاثر ہے۔ جیسے جیسے معیاری اردو کا ارتقا ہوا اُس میں ہریانوی کے اثرات کم ہوتے چلے گئے۔ ہریانوی مغربی ہندی کی دوسری اہم بولی ہے جس نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں بنیاد کا کام کیا ہے۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی جن بولیوں سے اردو سب سے زیادہ متاثر ہوئی ان میں ہریانوی بھی ہے۔ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے قدیم اردو پر ہریانوی کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے ہیں۔“ (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص241)

برج بھاشا: برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی مانا جاتا ہے۔ یوں تو مغربی ہندی کی سبھی بولیوں کا رشتہ شورسینی اپ بھرنش سے ہے لیکن ان میں برج بھاشا کو فوقیت حاصل ہے اور یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برج بھاشا مغربی ہندی کی دیگر چار بولیوں کے مقابلے میں شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کی مجموعی خصوصیات کی زیادہ حامل رہی ہے۔ لفظ برج کی نسبت گائے سے ہے جو شورسین علاقے میں مقدس مانی جاتی ہے۔ شورسین متھرا کے علاقے کا قدیم نام ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ علاقہ مذہبی لحاظ سے بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے متھرا ہندو مذہب اور تہذیب کا قدیم مرکز رہا ہے۔ ہندو مذہب کے فروغ کے لیے استعمال ہونے والی زبان سنسکرت کا بھی علاقہ متھرا ہی رہا ہے۔ اسی لیے برج بھاشا پر سنسکرت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ برج بھاشا ادبی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش میں تخلیق ہونے والے ادب کے بعد ہندوستان کی جس بولی میں سب سے زیادہ ادب تخلیق ہوا وہ برج بھاشا ہے۔ دوسری بولیوں میں ادب کی تخلیق بہت بعد میں ہوئی۔ برج بھاشا کا تعلق بھگتی تحریک سے رہا ہے۔ جس طرح پالی کی اہمیت بدھ مت کی تبلیغ کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے تھی اسی طرح برج بھاشا بھی بھگتی کی تحریک سے وابستہ ہو کر دور دور تک پھیل گئی۔ اس تحریک کے مبلغین نے برج بھاشا میں ہی اپنی تعلیمات کو عام کیا۔ شورسینی اپ بھرنش کی طرح اس کی سچی جانشین برج کے اثرات بھی ملک گیر تھے۔ یہ بھگتی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی جس کا مرکز متھرا تھا۔ متھرا کا تعلق کرشن سے ہے اور یہ تحریک بنیادی طور پر کرشن بھگتی کی تحریک تھی۔ کرشن بھگتی کا پورا ادبی سرمایہ برج بھاشا میں ہی محفوظ ہے۔ سورداس جیسے مشہور کرشن بھکت شاعر نے اسی زبان میں شاعری کی۔ برج بھاشا کے اس شاعر کو آج کے ہندی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ برج بھاشا اپنے عروج پر تب پہنچی جب مغل بادشاہ اکبر نے دارالسلطنت دہلی سے آگرہ منتقل کیا۔ اکبر کے بعد شاہجہاں نے اپنی راجدھانی دوبارہ دہلی منتقل کر لی۔ لیکن اکبر اور شاہجہاں کے دور حکومت کے بڑے حصے میں آگرہ دارالحکومت رہا۔ اس وقت برج بھاشا کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور برج کے مشہور شاعر عبدالرحیم خانخاناں اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ بادشاہ اکبر برج بھاشا کو پسند کرتا تھا اور اس نے اس زبان میں دوہے بھی کہے ہیں۔ اکبر کی اس سرپرستی کی وجہ سے اس دور میں برج بھاشا شمالی ہند کی اعلیٰ ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

برج بھاشا کا علاقہ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ یہ جن اضلاع کی خاص بولی ہے ان میں بلند شہر،

متھرا اور آگرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ متھرا کے جنوب میں یہ فیروز آباد، بھرت پور، دھول پور، گوالیار اور جے پور کے مشرقی حصوں میں بولی جاتی ہے۔ متھرا کے شمال مشرق میں ایٹہ، علی گڑھ، مین پوری، بدایوں اور بریلی وغیرہ اضلاع بھی برج بھاشا کے علاقے میں شامل ہیں۔ گڑ گاؤں کے مشرقی حصے میں بھی یہ رائج ہے اور راجستھانی کی ایک بولی میواتی سے متاثر ہے۔ اسی طرح بلند شہر کی برج بھاشا کھڑی بولی سے گھلی ملی ہے۔ ساخت کے لحاظ سے اردو اور برج بھاشا بالکل مختلف زبانیں ہیں لیکن اردو کے ارتقا میں برج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ برج بھاشا کا لسانیاتی رشتہ نہ صرف قدیم اردو سے رہا ہے بلکہ بقول مسعود حسین خاں جدید اردو کے معیاری لہجے پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔

قنوجی: مغربی ہندی کی اس بولی کا نام قنوج شہر کی مناسبت سے قنوجی رکھا گیا ہے۔ قنوج ایک تاریخی شہر ہے جس کا ذکر راماین جیسی قدیم کہانی میں ملتا ہے۔ یہ شہر یوپی کے فرخ آباد ضلع میں واقع ہے۔ محمد غوری کے ہاتھوں راٹھور خاندان کے آخری راجا جے چند کی شکست کے بعد یہ تاریخی شہر اجڑ گیا۔ قنوجی آج بھی ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور میں بولی جاتی ہے۔ اس کا علاقہ اٹاوہ، کانپور، ہردوئی اور شاہجہاں پور کے شمال میں پیلی بھیت تک پھیلا ہے۔ قنوجی کے شمال، شمال مغرب اور مغرب میں برج بھاشا کا علاقہ ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں اودھی اور جنوب میں بندیلی رائج ہے۔ قنوجی پر برج بھاشا کے اثرات اس قدر غالب رہے ہیں کہ یہ کبھی اپنی الگ پہچان نہیں بنا سکی۔

بندیلی: مغربی ہندی کی بولی بندیلی کا تعلق بندیل کھنڈ سے ہے۔ یوپی کے اضلاع باندا، ہمیرپور، جالون، جھانسی اور مدھیہ پردیش کے چند شمالی اضلاع بندیل کھنڈ کے علاقے میں شامل ہیں۔ یہ شمال میں آگرہ، مین پوری اور ایٹہ تک رائج ہے جب کہ شمال مغرب میں قنوجی اور برج بھاشا سے اس کی سرحد ملتی ہے۔ اس کے مشرق میں بگھیلی، جنوب میں مراہٹی اور جنوب مغرب میں راجستھانی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بندیل کھنڈ کے باہر بھی بندیلی بولی جاتی ہے۔ اس بولی میں ادب بالخصوص عوامی ادب کا وسیع سرمایہ موجود ہے۔ عوامی ادب میں آلھا اودل کے منظوم رزمیہ قصے بہت مشہور اور مقبول ہیں جنھیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے علاقوں میں آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔

مغربی ہندی کی یہ سبھی پانچ بولیاں جدید ہند آریائی دور کی اہم بولیاں ہیں جنھوں نے شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کی ابتدا اور ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کا تعلق نہ صرف اردو زبان کی ابتدا سے ہے بلکہ یہ اردو کے ارتقائی سفر پر بھی اثر انداز رہی ہیں۔ اردو زبان کے ارتقا میں مغربی ہندی کی بولیوں کی بہت اہمیت رہی ہے۔ یہ آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ ان بولیوں کے علاقے میں اردو آج بھی رابطے کی اہم زبان ہے۔ اس طرح اردو اور مغربی ہندی کی ان بولیوں کا رشتہ قائم ودائم ہے۔

1.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں ایک کے بعد ایک دنیا کے مختلف خطوں سے انسانی کارواں آتے رہے اور ہندوستانی دریاؤں کے زرخیز میدانوں میں آباد ہوتے گئے۔
- یہاں آکر بسنے والوں میں سب سے پہلے افریقی قبائل 'نگریٹو' تھے، پھر فلسطین سے آنے والے 'پروٹو آسٹرلوائیڈ' تھے۔
- جب دراوڑ تہذیب ہندوستان میں عروج پر تھی آریاؤں کے قافلے وسط ایشیا کے خشک کوہستانی علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے

زرخیز میدانوں میں وارد ہونے لگے۔

- ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی۔
- سنسکرت کے معنی شدھ بھاشایاپاک صاف، مقدس اور افضل زبان ہے۔
- ویدک سنسکرت، کلاسیکل سنسکرت یا سنسکرت کی ہی قدیم شکل ہے۔
- پراکرت دراصل ایسی زبان تھی جو سنسکرت میں تبدیلی کے نتیجے میں فطری طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔
- جس طرح سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئیں اسی طرح پراکرتوں کے علاقوں میں اپ بھرنشیں پیدا ہوئیں۔
- جدید ہند آریائی دور کی ابتداء1000ء سے ہوتی ہے۔
- اردو کی داغ بیل ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح1000ء کے بعد پڑتی ہے۔
- مغربی ہندی کی ایک بولی ''کھڑی بولی'' اردو کا ماخذ بنتی ہے۔
- مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔
- شورسینی اپ بھرنش، شورسینی پراکرت کے علاقے میں بولی جانے والی اپ بھرنش ہے۔
- مغربی ہندی دراصل کسی مخصوص زبان کا نام نہیں بلکہ یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔
- مغربی ہندی کی بولیاں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔
- مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں: (1) کھڑی بولی،(2) ہریانی(جاٹو یا بانگڑو)،(3) برج بھاشا،(4) قنوجی اور(5)بندیلی۔
- مغربی ہندی کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اردو کی ابتدا کا تعلق مغربی ہندی کی بولیوں سے ہے۔
- مغربی ہندی کا علاقہ وہی ہے جو آریوں کی آمد کے بعد معیاری سنسکرت، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کا علاقہ رہا ہے۔
- مغربی ہندی کی ایک اہم بولی کھڑی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں میں ایک اہم بولی ہے۔
- کھڑی بولی کی سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اردو جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے' براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔
- ہریانوی مغربی ہندی کی دوسری اہم بولی ہے جس نے اردو کی ابتدا اور ارتقامیں بنیاد کا کام کیا ہے۔
- برج بھاشا شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہی جاتی ہے۔
- اردو کے ارتقامیں برج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔
- مغربی ہندی کی سبھی پانچ بولیوں نے شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کے ارتقامیں اہم رول ادا کیا ہے۔
- اردو کا لسانی سلسلہ سنسکرت سے جا کر ملتا ہے۔
- اردو زبان کی ایک مربوط لسانی تاریخ ہے اور اس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔

1.7 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
لاٹ	:	ستون، کھمبا
تقدس	:	بزرگی، احترام، عزت
پروان چڑھنا	:	ترقی کرنا
منبع	:	ماخذ
مزاحمت	:	رکاوٹ
نقل مکانی	:	ہجرت
ساخت	:	بناوٹ
مماثلت	:	یکسانیت، مشابہت، مانند ہونا
باہم	:	آپس میں
صوتی	:	آواز سے متعلق، علم صوت سے متعلق
صرفی	:	صرف سے متعلق (علم صرف میں حروف و حرکات کے تغیر و تبدل، کلمات کے بنانے کے قاعدے، اسم اور فعل کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔)
نحوی	:	علم نحو سے متعلق (جس میں کلمات کو ترتیب دینے اور ان کو جدا جدا کرنے کے طور طریق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک کلمے کا دوسرے کلمے سے ربط و تعلق کیا ہے۔)
پیرامنش	:	گرد، اطراف
ہندوی	:	ہندوستان سے تعلق رکھنے والی زبان
جنم	:	پیدائش
مصوتے	:	Vowels، حروف علت جیسے الف، و، ی
مصمتے	:	Consonant، حروف صحیح جیسے ب، ج، د، ر، ک وغیرہ
لنگوافرینکا	:	کسی ملک کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان، کسی ملک کے وسیع علاقے میں رابطے کی زبان، بین الاقوامی زبان
مدھیہ دیش	:	وسطی علاقہ، ملک کا مرکزی خطہ
رائج	:	جس کا رواج ہو، جس کا چلن ہو

ورناکلر	:	مقامی زبان
فصیح	:	خوش کلامی، خوش بیانی
جانشین	:	قائم مقام، کسی کی جگہ پر بیٹھنے والا
مشابہ	:	مانند، مثل، نظیر، ہم شکل، یکساں
ضمائر	:	ضمیر کی جمع، مختصر اسم
دوآبہ	:	دو دریاؤں کا درمیانی علاقہ، گنگا اور جمنا کے بیچ کا علاقہ
معکوسی مصمتے	:	دراوڑی زبان کی آوازیں جیسے ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ
رزمیہ	:	رزم سے متعلق، جنگ کا قصہ
خاندان السنہ	:	زبانوں کا خاندان

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.81 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ آریا اصلاً کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) امریکہ (b) انگلینڈ (c) ایران (d) وسط ایشیا

2۔ دنیا کی تمام زبانوں کو کتنے لسانی گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے؟

(a) آٹھ (b) چھ (c) چار (d) دو

3۔ ہند ایرانی خاندان کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

(a) ایک (b) دو (c) تین (d) چار

4۔ ہند آریائی کے ارتقا کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟

(a) سات (b) پانچ (c) تین (d) ایک

5۔ سنسکرت کی قدیم شکل کیا ہے؟

(a) ویدیک سنسکرت (b) لوک سنسکرت (c) کلاسیکل سنسکرت (d) جدید سنسکرت

6۔ وسطی ہند آریائی کے کتنے ادوار ہیں؟

(a) تین (b) چار (c) پانچ (d) چھ

7۔ گوتم بدھ کی مذہبی تعلیمات کس زبان میں پیش کی گئیں؟

(a) اپ بھرنش (b) پراکرت (c) پالی (d) پساچی

8۔ مغربی ہندی میں کتنی بولیاں شامل ہیں؟

(a) پانچ (b)سات (c)چار (d) تین

9۔ ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) مسعود حسین خاں (b)احتشام حسین (c) گریرسن (d)مرزا خلیل احمد بیگ

10۔ ''ہندوستانی لسانیات'' کس کی کتاب ہے؟

(a) سینتی کمار چٹرجی (b) محی الدین قادری زور (c) گیان چند جین (d) سلیمان اطہر جاوید

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ زبان کی تعریف اور زبان اور بولی کے رشتے کو واضح کیجیے۔

2۔ ہندوستان میں مختلف لسانی گروہ کی آمد پر روشنی ڈالیے۔

3۔ پراکرت اور ان کی اقسام پر نوٹ لکھیے۔

4۔ اپ بھرنش کسے کہتے ہیں؟ اپ بھرنش کے اقسام بیان کیجیے۔

5۔ کھڑی بولی کی خصوصیات اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ویدک اور کلاسیکل سنسکرت کے بارے میں لکھیے۔

2۔ ہندوستان میں ہند آریائی کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مغربی ہندی کی بولیوں کا اردو سے کیا تعلق ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	ہند آریائی اور ہندی	سینتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی
3۔	لسانی مطالعہ	پروفیسر گیان چند جین
4۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
5۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ

1.8.1 کے جوابات: d۔1 a۔2 b۔3 c۔4 a۔5

a۔6 c۔7 a۔8 c۔9 b۔10

اکائی 2: اردو زبان کی ابتدا: مختلف نظریات

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 اُردو زبان کی ابتدا: مختلف نظریات

2.2.1 سید سلیمان ندوی کا نظریہ

2.2.2 حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

2.2.3 نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ

2.3 اردو کی ابتدا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات

2.3.1 ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ

2.3.2 پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ

2.4 اکتسابی نتائج

2.5 کلیدی الفاظ

2.6 نمونۂ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے زبانوں کے مختلف خاندانوں کے بارے میں پڑھا۔ آپ نے یہ بھی پڑھا کہ اردو زبان کا تعلق ہند یوروپی خاندان کی ایک شاخ ہند آریائی سے ہے۔ ہند آریائی کی ایک زبان شورسینی اپ بھرنش سے اردو زبان کا براہ راست تعلق ہے۔ اس اکائی میں آپ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات سے واقف ہوں گے۔

اردو زبان کی ابتدا کا زمانہ دراصل بارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی فتح دہلی (1193ء) کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق اردو کے عالموں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ان علما نے بڑے خلوص سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی۔ تیرہویں صدی سے بیسویں صدی تک اردو کے کئی شاعروں اور ادیبوں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں الگ الگ رائیں پیش کی ہیں۔ ان میں میر امن، سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی، شمس اللہ قادری، سید احمد دہلوی، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام اہم ہیں۔ اردو کے آغاز کے بارے میں ان کے خیالات کو ماہرین لسانیات نے قیاس آرائی قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نظریات کی کوئی لسانی اور تحقیقی بنیاد نہیں ہے۔ ان عالموں میں سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی کے خیالات و نظریات مشہور اور اہم ہیں۔ یہ سبھی علما اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔

بیسویں صدی میں زبانوں کے سائنسی مطالعہ کا علم یعنی لسانیات کا علم عام ہوا۔ اس کے بعد لسانیات کی روشنی میں زبانوں کی ابتدا کے بارے میں خالص علمی اور سائنسی طریقے سے تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہند آریائی زبانوں کا مطالعہ بھی لسانیات کے حوالے سے کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ٹی۔ گراہم بیلی، جارج ابراہم گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی کی لسانی تحقیقات سامنے آئیں۔ ان لسانی تحقیقات سے دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں بھی نئی بحث شروع ہوئی۔ اردو کے عالموں کے علاوہ غیر ملکی اور دیگر عالموں نے بھی اردو زبان کی ابتدا پر اظہار خیال کیا۔ ان میں ۔ژول بلاک، گراہم بیلی، جان بیمز، جارج گریرسن، سنیتی کمار چٹرجی اور شری رام شرما جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا کے مسائل پر لسانیات کی روشنی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے محقق اور ماہرین لسانیات نے تحقیق کی اور نتائج اخذ کیے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں ایسے لسانی محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان کی پیدائش کا زمانہ، جائے پیدائش اور ارتقا کے مسائل پر خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا۔ خصوصاً پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے، اکثر ماہرین لسانیات اس سے کلی یا جزوی طور پر متفق نظر آتے ہیں اور اس نظریے کو سب سے زیادہ قابل قبول نظریہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس اکائی میں آپ اردو کی ابتدا کے بارے میں سلیمان ندوی، محمود شیرانی، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں اردو کے عالموں اور ماہرین لسانیات کے خیالات و نظریات سے واقف ہو سکیں۔
- اردو زبان کی ابتدا کے علاقے اور عہد کے متعلق معلومات کا جائزہ لے سکیں۔
- لسانیات کی روشنی میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اظہار خیال کر سکیں۔

2.2 اردو کی ابتدا: مختلف نظریات

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں اردو کے متعدد عالموں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ان کا سلسلہ حضرت امیر خسرو

(1253ء۔1325ء) سے شروع ہوتا ہے۔ مشہور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا زبان شناس قرار دیا ہے۔ امیر خسرو کی تحریروں میں اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ امیر خسرو نے فارسی کے علاوہ اردو/ہندی میں بھی شاعری کی ہے۔ وہ عربی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی 'نہ سپہر' (1318ء) میں ہندوستان کی بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ زبانیں خسرو کے عہد میں رائج تھیں۔ مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کی اس مثنوی کو 'لسانی دستاویز' قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کئی زبانوں کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ خسرو نے کئی مقامات کی سیاحت بھی کی تھی۔ دہلی میں قیام پذیر ہونے کے علاوہ انھوں نے ایک طویل عرصے تک ملتان، لاہور، اودھ اور بنگال میں بھی قیام کیا تھا۔ وہ جنوبی ہند میں علاءالدین خلجی، ملک کافور اور محمد بن تغلق کی پیش قدمیوں سے بھی باخبر تھے۔''
>
> (بحوالہ اردو زبان کی تاریخ، ص34)

اردو کی ابتدا کے بارے میں باقاعدہ نظریات انیسویں اور بیسویں صدی میں سامنے آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں سب سے پہلے میر امّن دہلوی (1732-1803) نے اردو زبان کو ایک مخلوط زبان قرار دیا جو مختلف زبانوں کے میل جول سے بنی ہے۔ میر امن نے قصۂ چہار درویش کا آسان ترجمہ ''باغ و بہار'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب فورٹ ولیم کالج سے 1803 میں شائع ہوئی۔ میر امن نے باغ و بہار کے مقدمہ میں اردو زبان کی ابتدا کو مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی معاشرتی اشتراک کا نتیجہ قرار دیا۔ میر امن نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> ''جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔''
>
> (باغ و بہار، ص7-8)

میر امن کے مطابق یہ زبان بولیوں کے بولنے والوں کے لیے رابطے کا کام کرتی تھی اور اس زمانے کی سماجی اور معاشی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئی تھی۔ میر امن کا یہ نظریہ اتنا مقبول ہوا کہ اردو کے کئی بڑے ادیبوں اور عالموں نے بھی اردو کو ایک مخلوط زبان اور اس کے آغاز کا زمانہ عہد مغلیہ تسلیم کیا۔ میر امن کے نظریے سے متاثر ہو کر انشاء اللہ خاں انشا، سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی اور سید احمد دہلوی جیسے اردو کے علما نے اپنے نظریات پیش کیے۔

انیسویں صدی کے معروف شاعر انشاء اللہ خاں انشا (1752۔1817ء) نے اردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ امام بخش صہبائی (1802-1857) کا خیال ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جو تبدیل ہوتی ہوئی شاہ جہاں کے عہد میں اپنی اصل شکل حاصل کرتی ہے۔ سر سید احمد خاں (م 1897) کا بھی یہی خیال ہے کہ اردو زبان کا مکمل روپ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں سامنے آیا۔ سید احمد دہلوی (م 1918) نے اپنی مشہور تصنیف فرہنگ آصفیہ کے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو کی پیدائش

شاہجہاں کے عہد میں ہوئی جس نے برج بھاشا سے بعد میں اردو کی شکل اختیار کی۔

میر امن کے بعد محمد حسین آزاد (1828-1910) کا یہ نظریہ سب سے زیادہ مشہور ہوا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ آزاد نے اپنی شاہکار تصنیف "آب حیات" (1888) میں لکھا ہے:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشاہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔" (آب حیات' ص10)

محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بہت مقبول ہوا۔ در اصل برج بھاشا دہلی سے قریب تاریخی شہر میں بولی جاتی تھی۔ جب مغلیہ سلطنت کے مضبوط ہوئی اور اس سلطنت کے سب سے طاقتور بادشاہ جلال الدین اکبر (1605-1556ء) نے آگرہ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اکبر کے بعد مغلیہ سلطنت کے دوسرے بڑے بادشاہ جہانگیر کی راجدھانی آگرہ ہی رہی۔ شاہجہاں نے بھی اپنے عہد بادشاہت کا بڑا حصہ آگرہ میں گزارا۔ آگرہ کا قلعہ اور بین الاقوامی شہرت کی حامل عمارت تاج محل شاہجہاں کا آگرے تعلق کی گواہ ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے ان بادشاہوں نے ہندوستان کی مقامی زبانوں کی سرپرستی کی۔ ان زبانوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ بادشاہ اکبر برج سے واقف تھا اور اس نے برج میں اشعار بھی کہے ہیں۔ اکبر کے نورتنوں میں سے آٹھ رتنوں کا تعلق برج بھاشا کے علاقے سے تھا۔ شمالی ہند میں شاعری اور موسیقی کی زبان بیسویں صدی سے قبل تک برج بھاشا ہی تھی۔ سور داس اور تان سین جیسے ہندوستانی فنکاروں کا تعلق برج بھاشا سے تھا۔ برج کی اسی غیر معمولی اہمیت اور بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے محمد حسین آزاد نے یہ رائے قائم کی کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ آزاد سے قبل ماہر لسانیات روڈولف ہیورنلے نے بھی اردو کو برج بھاشا سے ماخوذ قرار دیا تھا۔ اردو کی ابتدا کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں جو مسلم اقتدار کا مرکز تھا اردو بارہویں صدی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج، مارواڑی، پنجابی کے لیے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط اور ارتباط سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی جو صرفی و نحوی حد تک برج ہے، اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی۔" (بحوالہ اردو زبان کی تاریخ، ص65)

حکیم شمس اللہ قادری نے بھی اپنی تصنیف "اردوئے قدیم" میں اردو کی ابتدا برج سے تسلیم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بہ روز بڑھتا گیا' اور ایک عرصے کے بعد اردو کی صورت اختیار کرلی۔"

(اردوئے قدیم'ص76)

محمد حسین آزاد کے نظریے کی تائید اور تردید میں کئی مصنفین نے اپنے نظریات پیش کیے اور اردو کی ابتدا کے بارے میں از سرِ نو

غور و فکر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزاد کے نظریے نے یہ ثابت کیا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہونے کے باوجود ہندوستانی زبان ہے کیونکہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے جو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس طرح اردو کی جائے پیدائش ہندوستان ہے۔ اس نظریے کے بعد اردو کے محققین اردو زبان کے ماخذ کے سلسلے میں ہندستانی زبانوں کو اہمیت دینے لگے اور ایسے نظریات سامنے آئے جن میں اردو کے رشتے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں سندھ، پنجاب، دکن، گجرات، مہاراشٹر اور بہار میں اردو کی جائے پیدائش کے نظریات سامنے آئے۔ سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں لکھا ہے:

"یہ مخلوط زبان (اردو) سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے
مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔" (نقوش سلیمانی، ص25)

اردو کی ابتدا کے بارے میں مذکورہ تمام نظریات میں جزوی صداقت موجود ہے۔ لسانیات کی روشنی میں ان کی حیثیت تاریخی زیادہ ہے، تحقیقی اور علمی کم ہے۔ مسعود حسین خاں نے اردو زبان کی ابتدا سے متعلق لسانیات سے ناواقف عالموں کی مذکورہ تمام خیال آرائیوں کو محض قیاس آرائی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"علم اللسان سے ناواقف لوگوں کے نزدیک یہ ایک کھچڑی زبان تھی جو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے
میل سے پیدا ہوئی تھی جسے کبھی شاہ جہانی لشکر سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی اکبر کے سنہرے عہد سے۔
اردو کی ابتدا کا یہ نظریہ بہت زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔" (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص1)

مسعود حسین خاں کی بات لسانیات کی رو سے درست ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام نظریات اردو کی ابتدا کی تلاش کے تاریخی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ہی قیاس آرائیوں کی بنیاد پر لسانیات کی روشنی میں اردو کی ابتدا کے بارے میں نئے نظریات سامنے آئے۔ ان نظریات میں محمود شیرانی کا نظریہ بھی شامل ہے جن کے تحقیقی کاموں سے اردو کی ابتدا کے بارے میں صحیح نظریے تک پہنچنے میں مدد ملی۔

2.2.1 سید سلیمان ندوی کا نظریہ:

سید سلیمان ندوی (1884-1954) اردو کے بڑے عالم اور مؤرخ تھے۔ اسلامی تاریخ ان کی تحقیق اور تصنیف کا خاص میدان تھا۔ انھوں نے تاریخ اور سیرت پر کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ ان میں عرب وہند کے تعلقات، سیرۃ النبی، رحمت عالم، سیرۃ عائشہ اور بہادر خواتینِ اسلام وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔ ان کے خطبات، مقالات اور مقدمات کا مجموعہ "نقوش سلیمانی" 1939ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ "نقوش سلیمانی" میں وہ خطبات اور مقالات بھی شامل ہیں جن سے اردو کی ابتدا کے مسائل پر سلیمان ندوی کے خیالات و نظریات سے واقفیت ہوتی ہے۔ سلیمان ندوی نے اس کے مقدمے میں کتاب کی اہمیت کی وجہ خود بیان کی ہے۔

"یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کے مولد کے تعین و تشخیص کے باب میں سندھ اور
ملتان کی نشان دہی کی گئی، اور یہ اشارات سب سے پہلے 1915ء کے اجلاس اردو کے خطبۂ صدارت

میں کیے گئے، پھر بعد کے خطبوں اور مقالوں میں ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی۔"

(نقوش سلیمانی' ص7)

سلیمان ندوی نے 1915 کا یہ خطبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ ترقیِ اردو کے اجلاس (پونا) میں دیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیا جو باہمی میل جول کا نتیجہ تھی۔

"ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے۔" (ایضاً' ص5)

اس وقت تک عام خیال یہ تھا کہ اردو کی پیدائش دہلی اور دوآبہ گنگ وجمن کے علاقے میں ہوئی۔ اس کے علاوہ اردو کی ابتدا کا زمانہ عہد مغلیہ کو مانا جاتا تھا۔ سلیمان ندوی ان خیالات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے۔ اس پر دو سو برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہو گئی۔ اردو شاہ جہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔" (ایضاً' ص6)

اردو زبان کی ابتدا کے زیادہ تر نظریات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان آئے تو ان کا مقامی ہندوؤں سے میل جول بڑھا جس کے نتیجے میں اردو پیدا ہوئی۔ سلیمان ندوی نے اسی عام خیال کو ذہن میں رکھ کر یہ قیاس آرائی کی کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔

"مسلمان سب سے پہلے سندھ پہنچتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔" (ایضاً' ص31)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان حکمران کی شکل میں سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ محمد بن قاسم نے 712ء میں سندھ کو فتح کر کے اسے اسلامی مملکت کا ایک صوبہ بنایا۔ مسلمان بڑی تعداد میں تجارت اور مذہبی تبلیغ کی غرض سے یہاں آئے اور آباد ہو گئے۔ یہ مسلمان تقریباً تین سو سال تک یہاں قیام پذیر رہے۔ اس طویل عرصے میں مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے معاشرتی تعلقات قائم ہوئے اور انھیں مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی تاریخی عمل کو ذہن میں رکھ کر سلیمان ندوی نے یہ قیاس آرائی کی کہ یہ مشترک زبان اردو ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کئی عرب سیاحوں کے سفر ناموں سے شہادتیں فراہم کی ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ عربی فارسی کا میل جول ہندوستان کے جس حصے میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، اس لیے سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔

لسانیات کی روشنی میں اگر سلیمان ندوی اس نظریے کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ سندھ میں سب سے پہلے پہنچنے والے مسلمان عرب تھے اور عربی ان کی زبان تھی۔ عربی کا تعلق زبانوں کے سامی خاندان سے ہے۔ جبکہ سندھی اور اردو ہند آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اس لیے سامی اور آریائی خاندان کے میل سے کسی آریائی زبان کی پیدائش ممکن نہیں ہے۔

کسی زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ماہر لسانیات کی رائے ہی قابل قبول ہو سکتی ہے اس لیے سلیمان ندوی کا یہ نظریہ کہ

مسلمان سب سے پہلے ہندوستان کی سر زمین پر صوبہ سندھ میں آئے اور وہاں کی مقامی زبان سے عربی کے میل جول کے نتیجے میں اردو کی پیدائش ہوئی، محض ایک قیاس ہے نہ کہ ایک لسانی نظریہ۔

2.2.2 حافظ محمود شیرانی کا نظریہ:

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ایک اہم نظریہ حافظ محمود شیرانی (1880-1946) کا ہے۔ یہ نظریہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "پنجاب میں اردو" (1928) میں پیش کیا۔ اس کتاب میں محمود شیرانی اردو کی جائے پیدائش پنجاب قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے طویل عرصے کے لیے یہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ کتاب کے مقدمے میں اردو کی قدامت کے بارے میں محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> "ہم اردو کے آغاز کو شاہ جہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود ان ہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔" (پنجاب میں اردو، مقدمہ)

محمود شیرانی نے جن تاریخی عوامل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہیں کہ غزنی کے مسلم حکمراں محمود غزنوی نے 1027ء تک لگاتار سترہ حملوں کے بعد سر زمین پنجاب پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس فتح کے بعد مسلمان جن کی زبان فارسی تھی پنجاب میں آباد ہو گئے۔ پنجاب میں مسلمان تقریباً دو سو برسوں تک رہے اور محمد غوری کے حملوں (1192) کے بعد دہلی ہجرت کی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے طویل قیام کی مدت میں مقامی باشندوں سے گہرے سماجی رشتے قائم ہونا فطری بات ہے۔ سماجی تعلقات کے لیے مشترک زبان کی ضرورت پیش آئی اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جب مسلمانوں نے پنجاب سے دہلی ہجرت کی تو یہ نئی زبان بھی ان کے ساتھ آئی۔ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ پنجاب سے مسلمان جس زبان کو دہلی لائے وہ پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی ہو سکتی ہے۔ یہی زبان دہلی کی فتح کے بعد اردو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔" (پنجاب میں اردو، مقدمہ)

محمود شیرانی ان سیاسی اور تاریخی حالات سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی پیدائش سب سے پہلے پنجاب میں ہوئی اور اردو پنجابی کی قدیم شکل سے نکلی ہے۔ اپنے نظریے کی تائید میں انھوں نے پنجابی اور قدیم اردو کی مشترک لسانی خصوصیات پر اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ دکن میں دکنی کے نام سے فروغ پانے والی زبان یہی قدیم اردو تھی۔ یہ زبان دہلی سے متعدد فوجی حملوں کے نتیجے میں دکن پہنچی تھی۔ فتح دہلی (1193) کے بعد علاء الدین خلجی (م 1316) نے دکن میں دیوگری 1294 میں فتح کیا۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن کے علاقوں پر کامیاب حملے کیے۔ 1351 میں محمد تغلق (م 1351) نے اپنا پایۂ تخت دولت آباد (دیوگری) کو بنایا

اور دہلی کی تمام آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا۔ علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کی فوجی مہمات اور دہلی کی آبادی کے دکن منتقل ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو دکن میں بہت ترقی ہوئی اور اس زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔ محمود شیرانی نے اس قدیم اردو یعنی دکنی اردو اور پنجابی کے درمیان صوتی، صرفی اور نحوی اعتبار لسانی رشتے تلاش کیے ہیں۔ مثلاً پنجابی اور اردو میں علامت مصدر (نا) کا مشترک ہونا، الفاظ کے آخر میں نون غنہ "ں" کا ہونا، فعل کا تذکیر و تانیث اور واحد جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آنا وغیرہ۔ انھوں نے ان لسانی اشتراک کی مثالوں کو اپنے نظریے کی تائید میں بہ طور دلیل پیش کیا ہے۔ دکنی اور پنجابی کے صرف و نحو کے تقابلی مطالعے سے محمود شیرانی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "گذشتہ سطور کے مطالعے سے ہم پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔" (پنجاب میں اردو، ص99)

محمود شیرانی نے اردو زبان کے آغاز کے مسئلے پر جس تفصیل سے تجزیاتی اور مدلل بحث کی ہے وہ ان سے قبل کسی اور محقق نے نہیں کی۔ ان کا نظریہ بہت مشہور ہوا اور اس سے اردو زبان کے آغاز پر نئی بحث کا آغاز ہوا۔ ان کے نظریے نے اردو زبان کے کئی محققین کو متاثر کیا جن میں محی الدین قادری زور اور سنیتی کمار چٹرجی جیسے ماہرین لسانیات بھی شامل ہیں۔ لیکن ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے لسانیات کی روشنی میں محمود شیرانی کے نظریے کی تردید کی ہے۔ ان کے مطابق محمود شیرانی نے قدیم دور میں پنجابی کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ سب اس عہد کی ہریانی میں بھی موجود تھیں لیکن انھوں نے اسے نظر انداز کیا۔

آپ جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ جدید ہند آریائی کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پنجابی اور اردو دونوں ہی جدید ہند آریائی زبانیں ہیں۔ سبھی جدید آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ اس صورت میں پنجابی سے اردو کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے لسانیات کے نقطۂ نظر سے محمود شیرانی کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔

2.2.3 نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ:

نصیر الدین ہاشمی (1895-1964) اردو کے مشہور محقق، مؤرخ اور ادیب تھے۔ انھوں نے دکنی ادب پر بہت کام کیا ہے۔ دکنیات کے حوالے سے انھوں نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں "سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری" (1922)، "دکن میں اردو" (1923)، "مدراس میں اردو" (1928)، "دکنی ہندو اور اردو" (1956) اہم ہیں۔ "دکن میں اردو" ان کی سب سے مشہور کتاب ہے جو چھ صدیوں پر محیط دکن کے ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کا موضوع دکن میں اردو ادب کی تاریخ ہے جس میں دکنی ادب کی خدمات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں نصیر الدین ہاشمی نے اردو کی ابتدا کے بارے میں چار مختلف نظریات کا جائزہ لیا

ہے۔اس فہرست میں انھوں نے پنجاب،سندھ اور دو آبہ گنگ و جمن کے علاوہ دکن میں اردو کی ابتدا کو بھی ایک نظریہ کے طور پر شامل کیا ہے۔ وہ سندھ اور دکن میں اردو کی ابتدا کے بارے لکھتے ہیں:

"یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا، کیوں کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔"

(دکن میں اردو، ایڈیشن 1985 ص 33)

نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو کی ابتدا کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عرب سے مسلمان تجارت اور دین کی تبلیغ کے لیے سندھ کے بعد مالا بار اور کرناٹک کے ساحلوں پر آئے۔ ان مسلمانوں نے اپنی جدوجہد، ملنساری اور نیک مزاجی کی وجہ سے مقامی ہندوؤں کے دلوں میں جگہ بنائی۔ اس طرح وہ ملک کے اندر بس گئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ نصیر الدین ہاشمی نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دکن مسلمانوں کے لیے وطن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اس لیے انھیں مقامی باشندوں سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت تھی۔

نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو کی ابتدا کے دعویٰ کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کی تائید میں کئی مثالیں بھی دیتے ہیں لیکن سندھ کی طرح دکن میں اردو کی ابتدا کی تردید بھی کرتے ہیں۔ جس لسانی حقیقت کے پیش نظر انھوں نے سندھ سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو رد کیا اسی کو بنیاد بنا کر دکن میں اردو کی ابتدا سے انکار کرتے ہیں۔ البتہ ان کے بیان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ قطعی طور پر اس نظریے کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ لسانی شواہد کے دستیاب نہ ہونے کے سبب فی الحال اس نظریے سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

"جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے میں مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں۔ اس لیے سرِ دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔" (ایضاً 36)

نصیر الدین ہاشمی نے سندھ سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو اس بنا پر رد کیا تھا کہ اردو زبان میں فارسی کا حصہ غالب ہے لہٰذا وہ عربی اور شورسینی کا مرکب نہیں ہو سکتی۔ دکن سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرنے میں بھی یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو عربی اور دکن کی زبانوں کے اشتراک سے بنی ہے تو اس میں فارسی زبان کا عنصر کیوں حاوی ہے۔ اس لیے دکن میں اردو کی ابتدا کا نظریہ لسانیات کی روشنی میں کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عربی اور دکن کی دراوڑی زبانیں دونوں ہی ہند آریائی خاندان سے تعلق نہیں رکھتیں۔ اس لیے اگر اردو میں عربی کا حصہ زیادہ ہوتا تب بھی دو مختلف لسانی خاندان کی زبانوں کے اشتراک سے کسی تیسرے لسانی خاندان کی زبان اردو کا پیدا ہونا قرین قیاس نہیں۔

یہ بات تاریخی اور لسانی دونوں اعتبار سے درست ہے کہ اردو کی ابتدا شمال میں اور اس کا ارتقا دکن میں ہوا۔ البتہ لسانیات کی روشنی میں ان کی یہ رائے قابل قبول نہیں کہ اردو کا بیج باہر سے آنے والے مسلم فاتحین نے لگایا۔ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کی

نشو و نما شورسینی اپ بھرنش سے ہوئی ہے۔ مسلم فاتحوں کی زبان فارسی نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ماہر لسانیات سنیتی کمار چیڑ جی نے اپنی کتاب ہند آریائی اور ہندی میں واضح کیا ہے کہ مسلمان اگر ہندوستان میں نہ آتے تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آتیں لیکن زبانوں کے ادبی آغاز و ارتقا میں دو ایک صدی کی تاخیر ضرور ہو جاتی۔

نصیر الدین ہاشمی کی رائے یہ ہے کہ اردو زبان اپنی خام شکل میں شمال کے فاتحین کے ذریعے دکن پہنچتی ہے جہاں یہ ہر عام و خاص کی زبان بن جاتی ہے۔ دکن کی ریاستیں جب مرکز سے علاحدہ ہو کر خود مختار حکومت قائم کر لیتی ہیں تو اردو یہاں آزادانہ طور پر فروغ پاتی ہے۔ اس تاریخی عمل کے نتیجے میں دکن کی اردو شمال کی اردو سے مختلف صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی دکن کی اس اردو زبان اور ادب کے ارتقا کی تفصیلی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں وہ کوئی نیا نظریہ نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ دو آبہ گنگ و جمن میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما اور اس زبان میں ادب کی ابتدا اور فروغ دکن میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو کہ تاریخی اور لسانی دونوں لحاظ سے صحیح ہے۔ بلاشبہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب " دکن میں اردو" کے ذریعے اردو کی قدیم شکل " دکنی اردو' ' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ پیش کی ہے۔ اردو زبان و ادب کے ارتقا کے ابتدائی دور کی اس تحقیق سے اردو زبان و ادب کی ابتدا اور ارتقا کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ اردو کے مشہور محقق محمود شیرانی اور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرنے کے لیے قدیم اردو یعنی دکنی اردو کے ادب ہی سے مثالیں پیش کی ہیں۔ اس لیے نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ اردو کی ابتدا کے بارے میں نہیں بلکہ اردو کے ارتقا کے متعلق ہے اور ان کی کتاب " دکن میں اردو" دکن میں اردو کے ارتقا کی تاریخ ہے۔

2.3 اردو کی ابتدا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات

لسانیات زبان کا سائنسی طریقے سے مطالعے کا علم ہے۔ بیسویں صدی میں لسانیات کا علم عام ہوا اور لسانیات کی روشنی میں زبانوں کی ابتدا کے بارے میں خالص علمی طریقے سے سنجیدہ تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں بھی لسانیاتی مطالعے کا آغاز ہوا جس کا سہرا ایک یوروپی عالم سر ولیم جونس کے سر جاتا ہے۔ ولیم جونس یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی اور فارسی جیسی اہم عالمی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ کلکتہ سپریم کورٹ کا جج بننے کے بعد اس نے سنسکرت بھی سیکھی۔ اس کی ایما پر ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ولیم جونس نے ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسے میں ایک مقالہ پیش کیا جس میں اس نے سنسکرت اور دیگر یوروپی زبانوں کے درمیان حیرت انگیز اشتراک اور مماثلتوں کی نشان دہی کی۔ اس موضوع پر جب مزید تحقیق ہوئی تو زبانوں کے سب سے بڑے خاندان " ہند یوروپی" کی شناخت کی گئی جس کی ایک اہم شاخ "ہند آریائی" ہے۔ شمالی ہندوستان کی تمام زبانیں بشمول اردو اسی ہند آریائی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان میں لسانیات کے حوالے سے ہند آریائی زبانوں کے مطالعے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہند آریائی کے جدید دور کی زبانوں کی ابتدا پر لسانیات کی روشنی میں کئی محققین نے کام کیا۔ اردو بھی ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کے آغاز و ارتقا کے بارے میں خالص سائنسی بنیادوں پر تحقیق شروع ہوئی۔

اردو کی ابتدا کے متعلق اردو کے عالموں کے علاوہ یوروپی اور دیگر ماہرین لسانیات نے بھی اظہار خیال کیا۔ ان میں ۔ژول بلاک،

گراہم بیلی، جان بیمز، جارج گریرسن، سنیتی کمار چٹرجی اور شری رام شرما جیسے عالموں کے نام شامل ہیں۔جارج ابراہیم گریرسن (م1941ء)انیسویں صدی کاایک یوروپی عالم اور مشہور ماہر لسانیات تھا۔اسے ہندوستانی زبانوں کی ابتدا اور ارتقا کے مطالعے میں بہت دلچسپی تھی۔اس کی مشہور تصنیف ''لسانیاتی جائزۂ ہند 18 (Lingustic Survey Of India) ''جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں اس نے لسانیات کی روشنی میں ہندوستان کی 179 زبانوں اور 544 بولیوں کا جائزہ لیا ہے۔مسعود حسین خاں کے مطابق

''ہند آریائی لسانیات میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ گریرسن کا عظیم الشان ''لسانیاتی جائزہ ہند'' ہے۔گریرسن نے سب سے پہلے بالتفصیل ان قیاس آرائیوں کا ازالہ کیا ہے جو ہماری زبان کے کینڈے کے متعلق بغیر سوچے سمجھے کی گئی تھیں۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو)

بیسویں صدی میں ہی ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں،ڈاکٹر شوکت سبزواری،ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں سائنسی نقطۂ نظر سے اپنے لسانیاتی نظریات پیش کیے۔ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو زبان سے متعلق اہم لسانیاتی نظریات اپنی مشہور کتابوں 'اردو زبان کا ارتقا' اور ' داستان زبان اردو' میں پیش کیے ہیں۔ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو اور کھڑی بولی کو ایک ہی تصور کرتے ہیں اور اردو کے آغاز کا زمانہ بارہویں صدی قرار دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو جب بول چال کی زبان بن گئی تو اسے کھڑی بولی کے نام سے موسوم کیا گیا۔'داستان زبان اردو' میں اردو کی ابتدا کے بارے وہ اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اردو ہندوستانی سے ترقی پاکر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی، دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاء الدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ہندو اہل علم عام طور سے برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے جو اس وقت 'پڑی' کہلاتی تھیں، کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔جب یہ زبان ترقی پاکر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔زبان بنیادی طور سے وہی رہی جو آج ہے۔اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔''

(داستان زبان اردو، ص94)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں اپنی کئی کتابوں میں تفصیلی بحث کی ہے۔ان کتابوں میں 'اردو کی زبان'، 'اردو کا روپ' اور 'اردو کی کہانی' اہم ہیں۔ڈاکٹر سہیل بخاری،ڈاکٹر شوکت سبزواری کے ہم خیال ہیں اور وہ بھی اردو کو کھڑی بولی کا ایک روپ تسلیم کرتے ہیں۔لیکن وہ کھڑی بولی کا علاقہ اڑیسہ کے قریب واقع کسی 'کھڑ' نامی علاقے کو قرار دیتے ہیں جب کہ سبھی ماہرین لسانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کھڑی بولی کا علاقہ نواح دہلی ہے۔ڈاکٹر سہیل بخاری نے ایک مضمون میں اردو زبان کے بارے میں یہ دعوی بھی

کیا ہے کہ اردو ہند آریائی زبان نہیں بلکہ ایک دراوڑی بولی ہے جو ہندوستان میں آریوں کی آمد سے قبل بھی رائج تھی۔ ظاہر ہے ڈاکٹر سہیل بخاری کی اس رائے کو لسانی تحقیق نہیں کہا جا سکتا۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"کھڑی بولی علاقہ 'کھڑ' کی بولی ہے اور کھڑ غالباً اڑیسہ کے جنوب میں سمندر کے قریب واقع ایک کٹا پھٹا علاقہ ہے کیوں کہ کھڑ کے متبادل الفاظ کھنڈ اور کاٹ ہیں۔ اسی علاقے میں جارج گیریرسن کے قول کے مطابق کھڑیا اور کٹیائی نامی دو ملتی جلتی سی زبانیں بولی جارہی ہیں جن کا ہلکا سا خاکہ اس نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں دیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہی اس کھڑی بولی کی جنم بھومی ہے جس کی فارسی لپی میں قلم بند کی ہوئی ایک شکل کو ہم "اردو" کہتے ہیں اور دیو ناگری لپی میں قلم بند کی ہوئی دوسری شکل کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس بارۂ خاص میں کھڑی بولی یورپ کی سربو کروشین کے مشابہ ہے جو یوگو سلاویہ کی جنوبی سلاوی بولی ہے کہ جب وہ سرولک لپی (روسی رسم خط) میں لکھی جاتی ہے تو سربین کہلاتی ہے اور سربیا میں بولی جاتی ہے اور جب رومن لپی میں لکھی جاتی ہے تو کروشین کہلاتی ہے اور کروشیا میں بولی جاتی ہے۔ چناں چہ کھڑی بولی بھی سربو کروشین کی طرح دو مختلف لپیوں میں لکھے جانے کے باعث دو مختلف ناموں سے موسوم ہو گئی ہے۔" (بحوالہ اردو زبان کی تاریخ، ص 115)

ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی طرح ڈاکٹر گیان چند جین بھی اردو اور کھڑی بولی کے مابین گہرے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اردو زبان کے لسانی مسائل پر انہوں نے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں جن میں "عام لسانیات"، 'لسانی مطالعے"، "کھوج" اور "اردو کا اپنا عروض" اہم ہیں۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں ان کی سب سے اہم کتاب "لسانی مطالعے" ہے۔ اپنے ایک مضمون "اردو کے آغاز کے نظریے" میں وہ اردو کو کھڑی بولی کا ہی ایک روپ قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون میں وہ اپنے نظریے پر اصرار کرتے ہیں کہ "اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔" وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی کھڑی کا ایک روپ مانتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو کی ابتدا کے بارے میں جس علمی تحقیق کی شروعات حافظ محمود شیرانی سے ہوتی ہے، اسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چند جین نے خالص لسانیات کی روشنی میں آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا سے متعلق جو تحقیق کی ہے اور اپنے نظریات پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ ہم آگے تفصیل کے ساتھ کریں گے۔

2.3.1 ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ:

ڈاکٹر محی الدین قادری زور (1905-1962) اردو کے معروف ماہر لسانیات اور محقق تھے۔ انھوں نے لندن اور پیرس میں واقع لسانیات کی تعلیم کے عالمی مراکز میں با قاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اس وقت تک لسانیات کی اہم شاخ علم صوتیات کا اردو میں کوئی واضح تصور نہ

تھا۔ڈاکٹر زور نے لسانیات کے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے علم صوتیات کی روشنی میں شمالی، دکنی اور گجراتی اردو میں فرق تلاش کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے علم صوتیات کی مدد سے اردو زبان کی ابتدا کے مسئلے کا نئے سرے سے جائزہ لیااور اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ ڈاکٹر زور نے لسانیات کے موضوع پر جو علمی تحقیقات کی تھیں انھیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان کی پہلی کتاب ''ہندوستانی صوتیات1930 (Hindustani Phonetics) ''میں اور دوسری کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' 1932 میں شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ خصوصاً ہندوستانی لسانیات کے حصہ دوم میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے انھوں نے نہایت مدلل اور مفصل طور پر بحث کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کے لسانی پہلوؤں پر تحقیق کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو زبان میں محمود شیرانی کی '' پنجاب میں اردو'' کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر کتاب موجود نہیں ہے۔ ان کے مطابق '' پنجاب میں اردو'' اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں اردو سے متعلق جدید ترین لسانی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل اردو کی ابتدا کے موضوع پر ایسا تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔

ڈاکٹر زور نے اردو کی ابتدا کے متعلق تمام نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کی پیدائش دہلی کی فتح سے قبل ہو چکی تھی۔ جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اردو نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ اردو اس زبان سے نکلی ہے جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے سے الہٰ آباد کے درمیانی حصے میں بولی جاتی تھی۔ ڈاکٹر زور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔ اس طرح وہ محمود شیرانی کے اس نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں اس وقت ہوئی جب وہاں غزنویوں کی حکومت تھی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جہاں محمود شیرانی کے نظریے کی حمایت کی ہے وہیں اردو زبان کے آغاز اور ارتقا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی اور ہریانی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اردو پنجابی یا کھڑی بولی سے نہیں نکلی بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلی ہیں۔ اس لیے اردو کی پنجابی اور کھڑی بولی دونوں سے بہت مشابہت ہے۔ لیکن اردو زبان پر کھڑی بولی کے اثرات پنجابی کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ پنجابی اور کھڑی بولی کے علاوہ اردو پر ہریانی کا بھی کافی اثر ہے کیونکہ یہ دہلی کے آس پاس کی زبان ہے۔ وہ پنجابی، کھڑی اور ہریانوی سے اردو کے لسانی رشتے کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔ یہاں ایک اور بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے

حکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقہ کے رہنے والے بھیرو بنگاہ کے میل کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح و مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا۔" (ہندوستانی لسانیات،ڈاکٹر زور،ص90)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے ایک مضمون "اردو کی ابتدا"(1962)میں بھی اپنے نظریے کی مزید وضاحت کی ہے۔ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے ڈاکٹر زور کے نظریے سے علمی اختلاف کرتے ہوئے ان کی لسانی تحقیق سے استفادہ بھی کیا ہے۔مسعود حسین خاں اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ہریانی زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔اردو پر ہریانی کے اثرات کی جانب سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے ہی اشارہ کیا ہے۔اس طرح ماہر لسانیات ڈاکٹر زور کا نظریہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق تمام نظریات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

2.3.2 پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ:

پروفیسر مسعود حسین خاں(پ 1919)اردو کے نامور ماہر لسانیات اور لسانی محقق ہیں۔انھوں نے لسانیات کے کئی نئے پہلوؤں مثلاً صوتیات، تشکیلیات اور اسلوبیات وغیرہ موضوعات کو اپنی تحقیق کا مرکز بنایا۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد وہ دوسرے بڑے محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر خالص سائنسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ڈاکٹر زور کی طرح مسعود حسین خاں نے بھی نے لندن اور پیرس میں واقع لسانیات کی تعلیم کے عالمی مراکز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔1953 میں انھیں پیرس یونیورسٹی نے لسانیات میں اعلیٰ تحقیق کے لیے ڈی۔لٹ کی ڈگری سے نوازا۔اس سے قبل 1945 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مسعود حسین خاں کو ان کے تحقیقی مقالے "مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو" پر پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل ہو چکی تھی۔یہ تحقیقی مقالہ 1948 میں دہلی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔اس کتاب کے ساتویں ایڈیشن میں انھوں نے نئی تحقیق کی روشنی میں مزید اضافے کیے ہیں۔انھوں نے اس تحقیقی کتاب میں اردو کی ابتدا کے تمام موجود نظریات پر سوال کھڑے کیے اور اس مسئلے پر نئے سرے سے بحث کا آغاز کیا۔مسعود حسین خاں کی اس کتاب نے انھیں ایک عہد ساز ماہر لسانیات کی شہرت عطا کی ہے۔یہ کتاب اردو کے آغاز سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور بولیوں کا توضیحی، تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔اردو کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی جیسے اہم سوالوں کا جواب مسعود حسین خاں نے اسی جدید لسانیاتی مطالعے کی مدد سے تلاش کیا ہے۔اس طرح وہ اردو زبان کے آغاز کا سب سے قابلِ قبول نظریہ پیش کرتے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبانِ اردو میں اپنا نظریہ پیش کرنے سے قبل اردو کی ابتدا سے متعلق معروف لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے برج بھاشا اور پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریات پر بحث کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کے علاوہ میر امّن،ماسٹر رام چندر اور سرسید احمد خاں نے بھی اردو کو برج بھاشا سے منسوب کیا ہے۔یہ صحیح ہے کہ برج بھاشا نے قدیم اردو کو جدید اردو میں تبدیل کرنے میں مدد کی ہے اور اردو کے ارتقا میں برج کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔لیکن چند لسانی مماثلتوں کے ساتھ ہی اردو کی بنیادی بولی' کھڑی اور برج میں لسانی اختلافات بھی ہیں۔اس لیے اردو اور برج بھاشا کے بیچ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔

برج سے اردو کی پیدائش کی تردید کے بعد مسعود حسین خاں نے پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریے کی سخت تنقید کی ہے۔ یہ نظریہ محمود شیرانی کا ہے جس کی ڈاکٹر گراہم بیلی، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے تائید کی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ اس نظریے پر یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ جب اردو کا ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا اس وقت پنجابی خود اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ اس صورت میں ایک زبان سے دوسری زبان کی پیدائش کیسے ممکن ہے۔ انھوں نے پنجابی اور جدید و قدیم اردو میں اہم اور بنیادی اختلافات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ محمود شیرانی نے قدیم دور میں جو خصوصیات پنجابی کی بتائی ہیں وہ سب اس عہد میں ہریانی میں بھی موجود تھیں جنہیں محمود شیرانی نے سرے سے نظر انداز کر دیا۔

مسعود حسین خاں نے نواح دہلی کی بولیوں ہریانوی، کھڑی اور میواتی سے قدیم دکنی کے لسانی رشتے تلاش کرتے ہوئے نواح دہلی کی سبھی بولیوں کے لسانی اختلافات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی اور ہریانوی بولیوں کا تقابلی مطالعہ نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں پنجابی کے بجائے ہریانوی پر زور دیا ہے۔ وہ اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریے کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانوی اور پنجابی میں خطِ فاصل قایم کرنا دشوار تھا۔ قدیم اردو اور دکنی کا ”پنجابی پن“ اس کا ”ہریانی پن“ بھی ہے۔ البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی کے مقابلے میں ہریانوی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔“ (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو)

اردو زبان پر ہریانوی کے اثرات کا ذکر–ژول بلاک اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی کیا ہے۔ مسعود حسین خاں نے قدیم دکنی اور ہریانوی میں صوتی مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ وہ دکنی میں غنہّ کے کثرت سے استعمال کی وجہ پنجابی کے بجائے ہریانوی سے رشتے کو بتاتے ہیں۔ انھوں نے کئی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ دکنی ضمائر پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں اور دکنی اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔ مسعود حسین خاں پہلے اردو اور ہریانوی کے لسانی رشتے کی تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قدیم اردو ہریانی سے بنی تھی جس پر بعد میں کھڑی بولی کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے ہریانوی کے ساتھ کھڑی بولی کو بھی اہمیت دی ہے اور اردو کی پیدائش میں دونوں بولیوں کو برابر کا حصہ دار بتایا ہے۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو کی ساتویں اشاعت (1987) میں یہ وضاحت کی کہ اردو زبان کے ماخذ کے بارے میں انھوں نے نظریاتی ترمیم کی ہے۔ اب وہ اردو کے آغاز کے سلسلے میں ہریانوی کے بجائے کھڑی کو اولیت دیتے ہیں۔ کھڑی بولی اور ہریانوی کے ساتھ ساتھ وہ دہلی اور نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں کا بھی تقابلی مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اردو زبان کے آغاز میں دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کی اہمیت کا اندازہ انھیں امیر خسرو (1253-1325) کے ایک فقرے ”دہلی و پیرامنش“ سے ہوا۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی ”نُہ سپہر“ میں بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست دی ہے۔ ہندوستان کی جن بارہ زبانوں کی فہرست امیر خسرو نے دی ہے وہ زبانیں خسرو کے عہد میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج تھیں۔ ان زبانوں میں ایک زبان ”زبانِ دہلی و پیرامنش“ بھی ہے جس سے مراد دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں ہیں۔ مسعود حسین خاں نے ان ہی بولیوں کو اپنی لسانی تحقیق کا مرکز بنایا اور اپنے نظریے کی بنیاد بھی ان ہی بولیوں پر رکھی۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ ”زبانِ دہلی و پیرامنش اردو کا اصل منبع اور سر

چشمہ ہے۔ اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا۔" (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص262)۔ مسعود حسین خاں نے دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ دہلی اور اس کے اطراف کی لسانی اہمیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"شہر دہلی تین بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔ شمال مشرق میں کھڑی اور جنوب میں برج کا علاقہ ہے۔ اردو کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔" (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ایڈیشن 1987، ص235()

مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز کی تاریخ بھی اسی بنیاد پر طے کی ہے ۔ ان کے مطابق جب مسلمانوں نے 1193 میں دہلی فتح کی تب دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں عربی وفارسی کے لسانی اثرات داخل ہونے شروع ہوئے۔ اس لیے اردو کا آغاز دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی سے قبل سندھ اور پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں عربی وفارسی کے الفاظ داخل ہو رہے تھے۔ لیکن مسعود حسین خاں مقامی بولیوں میں عربی وفارسی الفاظ کے داخل ہونے کو اردو کی پیدائش کی وجہ نہیں تسلیم کرتے۔ ان کے نظریے کے مطابق اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ محمد غوری کی فتح دہلی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا، بلکہ جب یہ لسانی اثرات زبانِ 'دہلی وپیرامنش' میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا پہلا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتح دہلی (1193) کے بعد۔"

(مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص235)

مسعود حسین خاں نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی فارسی کے لسانی اثرات کا نفوذ سب سے پہلے دہلی کے اطراف میں رائج کھڑی بولی میں ہوا۔ ان لسانی اثرات کے نفوذ کا عمل محمد غوری کے دہلی فتح کرنے کے بعد ہوا۔ کھڑی بولی کے مستند نمونے سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں۔ ان مستند نمونوں کی مثالیں بھی انہوں نے اپنی کتاب ' مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں تفصیل کے ساتھ دی ہیں۔ مسعود حسین خاں دکنی اردو کو اردو کی ہی قدیم شکل مانتے ہیں اور اسے قدیم اردو کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے اس قدیم اردو کے دستیاب لسانی مواد کی صوتی خصوصیات، اسما، افعال اور حروف کا مطالعہ کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح انھوں نے قدیم اردو اور کھڑی کے علاوہ نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں سے قدیم اردو کے باہمی رشتوں اور مماثلتوں کو تلاش کیا ہے۔ اس مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کا ابتدائی ڈھانچہ کھڑی اور ہریانوی سے تیار ہوا ہے جس پر رفتہ رفتہ علاقائی اثرات پڑنے لگے۔

مسعود حسین خاں کے مطابق قدیم دکنی یا مراہٹی کے بعض لسانی اثرات کے علاوہ اکثر نامانوس الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی مذکورہ تین بولیوں یعنی کھڑی بولی، ہریانی اور برج بھاشا سے کی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں زبانوں کے ارتقا کی رفتار بدلتے سیاسی حالات کے سبب تیز تر رہی ہے جب کہ جنوبی ہند میں دراوڑی زبانوں کے اجنبی ماحول میں لسانی ارتقا کی رفتار نہایت سست رہی۔ اس لیے دکنی اردو میں آج الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں چھ صدی قبل رائج تھیں۔

مسعود حسین خاں پہلے ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے قدیم دکنی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا لسانیاتی تجزیہ کرکے اردو زبان کے آغاز و ارتقا میں ان زبانوں کی اہمیت ثابت کی ہے۔ انھوں نے اپنا نظریہ نہایت مستند لسانی مواد سے مثالیں دے کر اور دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے آج بھی مسعود حسین خاں کا یہ نظریہ لسانیات کے لحاظ سے قابل قبول ہے کہ اردو کی جائے پیدائش دہلی اور نواحِ دہلی ہے۔ اردو کے آغاز و ارتقا کے متعلق یہ سب سے قابلِ قبول نظریہ ہے جس کی تردید اب تک کسی ماہر لسانیات نے نہیں کی ہے۔

2.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا زبان شناس قرار دیا ہے۔
- اردو کی ابتدا کے بارے میں با قاعدہ غور و فکر کا سلسلہ میر امّن دہلوی سے شروع ہوتا ہے۔
- انشاء اللہ خاں انشا نے اردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے۔
- سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی اور سید احمد دہلوی نے بھی اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا۔
- محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بہت مشہور ہوا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔
- سید سلیمان ندوی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔
- محمود شیرانی اردو کی جائے پیدائش پنجاب قرار دیتے ہیں۔
- نصیر الدین ہاشمی کی رائے یہ ہے کہ اردو کی ابتدا شمال میں ہوئی جب کہ اس کا ارتقا دکن میں ہوا۔
- جدید لسانی تحقیقات کے آغاز سے دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ اردو کی ابتدا کے بارے میں بھی نئی بحث شروع ہوئی۔
- ڈاکٹر زور نے اردو زبان کی ابتدا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی اور ہریانی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔
- ڈاکٹر زور کے مطابق اردو پنجابی یا کھڑی بولی سے نہیں نکلی بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلی ہیں۔
- مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا میں قدیم دکنی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کے رشتوں کو ثابت کیا ہے۔
- مسعود حسین خاں کا نظریہ اردو کی ابتدا کا سب سے زیادہ قابل قبول نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

2.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
لسانیات	:	زبان کا علم
مخلوط	:	ملا جلا، ملا ہوا
اختلاط	:	میل جول
ارتقا	:	فروغ، ترقی

ہیولیٰ	:	ڈھانچہ، خاکہ
اخذ کرنا	:	لے لینا، اختیار کرنا
دلائل	:	دلیل کی جمع، ثبوت، شہادت
جائے پیدائش	:	پیدا ہونے جگہ
مؤرخ	:	تاریخ لکھنے والا
تردید کرنا	:	رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا
مولد	:	پیدا ہونے کی جگہ، جائے ولادت، وطن
تعین	:	ٹھہرانا، مقرر کرنا، مخصوص کرنا
تشخیص	:	جاننا، پہچاننا، شناخت کرنا
دوآبہ	:	دو دریاؤں کے درمیان کا علاقہ
مشترک	:	شریک، ساجھا، شرکت کیا ہوا
محیط	:	گھیرنے والا
گہوارہ	:	مہد، پنگوڑا، ہنڈولا
نظریہ	:	اصول، تھیوری، وہ مسئلہ جس میں نظر و فکر سے کام لیا جائے
بھیر و بنگاہ	:	فوج کے شاگرد پیشہ اور خیمہ و خرگاہ
مبنی	:	بنیاد رکھا ہوا
مشتق	:	ایک لفظ سے دوسرا لفظ بنایا ہوا
تردید کرنا	:	رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا
نامانوس الفاظ	:	قدیم الفاظ، غیر رائج الفاظ، ایسے الفاظ جو اب چلن میں نہ ہوں
صوتیات	:	آواز سے تعلق رکھنے والا علم
مدلّل	:	دلیل سے ثابت کیا ہوا، معقول، ٹھیک، درست
مفصّل	:	تفصیل سے بیان کیا گیا، صاف، واضح، کھول کر بیان کیا گیا
تجزیہ	:	الگ الگ کرنا، کسی بات کے ہر پہلو کو واضح کرنا
تائید کرنا	:	حمایت کرنا، ساتھ دینا
سرچشمہ	:	نکلنے کی جگہ، سوتا، منبع

مشترک	:	شریک، ساجھا، شرکت کیا ہوا
تشکیلیات	:	تشکیل کی جمع، زبان کی ساخت اور بناوٹ کا علم
اسلوبیات	:	زبان کے طرز، انداز اور روش کا علم
تقابل کرنا	:	مقابلہ کرنا، موازنہ کرنا
توضیح کرنا	:	واضح کرنا، تشریح کرنا، وضاحت کرنا
مماثلت	:	یکسانیت، مشابہت، مانند ہونا
ضمائر	:	ضمیر کی جمع، مختصر اسم

2.6 نمونۂ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو کا پہلا زبان شناس کون ہے؟

(a) میر امن (b) جعفر زٹلی (c) مسعود سعد سلمان (d) امیر خسرو

2۔ 'نقوش سلیمانی' کس کی تصنیف ہے؟

(a) سید سلیمان ندوی (b) حلیم شمس اللہ قادری (c) محی الدین قادری (d) محمود شیرانی

3۔ "اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے"، یہ کس کا قول ہے؟

(a) میر امن (b) محمد حسین آزاد (c) محمود شیرانی (d) سینتی کمار چٹر جی

4۔ سلیمان ندوی کے مطابق اردو کا پہلا ہیولیٰ کہاں بنا؟

(a) پنجاب (b) دکن (c) سندھ (d) دہلی

5۔ "پنجاب میں اردو" کس نے لکھی ہے؟

(a) محمود شیرانی (b) محمد حسین آزاد (c) مسعود حسین خاں (d) نصیر الدین ہاشمی

6۔ محمود شیرانی کے مطابق اردو کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) پنجاب (b) لاہور (c) دہلی (d) دکن

7۔ نصیر الدین ہاشمی نے 'دکنی اردو' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ کس کتاب میں پیش کی ہے؟

(a) مدراس میں اردو (b) دکنی ہندو اور اردو (c) دکن میں اردو (d) ان میں سے کوئی نہیں

8۔ حلیم شمس اللہ قادری کی کتاب کا کیا نام ہے؟

(a) اردوئے قدیم (b) قدیم اردو (c) دکنی اردو (d) اردو زبان کا ارتقا

9۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو کی پیدائش کب ہوئی؟

(a) دکن (b)سندھ (c)دہلی (d)پنجاب

10۔ ڈاکٹر زور کے مطابق اردو کس زبان پر مبنی ہے؟

(a)دکنی (b)پنجابی (c) گجراتی (d)مراٹھی

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سید سلیمان ندوی سندھ کو اردو کی جائے پیدائش کیوں قرار دیتے ہیں؟

2۔ اردو کے آغاز میں دہلی اور نواحِ دہلی کی کن بولیوں کی اہمیت ہے؟

3۔ اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ کیا ہے؟

4۔ اردو کو کن عالموں نے مخلوط زبان قرار دیا؟

5۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں محمد حسین آزاد کی رائے کیا ہے؟

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں محمود شیرانی کا نظریہ کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

2۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو پر کن زبانوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، بیان کیجیے۔

3۔ ہریانوی اور اردو کے لسانی رشتے پر مسعود حسین خاں کے خیالات بیان کیجیے۔

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ نقوشِ سلیمانی — سید سلیمان ندوی

2۔ پنجاب میں اردو — حافظ محمود شیرانی

3۔ دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

4۔ مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو (آٹھواں ایڈیشن) — مسعود حسین خاں

5۔ اردو کا روپ — سہیل بخاری

2.6.1 کے جوابات: d۔1 a۔2 b۔3 c۔4 a۔5

a۔6 c۔7 a۔8 c۔9 b۔10

اکائی3 : اردوادب کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 تصوف کی تعریف و تشریح اور صوفیاکی خصوصیات

3.3 ارد و ادب کی نشو ونما میں صوفیا ئے کرام کا حصہ

3.4 تیرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.4.1 خواجہ معین الدین چشتی

3.4.2 شیخ فریدالدین مسعو د شکر گنج یا گنج شکر

3.4.3 شیخ حمیدالدین ناگوری

3.5 چودہویں صدی کا مذہبی سر مایہ

3.5.1 امیر خسرو

3.5.2 شیخ عین الدین گنج العلم

3.5.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

3.6 پندرہویں صدی کا مذہبی سر مایہ

3.6.1 حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

3.6.2 میراں جی شمس العشاق

3.7 سولہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.7.1 شیخ بہاء الدین باجن

3.7.2 شاہ علی محمد جیو گام دھنی

3.7.3 برہان الدین جانم

3.8 سترہویں صدی کا مذہبی سر مایہ

3.8.1 خوب محمد چشتی

3.8.2 میراں جی خدانما
3.8.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰ
3.9 اکتسابی نتائج
3.10 کلیدی الفاظ
3.11 نمونۂ امتحانی سوالات
3.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

پچھلی اکائیوں میں آپ نے اردو کی کی ہند آریائی دور اور اردو کے مختلف نظریات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اب اس اکائی میں اردو ادب کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ابتدا میں علم تصوف کی بنیادی باتیں اور صوفیائے کرام کی خصوصیات بیان کی جائیں گی تا کہ ہم ان کی خدمات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- علم تصوف پر روشنی ڈال سکیں۔
- صوفیا کی خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں
- صوفیا کے کام اور اردوادب کی نشو و نما میں صوفیا کرام کی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔
- تیرہویں صدی تا سترہویں صدی عیسوی کے چند نما ئندہ صوفیائے کر ام اور ان کی شعری و نثری کا رناموں کا جائزہ لے سکیں۔

3.2 تصوف کی تعریف و تشریح اور صوفیا کی خصوصیات

شریعت کے احکام کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجالانے اور اطاعت میں خدا کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے ہی کا نام تصوف ہے۔اس کا مو ضوع تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب (صفائی)' اخلاق و تعمیر ظاہر و باطن ہے۔اس کی غایت و مقصد سعادت ابدی کا حاصل کرنا ہے۔

تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آداب شریعت کی پابندی رہے' حرام اور مشتبہ چیزوں سے دست کشی کی جائے' ناجائز اوہام اور خیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزاراجائے۔

تصوف کے تمام سلسلے اور تمام شاخیں حق تعالیٰ سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتے ہیں۔صوفیا کے یہاں دوئی کی گنجائش نہیں ہے۔صوفیائے کرام کے نظریے دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔(1) وحدت الوجود (2) وحدت الشہود۔

تصوف کے مختلف سلسلے پیدا ہوئے ۔چشتیہ' قادریہ ' سہر وردیہ' نقشبندیہ' شطاریہ' مجددیہ' مداریہ' قلندریہ وغیرہ۔ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو مانا جاتا ہے۔قادری سلسلہ کے بانی حضرت عبدالقادر جیلانی تھے۔سہروردی سلسلہ کی ابتداء ضیاالدین نجیب سہر وردیؒ نے کی۔نقشبندی سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی کے نام سے منسوب ہے۔شطاری سلسلہ حضرت شاہ عبداللہؒ نے شروع کیا۔

صوفی لفظ " صوف " سے بنا ہے جس کے معنی موٹا اون ہیں۔لباس صوف پہننے والے کوصوفی کہا گیا۔صوفی ظاہری اعمال کے ساتھ باطنی حسن واخلاق پر بھی نظر رکھتا ہے۔وہ زندگی کی اصل غرض داخلی اور روحانی اصلاح کو قرار دیتا ہے۔وہ خشیت الٰہی (اللہ کا خوف)سے لرزاں اور محبت الٰہی سے سرشار ہوتا ہے۔اس کی زندگی صاف' سادہ اور بے داغ ہوتی ہے۔اس میں دکھاوا بالکل نہیں ہوتا۔وہ سختیاں سہنے کا عادی ہوتا ہے۔اس کا مطمح نظر دنیا نہیں ہوتی۔اس میں خدا کا عشق اور خدا کے بندوں کی محبت پائی جاتی ہے۔ایک سچا صوفی معیاری مسلمان ہوتا ہے۔صوفیادین سے غفلت برتنے والے لوگوں کو مذہب کی باطنی قدروں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ان کے تزکیۂ قلب اور پاکیزگیِ روح کا سامان کرتے ہیں۔عیش طلبی کو خیر باد کہتے اور سادہ زندگی کی طرف خلقت خداکو مائل کرتے ہیں۔حقیقی مسلم صوفیوں نے کبھی بھی ترک دنیا کا وعظ نہیں دیا کیوں کہ اسلام میں رہبا نیت نہیں ہے۔صوفی وہ ہوتا ہے جس کا قلب صفا(صفائی)سے لبریز اور کدر (گندگی) سے خالی ہو۔صوفیا اپنے اپنے طور پر ضرورت اورحالات کے لحاظ سے تربیت اخلاق اور تزکیۂ روح کے مناسب نفسیاتی طریقے مقرر کرتے رہتے ۔عبادت وریاضت اور ورد و ظائف کی تعلیم اسی غرض سے دیا کرتے۔انہوں نے تربیت روح کے لیے مختلف منازل اور مقامات متعین کیے جیسے عالم حیرت' عالم جذب ' عالم فنا'عالم بقا'فنافی الشیخ ' فنافی الرسول' فنافی اللہ' باقی باللہ۔

صوفیائے کرام کی خانقاہیں مختلف مذاہب اور مختلف زبان بولنے والوں کی آماجگاہ بن گئیں۔اس طرح مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا آپسی لین دین ہوا۔ان کی خانقاہیں بنی نوع انسان کی ہم آہنگی کا ذریعہ بنیں۔لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ذات پات اور رنگ و نسل سے ہٹ کر صوفیانے بنی نوع انسان کے لیے عزت و وقار چاہا۔عوام سے ہمدردی اور خدمت خلق کی وجہ سے حضرات صوفیا کا سماج میں ایک اہم مقام تھا۔صوفیا عوام میں اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔انہو ں نے سلاطین کو اللہ کی مخلوق کی بلا تفریق مذہب و ملت' حاجت براری اور عدل پروری پر زیادہ سے زیادہ زور دیا۔اچھا سماج اور اچھی معاشرت صلحاو صوفیاکی کوششوں سے بنتی رہی۔لوگ پروانہ وار ان کے گر دجمع ہوتے اور وہ

لوگوں کے اخلاق وسیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونوں سے سنوارنے کی کوشش کرتے۔

صوفیائے کرام ہندوستانی سماج میں یکجہتی ، میل جول ، اور خیر سگالی چاہتے تھے۔وہ لوگ جھگڑے ، عناد، تعصب، نفرت اور حسد سے پاک صاف ایک صحت مند سماج کے قیام کی کوشش کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔تمام صوفیائے کرام کا طرزِ فکر یہی تھا کہ سب انسان بنیادی طور سے ایک ہیں۔انہوں نے تمام لوگوں کے لیے خوشگوار سماجی ماحول پیدا کیا۔صوفیا چاہتے تھے کہ عوام میں اخلاقی قدریں بڑھیں اور سماجی وا خلاقی اعتبار سے ایسا صحت مند ماحول پیدا ہو جو کہ بنی نوع انسا ن کی خوشی و مسرت کا سبب بنے۔

3.3 اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اردو زبان و ادب کی تخلیق و نشو و نما صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔اردو زبان کی تر ویج و اشاعت میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔انھیں اپنی بات پہنچانا تھا۔وہ ایسی زبان میں اپنی تعلیمات پیش کرنا چاہتے تھے جسے عوام سمجھ سکیں۔انہو ں نے اپنی تعلیمات کو نظم ونثر میں پیش کیا۔صوفیائے کرام کے فقرے اردو کے نقوش اولین اور ابتدائی نمونے ہیں۔یہ فقرے اردو زبان کے ارتقامیں معاون ثابت ہوئے۔صوفیائے کرام عوام سے ان کے اپنے روزمرہ میں گفتگو کرتے تھے۔وہ مقامی بولیو ں کو استعمال کرتے۔ہندوستانی مقامی زبانوں اور بولیوں کو بادشاہوں کے دربار میں اتنی سر پرستی اور حوصلہ افزائی نہیں ملی جتنی بزرگوں کی خانقاہوں سے حاصل ہوئی۔امرا اور بادشاہوں کو عوام سے میل جو ل کی وہ ضرورت نہیں تھی جو ان بزرگو ں کو تھی اورادنیٰ ترین سطح کے عوام سے سیدھے اور حقیقی رابطے کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ زبان کا وہ عوامی کینڈ ا تیار ہو گیا جس پر آئندہ زمانے میں اردو زبان اور روزمرہ کی عمارت استوار ہوئی۔صوفی شعرا کو سادہ اور عام فہم زبان میں اپنی بات عوام تک پیش کرنا مقصود تھا۔چنانچہ ان کی شاعری میں الفاظ کو ضرورت شعری کے مطابق موڑ تو ڑ لیا جاتا تھا۔کہیں کسی حرف کو گرا کر پڑھنے سے وزن کا سرامل جاتا اور کہیں سکتے کو دور کرنے کے لیے آواز کو کھینچ کر پڑھنا پڑتا ہے۔جیسے سر کو سیر اور فکر کو فکیر کہہ کر کام نکال لیتے۔قافیوں کے بھی کوئی خاص اصول کی پابندی ان کے ہاں اکثر مفقوذ ہے۔قافیے میں صرف آواز کا خیال رکھتے۔لفظ جیسا بولا جاتا ویسا ہی تحریر میں لے آتے جیسے شروع کو شر و اور صحیح کو سہی لکھ دیتے۔

دکن کے صوفیائے کرام نے تصوف کے رموز کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کے لیے گیت کے انداز میں سہیلے کہے تھے۔ان میں عارفانہ مطالب کو بڑی آسانی کے ساتھ سلیس زبان میں پیش کیا گیا تھا۔اس عہد میں عروضی اصولوں کی بھی سختی سے پابندی ممکن نہ تھی۔اس لیے ردیف و قوافی میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کی مثالیں بھی مو جود ہیں۔اکثر ردیفوں میں"س" اور " ص"،' ط" اور "ت" ،"ع"اور "ا"،"ک" اور "ق"کو ایک ہی صوتیے Phoneme کے طور پر برتا گیا ہے۔ضرورت شعری کے لحاظ سے ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن بنادیا گیا ہے اور اسی طرح سادہ الفاظ کو مشدد اور مشدد کو سادہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ادب کے اس ابتدائی دور میں نثر اور شعر کے اعلیٰ ترین نمونوں کی توقع کیسے کی

جا سکتی ہے۔یہ ادبی زبان کا عہد طفولیت تھا اس لیے اس میں منجھی ہوئی زبان اور نکھرے ہوئے اسلوب کی مثالیں نہیں ملتیں۔رچاؤاور پختگی تشکیلی دورِ آغاز سے نہیں' زبان وادب کے عہد بلوغیت سے تعلق رکھتے ہیں۔اردو ہی نہیں ہر زبان میں ادبیت کا چٹخارہ اور صوری محاسن' تشکیلی دور کی نہیں' دور ترقی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف و شاعر کے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے لیکن زبان یاوری نہیں کررہی ہے اور اظہار کے راستے مسدود ہیں۔جملوں میں الفاظ کی وہ ترتیب ہیں جو قواعد کی روسے ہونی چاہیے۔صوفیا کامقصد تواپنی بات اور اپنا پیغام عوام و خواص سب تک پہنچانا تھا۔فارسی اور دکنی نثر کا امتزاج اس زمانے کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔کہیں پورا جملہ فارسی میں ہے تو کہیں دکنی کے ساتھ ابتدا یا آخر میں فارسی الفاظ سے خیال کی ترسیل میں مدد لی گئی۔

بہمنی دور میں اردو چاروں طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی اور واحد مشترک زبان بن جاتی ہے اور اس عظیم سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک ایسا سازگار ماحول پیدا ہوجاتا ہے کہ آئندہ دور میں ادبی تخلیق کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔سوال اور جواب کی ہیئت میں نظمیں صوفیائے کرام کے ہاں ایک عام اور مقبول ہیئت رہی ہے۔سوال و جواب میں شریعت وطریقت کے بہت سے مسائل آگئے ہیں۔

صوفیائے کرام نے اس زبان کو تصوف کی تعلیم کے لیے استعمال کیا۔نثری رسالے لکھے گئے۔قوالی' موسیقی ' شاعری اور درس اخلاق کی یہی زبان ٹھیری۔صوفیانے اسے ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار اداکیا۔اس دور میں جب کہ اردو ابھی نومولود زبان تھی اور اہل علم اس میں لکھنا باعث عار سمجھتے تھے' صوفیائے کرام نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم ' تربیت اور تلقین کے لیے اسی زبان میں شعری اور نثری تخلیقات پیش کیں۔ان تخلیقات میں معرفت و سلوک' مذہب' علم و حکمت جیسے موضوعات شامل تھے۔اپنے پیغام کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا۔چنانچہ اردو زبان میں شاعری کے قدیم نمونوں میں تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔صوفیانہ ادب نے زبان کی نشو و نما اور ترویج میں زبردست رول ادا کیا۔صوفیا ملک کے مختلف حصوں میں جاتے اور وہیں کے ہورہتے۔انھیں مقامی لوگوں سے بات چیت کرنی پڑتی ' اپنا پیغام پیش کرنا ہوتا۔انہوں نے بول چال اور اپنی تخلیقات کے لیے عوام کی زبان یعنی اردو زبان کو استعمال کیا۔یہ مختلف زبانوں اور بولیوں کے علاقوں کے درمیان رابطے کی زبان بنتی جارہی تھی۔یہ جہاں بھی جاتی وہاں کے مقامی اثرات قبول کرتی اور اپنے الفاظ کے ذخیرے کو مقامی بولیوں سے اکتساب کر کے مالامال کرتی جاتی۔قومی یکجہتی کو استوار کرنے میں یہ ایک بڑا قدم تھا۔صوفیائے کرام ہندی ' فارسی' عربی اور ہندوستان کی دوسری مقامی بولیوں سے الفاظ لینے میں قطعاً نہیں جھجھکتے تھے۔حمد ونعت میں بھی عربی کے خاص الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے مذہبی الفاظ بے ساختہ برتے جاتے۔وہ اپنی شاعری میں ہندودیومالا کی تلمیحات اور استعارے بھی استعمال کرتے۔صوفی ادیبوں نے زبان کو کئی اصطلاحیں اور علامتیں بھی دیں مثلاً وہ بت کدہ' بت خانہ' شراب خانہ' خرابات کہتے تو اس سے عارف کامل کا باطن مراد لیتے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردوزبان و ادب کی ابتدائی نشو و نمامیں صوفیائے کرام نے بنیادی کا م انجام دیا اور بجاطور پر مولوی عبدالحق نے انھیں اردو کا محسن قرار دیاہے۔

3.4 تیرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.4.1 حضرت معین الدین چشتیؒ سنجری اجمیری:

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے صوفیانے عوام سے اپنا رشتہ زیادہ گہرا کیا۔چشتی خانقاہیں شہروں سے نکل کر دیہات اور قصبات میں پھیل گئیں۔اس طرح چشتی صوفیا کو ہر سطح کے عوام کی زبان ، کلچر ، بولی سے قریب آنے کا موقع ملا۔خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی سے منسوب کوئی ہندوی کا فقرہ نہیں ملتا۔خواجہ اجمیری کے دوسرے خلیفہ حضرت حمیدالدین ناگوری کے ملفوظات میں متعدد ہندوی الفاظ اور فقرے ملتے ہیں۔

حضرت گیسو دراز سے پہلے چشتی صوفیانے کتابیں تو زیادہ تصنیف نہیں کیں لیکن انہوں نے مقامی زبانوں کی اہمیت اور اثر و نفوذ کو خوب سمجھ لیا تھا اور عوام کو ان ہی کے محاورے میں تصوف کے رموز و حقائق کی تعلیم دیتے تھے۔چشتی صوفیا نے اپنے خلفا کو دوردوراز علاقوں میں بھیج کر رشدو ہدایت کا فیضان عام کر دیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری کے والد کا نام خواجہ غیاث الدین اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی ام الورع الموسوم بی بی ماہ نوروبی بی خاص الملکہ ہے۔آپ اصفہان میں پیدا ہوے اور پرورش اصفہان کے محلہ سنجر میں ہوئی۔آپ کے والدین پیار میں آپ کو حسن کہہ کر پکارتے تھے۔بچپن میں بھی آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کو د میں شریک نہیں ہوتے تھے۔نوسال کی عمر میں آپ نے قران شریف حفظ کیا۔بعد ازاں مکتب میں آپ نے تفسیر ، حدیث، فقہ کی تعلیم پائی۔ ابھی آپ کی عمر 15سال بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔والد کے ترکہ میں خواجہ غریب نواز کے حصہ میں ایک باغ اور ایک پن چکی آئی۔اسی کی آمدنی سے خواجہ غریب نواز اپنی گزر فرماتے تھے۔خواجہ غریب نواز کو شروع ہی سے فقیروں ، صوفیوں اور درویشوں کی صحبت کا بہت شوق تھا۔آپ اولیا ء اللہ کی صحبت سے بہت مسرور ہوتے تھے۔آپ ان کی بہت عزت و تعظیم کرتے۔اس زمانے میں سمر قند اور بخارا اسلامی علو م وفنون کے مر کز تھے۔آپ وہاں 1150 ء تا1155 ء علوم ظاہری کی تکمیل میں مشغول رہے۔بغداد سے آپ 1156 ء میں سفر حرمین شریف پر روانہ ہوئے۔پھر آپ ہارون پہنچے اور وہاں آپ نے خواجہ عثمانؒ سے بیعت کی اور ڈھائی سال ان کی خدمت میں رہے۔خواجہ غریب نواز کی پہلی شادی بی بی اَمتہ اللہ سے ہوئی۔آپ کے بطن سے خواجہ فخرالدین ، خواجہ حسام الدین اور بی بی حافظ جمال پیدا ہوئیں۔دوسری شادی بی بی عصمت اللہ سے ہوئی۔آپ کے بطن سے شیخ ابو سعید پیدا ہوئے۔

حضرت خواجہ غریب نواز ریاضت، مجاہدہ، عبادت میں وقت گزارتے۔آپ تحمل و بردباری سے کام لیتے۔غریبوں اور محتاجو ں کی مدد فرماتے۔ مظلوموں کو ظالم کے پھندے سے نکالتے ۔زیر دستوں کو زبردستوں کے چنگل سے رہا ئی

دلاتے۔فارسی میں آپ کی تصانیف انیس الارواح ، کشف الاسرار، گنج الاسرار ہیں۔آپ پر تھوی راج کے دور حکومت میں ہندوستان تشرف لائے اور اجمیر شریف کو اپنا مسکن بنایا۔حضرت خواجہ غریب نواز نے بتایا کہ نمازدین کا رکن ہے اور رکن ستون ہوتا ہے۔آپ نے یہ بھی بتایا کہ اول راہ شریعت، دوم راہ طریقت ، سوم راہ معرفت اور چہارم راہ حقیقت ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے اکابر خلفا میں خواجہ بختیار کاکی کی روحانی راجدھانی دہلی تھی اور حضرت حمیدالدین ناگوری نے (راجستھان) میں قیام کیا۔دیگر خلفا مثلاً شیخ وجیہ الدین ، خواجہ برہان الدین، شیخ صدرالدین نے مختلف مقامات پر جاکر عوامی اخلاق و سیرت کو سنوارا۔حضرت نصیرالدین نے دہلی میں رہ کر روحانیت کا چراغ روشن کیا۔جس کی روشنی اودھ، ہریانہ اور پنجاب تک پہنچی۔شیخ حسام الدین نے گجرات و سندھ میںاور خواجہ اخی سراج الدین نے بنگال بہار اور آسام میں روحانیت کا درس دیا۔حضرت نظام الدین نے اپنے دو مریدین خواجہ عزیزالدین اور شیخ زادہ کمال الدین کو دیوگیری اور مالوہ جانے کا حکم دیا۔برہان الدین غریب کودکن اور مہاراشٹرا کے لیے منتخب کیا گیا۔حضرت خواجہ غریب نواز موت کو عزیز رکھتے تھے۔6 رجب 627 ھ مطابق 21 مئی 1229 ء دو شنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔

3.4.2 شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر :

شیخ فریدالدین شکر گنج پنجاب میں ملتان کے قصبے کو ٹھوال یا کتھی وال میں پیدا ہوئے۔دہلی جا کر خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کے مرید ہوئے۔وہاں سے آکر پنجاب کے قصبے اجودھن میں بس گئے۔بعد میں اس قصبے کا نام پاک پٹن ہو گیا۔وہیں 664 ہجری مطابق 1265 ء میں انتقال کیا۔ان کے اشعار واقوال مشہور ہیں۔ان کی زبان سے اردو کا ایک جملہ ”آنکھ آئی ہے“ استعمال ہوا ہے۔ان سے منسوب دو اشعار یہ ہیں:

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز درآں وقت کے برکات ہے
عشق کا رموز نیارا ہے
جز مدد پیر کے نہ چارا ہے

3.4.3 شیخ حمیدالدین ناگوری :

شیخ حمیدالدین ناگوری، حضرت شیخ معین الدین چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔آپ نے ناگور (اجمیر کے قریب) میں قیام کیا اور وہاں کی سرزمین کو اپنے روحانی جلوئوں سے معمور کیا۔آپ نے ساری زندگی تصوف کی ترویج کے لیے وقف کی۔اس سلسلہ میں آپ نے مشہور صوفی بزرگ حضرت بہاء الدین ذکریا جو سلسلۂ سہر وردیہ کے بانیوں میں سے تھے اور ملتان میں قیام فرماتے تھے، خطوط کے ذریعے دہلی میں ملنے کا طے کیا اور دونوں حضرات دہلی میں ایک دوسرے سے ملے۔

شیخ حمیدالدین ناگوری نے حضرت بہاء الدین ذکریا سے مباحثہ کیا اور یہ ثابت کردیا کہ صوفی اور درویش کو دولت

سے لگائو نہیں ہونا چاہیے۔شیخ ذکریا بہت دولت مند تھے لیکن شیخ حمیدالدین ناگوری نے دولت کو سانپ کی مانند بتایا۔حضرت دولت سے نفرت کرتے تھے۔سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور علم دوست تھے۔آپ کا قول تھا کہ شریعت اور طریقت کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا جسم اور روح کا۔شیخ حمیدالدین ناگوری کی زندگی فقروافلاس میں گزری۔شیخ بہاء الدین با جن نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ حمیدالدین کے بیٹے فاقوں کی تاب نہ لا کران کے پاس گئے کہ کشائش رزق کے واسطے دعا کریں۔فاقوں کی نقاہت سے غش کھا کر گر پڑے۔شیخ حمید الدین آنکھیں بند کیے یادِحق میں مشغول تھے۔ان کے گرنے کی آواز سن کر انھیں دیکھا۔ان کا مافی الضمیر سمجھ گئے اور کہا" ہاں با با کچھ کچھ " (یعنی مستقبل میں کچھ کچھ ملتا دکھائی دیتا ہے۔)

3.5 چودھویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.5.1 امیر خسرو:

امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیاکے مرید تھے۔خسرو کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔یہ مقام آگرہ کمشنری میں ہے۔بعد میں خسرو کی عمر کا زیادہ حصہ دلی میں گزرا۔خسرواس وقت کی ہندی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے بلکہ جملے تک ملتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے فارسی نظم و نثر میں متعدد اردو الفاظ استعمال کیے۔امیر خسرونے گیارہ بادشاہوں کا زمانے دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت میں رہے۔وہ فارسی کے باکمال شاعر تھے۔موسیقی کے ایسے استاد تھے کہ ان کی ایجادات واختراعات آج تک علم مو سیقی کا بیش بہا سر مایہ ہیں۔

خسرو کے فارسی کلام میں کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے آگئے ہیں حالاں کہ خسرو اردو اور فارسی کوملانا مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔خزائن الفتوح میں وہ ہندی فقرہ استعمال کرتے ہیں۔

" واز دروں ہند واں مار مار فریادی کردند"

3.5.2 شیخ عین الدین گنج العلم:

شیخ عین الدین گنج العلمؒ، حکومت علاء الدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی میں پیدا ہوئے۔آغاز شباب میں تحصیل علم کے لیے گجرات کا سفر کیا۔گجرات میں قیام کے بعد وہ دو لت آباد گئے۔اس وقت محمد تغلق دولت آباد کو پایۂ تخت بنا چکے تھے۔وہاں شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے دہلی سے آئے ہوئے ایک بزرگ سید خوند میر علاء الدین چشتی سے بیعت کی۔ 737 میں وہ عین آباد سا گر گئے اور 773 ھ میں بیجا پور چلے گئے جہاں27 جمادی الاول 795 ھ (مطابق 1392 ء) کو انتقال کیا۔شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے دکنی میں چھوٹے چھوٹے 8 رسالے مسائل شرعیہ سے متعلق لکھے۔دکن میں اردو زبان کی یہ سب سے پہلی کتابیں ہیں لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔

3.5.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری:

بہارکا قصبہ منیر آپ کا وطن ہے۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار سے حضرت نظام الدین اولیا سے بیعت ہونے

کے ارادے سے روانہ ہوئے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل حضرت نظام الدین اولیا کا انتقال ہو چکا تھا۔اس لیے وہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہوگئے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے بہت سے منتر اور نسخے لکھے ہیں۔جن میں سے بعض کو کنج مندرہ کہا گیا ہے۔ان کے کنج مندرے ' دوہے' فالنامے اور ملفوظات مشہور ہیں۔شیخ نے ایک موقع پر کہا۔دیس بھلا پر دور۔ایک اور موقع پر کہا" باٹ بھلی پر سانہ کر"۔فالنامے کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔(1) جو من کا منسا سوئی ہووے۔(2) من جن ڈولائو' کرم لاگی ہے بات۔(3) ناہیں ابھی ناہیں۔(4) ناہیں ہے گا اور کام کروہ۔(5) ابھی ناہیں ستائو جن اکتائو۔(6) دور مت جاؤ کام ہو ستائو۔(7) اب لک دن برے گئے اب سکھ ہوئے۔(8) ابھی ناہیں ہوئے گا۔(9) تورے دن کے اب سکھ سو جتا نا ہیں۔

3.6 پندرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.6.1 خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز:

بندہ نواز گیسو دراز کی ولادت دہلی میں ہوئی۔آپ کا اسم گرامی سید محمد اور کنیت ابوالفتح تھی۔اور القاب صدرالدین اور صادق۔نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی بارگاہ سے جو خواجہ بندہ نواز کے شیخ تھے" گیسو دراز " لقب عطا ہوا تھا۔خواجہ بندہ نواز سادات حسینی سے تھے۔ان کے جد اعلیٰ ابوالحسن جنیدی ہرات سے دہلی چلے آئے تھے۔حضرت خواجہ بندہ نواز کے والد سید یوسف حسینی تھے جو شاہ راجو قتال کے نام سے مشہور تھے۔جب آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں سلطان محمد تغلق نے دیوگیری کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے دولت آباد کے نام سے آباد کیا تو دہلی کے علما' عمائدین اور مشائخین کو بھی وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔شاہ راجو اسی جماعت کے ہمراہ 17 محرم 719 ھ کو دولت آباد تشریف لے گئے۔اس وقت خواجہ بندہ نواز کی عمر چار سال تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ دکن پہنچے تھے۔دولت آباد کے قیام کے زمانے میں سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز نے اپنے والد اور ان کی وفات کے بعد نانا سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ابتدائی تعلیم خلد آباد میں ہوئی اور شیخ بابو نامی ایک بزرگ نے انہیں اپنے مکتب میں پڑھایا تھا اور حدیث و فقہ کے ابتدائی درس دیے تھے۔خواجہ بندہ نواز نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی اور روزے کے پابند ہو گئے تھے۔سات برس کی عمر میں قران مجید حفظ کر لیا اور سولہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر لی۔طلب صادق' ریاضت' فطری مناسبت اور نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی خاص توجہ کے باعث بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔شیخ چراغ دہلوی کی اجازت سے آپ علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔چراغ دہلوی نے انھیں خلافت سے سرفراز کیا۔بندہ نواز نے بندگان خدا کی رہنمائی و ہدایت میں چوالیس برس گزرادیے اور تشنگان علم و معرفت کی پیاس بجھائی۔وہ چاشت کے بعد یا نماز ظہر ادا کرنے کے بعد تفسیر' حدیث اور سلوک کے موضوع پر درس دیا کرتے تھے۔

سید محمد حسینی بندہ نواز کی عمر جب چالیس سال سے تجاوز کر گئی تو والدہ کے اصرار پر آپ نے بی بی رضا خاتون سے

نکاح کیا۔ان کے بطن سے دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔آپ کے فرزند سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی عالم بہتر اور برگزیدہ سالک تھے' دوسرے صاحبزادے سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی بھی عالم وفاضل اور اپنے والد کے خلیفہ تھے۔وصیت کے مطابق والد کے انتقال کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے۔

سید محمد حسینی اجمیر' ناگور' احمد آباد' کا ٹھیواڑ' گرناتھ پہاڑ' ٹھٹہ' حیدرآباد' سندھ ' بلوچستان' افغانستان' لاہور' پاک پٹن' ملتان ' کشمیر' ہر دوار اور لکھنو سے ہوتے ہوئے بالآخر دولت آباد پہنچے تھے۔اس وقت ان کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ سید محمد حسینی نے دولت آباد پہنچ کر اپنے والد شاہ راجو قتالؒ کے مزار کی زیارت کی۔جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے کئی مریدوں کے ساتھ ایک خانقاہ میں فروکش ہوئے اور رشد و ہدایت تعلیم و تلقین میں مصروف رہے۔وہ ایک عالم متبحر ہی نہیں ' ایک خدا رسیدہ بزرگ اور صاحب کشف و کرامات صوفی تھے۔وہ اپنے مخاطب کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق اس کو مناسب ہدایت دیا کرتے تھے ۔وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بندگان خدا کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے۔سرکاری عہد یدار' بادشاہ اور امرا وغیرہ اگر ان کی خدمت میںحاضر ہوتے تو انہیں عدل وانصاف کی ہدایت فرماتے اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر زور دیتے تھے۔بندہ نواز گیسو درازؒ سماع کو پسند کرتے۔وہ کلام اللہ کی بہت تلاوت کر تے۔انہو ں نے سہیلا میں بھی طبع آزمائی کی جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے۔بندہ نواز اس تصور کے حامل تھے کہ سماع سے گداز قلب ' رقت اور سپرد گی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ان کے چکی نامے اور غزل بھی متعارف کیے گئے ہیں۔خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

3.6.2 میراں جی شمس العشاقؒ :

حضرت میراں جی شمس العشاقؒ کا نام امیرالدین ٫عرفیت میرا جی اور لقب شمس العشاق ہے۔آپ کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا۔میراں جی مکہ شریف میں پیدا ہوئے ' بائیس سال کی عمر میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ گئے اور وہاں بارہ سال تین ماہ اور پانچ روز قیام کیا۔پھر ہندوستان آئے اور دکن کا رخ کیا۔حضرت شاہ کمال الدین بیابانی کے دست پر بیعت کی اور منازل سلوک طے کرنے کے بعد حضرت شاہ کمال الدین بیابانی نے آپ کو خلافت سے سر فراز کیا۔دو واسطوں سے آپ کا سلسلۂ خلافت حضرت گیسو درازؒ سے ملتا ہے۔اپنے پیرومرشد کے حکم سے بھنگار (احمد نگر) جاکر شادی کی۔آپ کے فرزند برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین علی اعلیٰ تھے۔

میراں جی شمس العشاقؒ اپنے پیرومرشد کے کہنے کے مطابق بیجا پور چلے گئے اور تاحیات مخلوق خداکو اپنے علم و فضل سے بہرہ ور کرتے رہے۔آپ کا مزار بیجا پور ہی میں ہے۔میراں جی ولی کامل اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔آپ نے ساری زندگی عبادت' ریاضت' رشدوہدایت' درس و تدریس میں گزاردی۔آپ عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے۔

میراں جی شمس العشاقؒ سے کسی اردو نثری رسالے کا انتساب ثابت نہیں ہوتا۔ان سے منسوب جتنے بھی نثری رسالے ہیں' ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کی تصنیف ہے۔ان کی تصانیف میں چھ مثنویاں شامل ہیں:(1) شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت (2)خوش نامہ (3) خوش نغز(4) شہادت نامہ (5) مغز مرغوب (6) وصیت النور۔

مثنوی وصیت النور کو ڈاکٹر صبیحہ نسرین نے نیشنل میوزیم کراچی پاکستان میں موجود ایک ضخیم بیاض سے یکم اکتوبر 1987ء کو دریافت کیا اور 1988ء میں " وصیت النور" کے نام سے شائع کیا۔خوش نامہ میں ایک نوجوان اور نیک طینت لڑکی خوش یا خوشنودی کا ذکر کیا گیاہے۔وہ عشق الٰہی سے سرشارہے۔وہ میراں جی کی مرید تھی۔خوش نامہ کا وہ حصہ جہاں خوشی کے وقت آخراور اس کے انتقال کا حال نظم کیا گیا ہے 'بہت زیادہ پر اثر ہے۔یہاں میراں جی کا لب ولہجہ ' جذباتی ہو گیا ہے۔اور ان کا طرز ادا سوز و گداز میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔میراں جی کی یہ نظم بہت سادہ ہے۔مثنوی شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت میں اخلاق و تصوف کے رموز وحقائق کا تذکرہ ہے۔اس مثنوی کی بحر چھوٹی لیکن رواں ہے۔

یہ سب عالم تیرا رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوئے نہ خالق دوجا ہوئے
نا دیکھت بورا لیکھو لے مغز چاک دیکھو
جے مغز میٹھا لاگے توکیوں من اس تھے بھاگے
وہ مغز معنی لیو سب چھال جھاڑ دیو

شہادت الحقیقت مکالمے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔اس میں سوال و جواب کے طرز میں تصوف کی عام باتیں بیان کی گئی ہیں۔مثنوی خوش نغزمیں بھی میراں جی نے متصوفانہ خیالات پیش کیے ہیں۔اس میں بھی خوشی یا خوشنودی کا کردار ابھرتا ہے۔وہ اپنے پیر طریقت میراں جی سے مختلف سوالات کرتی جاتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے جاتے ہیں۔

3.7 سولھویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.7.1 شیخ بہاء الدین باجن:

شیخ بہاء الدین باجن کے والد حاجی معزالدین دہلی سے آکر احمد آباد میں بس گئے جہاں 790ھ میں بہاء الدین کی ولادت ہوئی۔ابھی باجن چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔باجن حضرت شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔شیخ رحمت اللہ حضرت نظام الدین اولیا کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔باجن حج کے لیے جانے کے بعد ان کے مرشد کا انتقال ہو گیا۔شیخ رحمت اللہ ہدایت کر گئے کہ باجن کی واپسی کے بعد انھیں خرقۂ ولایت اور تبرکات دے دیے جائیں۔سیاحت کرتے کرتے باجن برہان پور پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ان کی عمر کے آخری چالیس یا اس سے زیادہ سال

برہان پور میں گزرے۔912 ھ میں انتقال کیا اوربرہان پورمیں مدفون ہوئے۔ان کے خلیفہ شیخ علی متقی ہیں۔ان کی دو تصانیف ملتی ہیں'(1) جنگ نامہ پشوازو ساری: اردو کا یہ جنگ نامہ 219 شعروں کی مثنوی ہے۔(2) خزائن رحمت اللہ (فارسی): یہ کتاب فارسی نثر میں ہے لیکن باجن نے جا بجا اپنا اردو کلام بھی دیا ہے۔نوسو صفحات کی اس کتاب میں اہل طریقت کے افعال و حالات بیان کیے گئے ہیں۔باجن نے اپنے پورے کلام کو جکری قرار دیا ہے۔سلسلہ چشتیہ میں غنا اور سماع بہت مقبول رہا ہے۔جکری کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔جکری (ذکری کی بگڑی شکل) میں بنیادی طور پر ذکر خدا' ذکر رسول ' ذکر پیر و مرشد' ذکر تجربات باطنی و واردات روحانی کو عام فہم انداز میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جا سکے اور سازوں پر بجایا بھی جاسکے۔جکری کی حیثیت مختصر گیت یا راگ راگینوں کے ان بولوں کی تھی جنھیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالم وجد و سر ور پیدا کیا جا سکے۔اس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہو سکے۔

3.7.2 شاہ علی محمد جیو گام دھنی:

آپ کی پیدائش احمد آباد میں ہوئی۔گاؤں دھنی آپ کا لقب تھا۔یعنی گاؤں کا مالک۔اسی کو قدیم تلفظ سے گام دھنی کہا گیا۔آپ کی پیدائش 895 یا 896 ھ اور وفات 14 جمادی الاول 973 ھ مطابق 1565 ء کو ہوئی۔آپ کا مزار احمد آباد میں اندرون حصار دروازہ رائے کھڑمیں ہے۔آپ کے دیوان کا نام "جواہر اسراراللہ " ہے۔شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام وحدت الوجود (ہمہ اوست) کا ترجمان ہے۔سارا کلا م و اردات قلبی ' عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔شعر کا ترنم اور عشق کا والہانہ پن ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

3.7.3 برہان الدین جانمؒ:

برہان الدین جانمؒ حضرت میرا ں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اکبر اور خلیفہ تھے۔میراں جی شمس العشاقؒ کے مر شد کمال الدین بیابانی نے پیشن گوئی کی تھی کہ انھیں ایک خدا پر ست لڑکا تو لد ہوگا جو قطب الا قطاب زمانہ ہو گا۔بعد ازاں میراں جی شمس العشاقؒ کے ہا ں لڑکا تو لد ہوا جس کانام برہان الدین جانم رکھا گیا۔برہان الدین جانم نے بڑے ہو کر علم ظاہری میں کمال حاصل کیا۔اس کے بعد علم باطنی کے حصول کا شوق ہوا۔انہوں نے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے ہاتھ پر بیعت کی۔اپنے والد سے تعلیم و تر بیت پا کر جانم ایک جید عالم اور صوفی بن گئے۔حصول علم ودانش کے مقصد سے جانم نے ماں باپ کے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر روانہ ہوگئے۔یہ مدت سفر تین سال تھی۔جانم کا مزار بیجاپور میں ہے۔ان کی رفیقۂ حیات بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی کا مزار بھی پاس میں موجود ہے۔

جانم اپنے والد کی طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔وہ اردو زبان میں تلقین کیا کرتے اور معرفت و سلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے معتقدین اور مریدوں کے ذہن نشین کروانا چاہتے تھے۔برہان

الدین جانم چشتیہ سلسلے کے بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے خواص و عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔جانم کثیر التصانیف صوفی تھے۔ان کی شعری و نثری تخلیقات حسب ذیل ہیں:

شعری تصانیف:

1۔ارشاد نامہ 2۔وصیت الہادی 3۔سکھ سہیلا 4۔منفعت الایمان 5۔ نسیم الکلام

6۔محبت البقا 7۔نکتہ واحد 8۔ بشارت الذکر 9۔رموزالواصلے 10۔توحید حقیقت

11۔عبرت آدم12۔"کفر نامہ" اور " مسافرت خاں میاں وبیان خلاصہ(یہ دو مثنویاں ہیں۔)

13۔ جانم نے اپنے والد کی وفات پر ایک پر درد مرثیہ لکھا جو طویل بھی ہے۔

نثری تصانیف: 1۔ معرفت القلوب 2۔ کلمتہ الحقائق 3۔ مجموعہ الا شیا

3.8 سترہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

3.8.1 خوب محمد چشتی:

خوب محمد چشتی کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ان کا مزار چوک احمد آباد میں خان دروازے اور فرحت الملک کی مسجد کے پاس ہے۔وہ شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ان کی مثنوی خوب ترنگ 986 ھ میں لکھی گئی۔مرشد سے دن رات کچھ باتیں سن کر خوب محمد کو ترنگ آئی اس لیے مثنوی کا نام خوب ترنگ رکھا۔

مثنوی خوب ترنگ کا موضوع معرفت واخلاق ہے۔انہوں نے مسائل تصوف نظم کیے ہیں۔بیشتر مسائل کو حکایتوں کے تمثیلی پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔خوب ترنگ میں اپنے سے بیشتر کے مصنفوں کی نسبت عربی فارسی الفاظ استعمال کرنے کا رجحان زیادہ ہے لیکن بعض اوقات یہ عربی فارسی الفاظ کو دکنی طریقے سے مسخ کر لیتے ہیں جیسے مصرے(مصرع) درس (درست)' دریے(دریا۔ندی)' کا گل(کا غذ) وغیرہ۔خوب محمد چشتی کی دوسری تصنیف" بھاؤ بھید" ہے۔یہ رسالہ صنائع بدائع کے بارے میں ہے۔ہر صنعت کی تشریح فارسی میں کی ہے لیکن اس کا مفہوم گجراتی اردو میں بھی ادا کیا ہے۔مثالیں گجراتی اردو میں ہیں۔ظاہر ہے کہ صنائع کی تفہیم کے لیے وضاحت اور تفصیل درکار تھی۔خوب محمد چشتی کی تیسری تصنیف " چھند چھنداں" ہے۔یہ منظوم رسالہ ہندوی و فارسی عروض سے متعلق ہے۔

3.8.2 میراں جی خدا نما:

میراں جی خدانما' حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے سلسلۂ فیض کے شاعر وادیب ہیں۔آپ سید تھے۔اپنے کلام میں انہوں نے میراں اور سید میراں تخلص استعمال کیا ہے۔آپ کے والد کا نام شاہ قاسم محمود تھا۔حضرات میراں جی خدا نما نے اپنے آپ کو رشد و ہدایت کے لیے وقف کردیا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی اختیار

کرلی۔چوں کہ آپ بندگان خداکو حق پرستی اور معرفت خداوندی کا درس دیا کرتے‘ اس لیے انھیں ” خدانما“ کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

سلسلۂ بندہ نوازؒ کے مشائخین کی طرح میراں جی خدانما بھی تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور اپنی نگارشات سے خلق اللہ کی دینی اور علمی خدمت انجام دی۔انہو ں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔رسالہ وجو دیہ (موضوع: تصوف کے مسائل)‘ شرح تمہیدات عین القضات اور شرح مرغوب القلوب اردو نثر میں ہیں۔میراں جی خدا نما نے بشارت الانوار کے علاوہ دو مثنویاں اور غزلیں بھی کہی تھیں۔شرح تمہیدات عین القضات ‘قاضی عین القضات ہمدانی کی تصنیف ہے۔تصوف سے متعلق اس فارسی تصنیف کی شرح حضرت خواجہ بندہ نواز نے فارسی ہی میں لکھی تھی۔میراں جی خدا نمانے اسی کو دکنی نثر میں منتقل کیا۔رسالہ و جود یہ میراں جی خدا نما کی نثری یادگار ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔” مرغوب القلوب “ فارسی نظم ہے جو شمس تبریز سے منسوب کی جاتی ہے۔میراں جی خدا نمانے دکنی نثر میں اس کی شرح لکھی ہے جس کانام ” شرح مرغوب القلوب “ ہے۔

میراں جی خدا نما کے رسالے‘ اردو کی ارتقائی منزل اور اس کے تشکیلی دور کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔خدا نما کی نثر میں قواعد کا یہ رجحان نظر آتا ہے کہ اکثر جملوں میں فعل ‘ فاعل اور مفعول اپنے مناسب مقام پر دکھائی دیتے ہیں لیکن عبارتوں میں ہر جگہ اس کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عبارتوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں اور درمیان میں خلا کا بہت کم احسا س ہوتا ہے۔اس سے بھی نثر کی ترقی اور نشو و نما میں میراں جی خدا نما کی تحریروں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

3.8.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ:

امین الدین علی اعلیٰ ؒ دکن کے مشہور صوفی برہان الدین جانم کے فرزنداور میراں جی شمس العشاقؒ کے پوتے تھے۔ان کی تعلیمات کا فیض جنوبی ہند میں سالہا سال تک جاری رہا۔اس سر چشمہ سے کئی سالکان طریقت کے ذوق عرفان وآگہی کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔انہوں نے امین اور امین الدین تخلص اختیار کیا تھا۔ان کی والدہ کا نام بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی تھا۔برہان الدین جانم کا انتقال امین الدین اعلیٰ کی ولادت سے قبل ہو چکا تھا۔اس لیے وہ اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم رہے اورعلم ظاہری کا اکتساب سید علی گنج گوہر ‘ محمود خوش دہاں سے کیا۔محمود خوش دہاں نے امین اعلیٰ کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ کی تھی اور انہیں چشتیہ کے علاوہ قادریہ سلسلے میں بھی بعیت عطا کی تھی۔امین الدین علی اعلیٰ کا مل اور ولیِ صادق تھے۔ان کی رفیقہ حیات کا نام خونزہ رانی (خونجا رانی) اور فرزند کا نام با با شاہ حسینی تھا۔امین الدین علی اعلیٰ کے معتقدین کی تعداد ایک لاکھ تھی۔امین الدین علی اعلیٰ کی شعری تخلیقات ملا حظہ ہوں:

1۔ جواہر الا سرار 2۔ رموز السالکین 3۔ رسالہ قربیہ 4۔ ناریزہ 5۔ وجودیہ

6۔ محب نامہ 7۔ مدح شاہ برہان الدین جانم 8۔ امین الدین علی اعلیٰ کی غزلیں بھی دستیاب ہیں۔

نثری تخلیقات: 1۔گنج مخفی 2۔وجودیہ 3۔رسالہ گفتار شاہ امین 4۔کلمتہ الاسرار 5۔عشق نامہ

3.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب ' تصفیۂ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن ہے۔غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارا جائے تا کہ سعادت ابدی حاصل ہو سکے۔تصوف میں شریعت کی پابندی شامل ہے۔شریعت اپنے اندر طریقت کو بھی سموے ہوئے ہے۔
- تصوف کو طریقت و معرفت بھی کہا جاتا ہے۔یہ علم باطن ہے،جو باطن کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی بنیاد قلب پر ہے۔تصوف کے لیے محبت ضروری ہے۔تصوف نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر ہر پیکر سے خلوص و محبت کی تعلیم دی۔صوفی لفظ صوف سے منسوب ہے۔لباس صوف (موٹا اون) پہننے والے کو صوفی کہا گیا۔
- ہندوستان میں تصوف کے ابتدائی نظریات کا پتہ گیارہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔پہلے صوفی سیف الدین ملتان کے راستے ہندوستان آئے۔تصوف کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ سلسلۂ چشتیہ کا ہے۔
- اردو زبان وادب کی تخلیق و نشو ونما صوفیا کی مرہون منت ہے۔اردو زبان کی ترویج واشاعت میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔ان کے تربیتی فقرے اردو کے نقوش اولین اور ابتدائی نمونے ہیں۔یہ فقرے اردو زبان کے ارتقا میں معاون ثابت ہوئے۔
- حضرت معین الدین چشتی نے اس زمانے کے اسلامی علوم و فنون کے مراکز سمر قند اور بخارا میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اجمیر میں غریبوں ،محتاجوں، مظلوموں کی مدد کرتے اور شریعت و طریقت ' معرفت اور حقیقت کی راہیں بھی بتائیں۔
- شیخ حمیدالدین ناگوری حضرت غریب نواز کے مرید اور خلیفہ تھے۔آپ نے ناگور کی سر زمین کو اپنے روحانی جلوئوں سے معمور کیا اور ساری زندگی تصوف کی تر ویج میں گزاردی۔آپ دولت سے نفرت کرتے تھے اس لیے انہوں نے اپنی زندگی کو فقروافلاس میں گزاردینا پسند فرمایا۔
- حضرت امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاکے مرید تھے۔آپ کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔آپ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں گزارا۔ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے ملتے ہیں۔وہ موسیقی کے استاد بھی تھے۔ان کی ایجاد ات علم مو سیقی کا بیش بہاسر مایہ ہے۔
- خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازدہلی میں پیدا ہوئے۔اپنے والد ین کے ساتھ چار سال کی عمر میں دکن پہنچے۔وہ

حافظ قران تھے۔انہوں نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی۔آپ کے پیر و مرشد نصیرالدین محمود چراغ دہلوی تھے جن کی خاص توجہ سے انہوں نے بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔

- شیخ بہاء الدین باجن شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔آپ کے دیوان کانام" جواہر اسراراللہ" ہے۔سارا کلام واردات قلبی' عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔
- برہان الدین جانم حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔جانم کا مزار بیجا پور میں ہے۔جانم کثیر التصا نیف صوفی تھے۔شعری تصانیف میں ارشاد نامہ ' منفعت الایمان ' نسیم الکلام ' حجت البقا' نکتۂ واحد' بشارت الذکر ' رموزالواصلین'کفر نامہ' مسافرت خاں میاں و بیان خلاصہ ' توحید حقیقت ' عبرت آدم اور ایک مرثیہ شامل ہے جو انہوں نے اپنے والد کی وفات پر لکھا تھا۔نثری تصانیف میں معرفت القلوب ' کلمتہ الحقائق ' مجموعہ الاشیا شامل ہیں۔
- خوب محمد چشتی کا وطن احمد آباد ہے۔وہ شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ان کی مثنوی خوب ترنگ 986 ھ میں لکھی گئی۔ دوسری تصنیف "بھائو بھید" ہے جو صنائع بدائع کے بارے میں ہے۔تیسری تصنیف " چھند چھنداں" (منظوم رسالہ) ہندوی و فارسی عروض سے متعلق ہے۔
- شاہ امین الدین علی اعلیٰ دکن کے مشہور صوفی برہان الدین جانم کے فرزند اور میراں جی شمس العشاق کے پوتے تھے۔ان کی تعلیمات کا فیض جنوبی ہند میں سالہا سال تک جاری رہا۔ان کی شعری تخلیقات میں جواہر الاسرار'مثنوی رموزالسالکین'رسالہ قربیہ ' مثنوی ناریزہ ' وجودیہ ' محب نامہ اور مدح شاہ برہان الدین جانم شامل ہیں۔نثری تخلیقات میں گنج مخفی ' و جودیہ' رسالہ گفتار شاہ امین ' کلمتہ الاسرار اور عشق نامہ شامل ہیں۔

3.10 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
غایت	:	مقصد	دوئی	:	دو
سالک	:	راہ سلوک (تصوف میں قدم رکھنے والا)	مظہر	:	اظہار
صوف	:	موٹا اون	خشیت الٰہی	:	اللہ کا خوف
صفا	:	صفائی	کدر	:	گندگی
شیوہ	:	طریقہ	درگزر	:	معاف کرنا
تزکیۂ نفس	:	دماغ کی صفائی	تصفیۂ قلب	:	قلب کی صفائی
بلا تخصیص	:	بغیر کسی امتیاز و تفریق	باطن	:	اندرون

پروانہ وار	:	جوق در جوق	گِرد	:	اطراف
ثمرہ	:	پھل ، نتیجہ	مفقود	:	نہ پایا جانا
آشنا کرنا	:	بتانا	امتزاج	:	دو چیزوں کا ملنا
ادبی تخلیق	:	ادبی فن پارہ ،کتاب	مسرور	:	خوش
تحمل	:	برداشت	یادحق	:	یاداللہ
قول	:	کہاوت ،کہاہوا	نقاہت	:	کمزوری
تاب نہ لانا	:	برداشت نہ کرنا	مستحسن	:	عمدہ ،اچھا

3.11 نمونہ امتحانی سوالات

3.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازؒ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) گلبرگہ (b)اورنگ آباد (c)حیدرآباد (d)دہلی

2۔ بندہ نواز گیسو درازؒ کا اصل نام کیا تھا؟

(a) سید محمد (b)ابوالفتح (c)گیسودراز (d)محمد حسینی

3۔ میراں جی شمس العشاق کا اصل نام کیا تھا؟

(a) میراں جی (b)امیرالدین (c)شمس العشاق (d)شریف الدین

4۔ ”شہادت التحقیق“ کس کی تصنیف ہے؟

(a) بندہ نواز گیسودراز (b)امیر خسرو (c)میراجی شمس العشاق (d)برہان الدین جانم

5۔ ” رموز السالکین “ کا تعلق کس صنف ادب سے ہے؟

(a) مثنوی (b)قصیدہ (c)مرثیہ (d)رباعی

6۔ خوب محمد چشتی کا اصل وطن کیا تھا؟

(a) گجرات (b)دکن (c)دہلی (d)سندھ

7۔ برہان الدین جانم اور میراں جی شمس العشاق میں کیا رشتہ تھا؟

(a) باپ اور بیٹا (b)نانااور نواسا (c)بیٹااور باپ (d) مامااور بھانجا

8۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کے داداکا نام کیا تھا؟

(a) میراجی شمس العشاق (b) برہان الدین جانم (c) خوب محمد چشتی (d) شیخ حمید الدین

9۔ میراں جی خدا نما کیا تخلص اختیار کرتے تھے؟

(a) شاہ (b) قاسم (c) میراں (d) خدا نما

10۔ کون سی تصنیف برہان الدین جانم کی نہیں ہے؟

(a) نسیم الکلام (b) محب نامہ (c) حجت البقا (d) کلمتہ الحقائق

3.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ تصوف کی تعریف ٗ تشریح اور صوفیا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ اردوادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ میراں جی خدانما پر نوٹ لکھیے۔

4۔ برہان الدین جانم کی صوفیانہ خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5۔

3.11.3 طویل جوابات کے حامل سولات:

1۔ حضرت معین الدین چشتی سنجری اجمیری کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

2۔ حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودرازؒ کے سوانحی حالات اور معمولات پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ میراں جی شمس العشاق کی سوانح اور ادبی کارناموں کو اجاگر کیجیے۔

3.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ	مولوی عبدالحق
2۔	تاریخ ادب اردو (پانچ جلدیں)	پروفیسر سیدہ جعفرو پروفیسر گیان چند جین
3۔	تاریخ ادب اردو (حصہ اول ودوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی

3.11.1کے جوابات: 1۔d 2۔a 3۔b 4۔c 5۔a

6۔a 7۔c 8۔a 9۔c 10۔b

بلاک II : شمالی ہند میں اردو

اکائی 4: شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 سماجی و تہذیبی پس منظر

4.2.1 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

4.2.2 دہلی کا سماجی و تہذیبی منظر نامہ

4.2.3 لکھنو کا سماجی و تہذیبی منظر نامہ

4.3 شمالی ہند میں اردو ادب کا پس منظر

4.3.1 دبستانِ دہلی

4.3.2 دبستانِ لکھنؤ

4.4 دہلی و لکھنؤ کی معاشرت کا ایک سرسری جائزہ

4.5 شعر و ادب پر ماحول کے اثرات

4.6 اکتسابی نتائج

4.7 کلیدی الفاظ

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

شمالی ہند میں اردو کے سماجی و تہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی، سماجی، لسانی اور تہذیبی عوامل کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا، جس میں اردو کا ڈول تیار ہوا اور اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کی۔ عہد وسطیٰ میں دہلی کی مرکزیت سے بہت سی چیزیں پروان چڑھیں، جس میں اردو بھی ایک ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں درباروں، خانقاہوں، بازاروں اور میلوں ٹھیلوں کا بھی اہم کردار ہے۔ عوام الناس اشیا کے لین دین کے لیے بازاروں میں جب یکجا ہوتے تھے تو سامان کے ساتھ زبان کا بھی تبادلہ کیا کرتے تھے۔ مقامی اور خارجی لوگوں کا یہ میل جول ایک زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنا اور اس میل جول سے جو زبان تیار ہوئی اس کا سلسلہ ریختہ 'اردوئے معلی' شاہجہانی اردو اور ہندوی سے ہوتے ہوئے اردو تک پہنچا جس کا شمار آج دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس اکائی میں انھیں باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ عہد وسطیٰ میں دہلی اور لکھنؤ میں اردو ادب کے فروغ کو سمجھا جا سکے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اردو کے سماجی و تہذیبی پس منظر پر اظہارِ خیال کر سکیں۔
- اردو کے فروغ میں خانقاہ و صوفیائے کرام کے کردار کی نشاندہی کر سکیں۔
- دہلی اور آس پاس کی سماجی و تہذیبی صورت حال پر اپنی ایک رائے قائم کر سکیں۔
- شمالی ہند میں اردو کے آغاز و ارتقا کا سماجی و تہذیبی حال بیان کر سکیں۔
- شمالی ہند میں کے شعر و ادب پر پڑنے والے ماحول کے اثرات کو سمجھ سکیں۔

4.2 سماجی و تہذیبی پس منظر

سماج ایک ایسے گروہ کو کہتے ہیں جو کسی ایک جغرافیائی حدود میں رہتا، کھیتی کرتا، خوشی، غم اور زندگی کے مختلف مراحل میں ایک جیسے عمل کرتا ہو اور سماج کے ذریعے بنایا گیا قانون ہر کسی پر یکساں لاگو ہوتا ہو۔ ساتھ ہی پورے سماج کا نفع اور نقصان بھی مشترک ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیدائش سے مرنے تک کی جو رسوم ہیں وہ ایک جیسی ہوں۔ زمانۂ قدیم میں پورے سماج میں ایک ہی جیسی رسمیں ہوا کرتی تھیں مگر آج دولت مند لوگوں نے اپنے لیے ممتاز طرح کی رسوم بنالی ہیں اور متوسط طبقہ و غریبوں کے لیے الگ طرح کی رسمیں برسہابرس سے چلی آرہی ہیں۔ کسی سماج کے زندگی گزارنے کے جو طور طریقے ہوتے ہیں، پیدائش سے وفات تک کی جو رسمیں ہوتی ہیں، ان تمام کے میل جول سے تہذیب بنتی ہے۔ آئندہ چند عناوین کے تحت ہم شمالی ہند بالخصوص دہلی اور لکھنؤ کی سماجی و تہذیبی پس منظر کا مطالعہ کریں گے۔

4.2.1 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر:

اردو ادب کے سماجی و تہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے عہد وسطیٰ میں زبانوں کی گروہ بندی کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا تاکہ زبانوں کی

خصوصیت کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے۔ جب زبانوں کے نام ان کے علاقوں کے نام سے منسوب کیے گئے تو اردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں تھا۔ جیسے کہ مراٹھی، گجراتی، شورسینی (متھرا) اردھ ماگدھی، ماگدھی اور بنگالی، وغیرہ کا تھا۔ انھیں میں شورسینی اپ بھرنش سے کھڑی بولی پروان چڑھی، جس سے دو زبانیں وجود میں آئیں، جن کا نام اردو اور ہندی ہے۔ اردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں تھا، اس کے باوجود آج پورے برِ صغیر میں اردو رابطے کی زبان ہے۔

عہد وسطیٰ میں دہلی لشکروں کی آماج گاہ تھی، جہاں فوجی مقامی لوگوں سے ضروری اشیا خریدتے تھے۔ بازار میں اسی دوران تاجر اور گاہک کے درمیان سامانوں کے ساتھ ساتھ زبانوں کا بھی تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ ان فوجیوں میں باہر سے آئے ہوئے فوجی عرب، ایرانی و افغانی ہوا کرتے تھے، انہیں کے میل جول سے ایک ملی جلی زبان پروان چڑھی۔

اسی طرح اس عہد میں خانقاہوں، درگاہوں اور صوفیا کے مساکین عوام الناس کے لیے ایک روحانی سکون کا مرکز تھے، جہاں ہر کوئی بلا تفریق مذہب و ملت جایا کرتا تھا۔ ان مقامات پر صوفیائے کرام عوام کی زبان میں خطاب کرنے کی کوشش کرتے تھے، جس میں ان کی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کے الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔ صوفیا کے یہ دربار عوام کی ایک بڑی آماجگاہ تھے، جہاں مخلوط زبان کو خاطر خواہ پذیرائی اور فروغ ملا۔ تاریخی اعتبار سے دہلی کی مرکزیت ہر اعتبار سے اہم تھی۔ بیرونی ممالک سے آنے والے حملہ آور لشکر کے ساتھ جب دہلی کو لوٹنے کی غرض سے آتے تھے تو سبھی واپس نہیں جاتے تھے بلکہ ان میں سے کچھ یہیں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ ایسے لوگ بھی ایک نئی زبان یا مخلوط زبان کے استعمال پر مجبور ہوتے تھے۔ ان باتوں کے شواہد بابر نامہ، تزک جہانگیری اور دیگر تاریخی کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے باعث دہلی پر بار بار ہو رہے حملوں سے پریشان ہو کر ادبا اور شعرا نزدیکی ریاست اودھ (فیض آباد، لکھنؤ) کا رخ کرنے لگے جو اس وقت ایک خوش حال ریاست ہوا کرتی تھی۔ دہلی پر بار بار ہو رہے حملوں سے دہلی حکومت کی حیثیت کاغذی رہ گئی تھی، جب کہ اس کے مقابلے اودھ میں خوش حالی اور ادبا و شعرا کی خاطر خواہ پذیرائی ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی سے کئی ایک شعرا لکھنؤ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ دہلی کے بار بار لٹنے اور ویران ہونے کے سبب دہلی میں ہونے والی شاعری پر اس کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں رومان پروری نظر آتی ہے۔

4.2.2 دہلی کا سماجی و تہذیبی منظر نامہ:

دہلی کے سماجی منظر نامے پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو مغل دربار، صوفیا کے مساکین، جمنا کے گھاٹ، اردو بازار وغیرہ کے عوامل پر غور کرنا ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دلی کی تہذیبی زندگی کو سمجھنے کے لیے دہلی کی سیاسی زندگی لوٹ مار قتل و غارت اور یلغار کو بھی سمجھنا ہوگا، کیوں کہ سیاسی عدم استحکام سماج کی امیدوں کو معدوم کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں عوام مذہبی اور روحانی سکون کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے اس میں زیادہ تر رنج و الم، افسردگی، زمانے کی ناہمواری اور تصوف کو مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ دہلی میں تخلیق ہونے والے ادب کا بھی ہوا۔ چوں کہ مغلیہ سلطنت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بے حد کمزور ہو گئی تھی لہٰذا دہلی کی حکومت آس پاس کی حکومتوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کا مقابلہ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ ایسی حالت میں شعرا رومان پرور

خیالات، امید افزا تصورات کو قلم بند کرنے سے گریز کرنے لگے۔ اسی لیے دبستان دہلی کی شاعری میں غم، حرماں نصیبی، تڑپ اور کسک کے ساتھ ساتھ تصوف نے اہمیت حاصل کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری کو آہ کی شاعری کا دبستان کہا گیا۔ ایسا صرف دبستان لکھنؤ کی شاعری کو دیکھ کر اور دونوں دبستانوں کی انفرادیت کو قائم کرنے کے لیے کہا گیا۔

دہلی کی سماجی زندگی میں ہندو مسلمان مذہب و مسلک کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ دربار سے لے کر صوفیا کے مساکن اور میلوں ٹھیلوں میں سبھی بلا لحاظ مذہب و ملت شریک ہوتے تھے۔ اسی لیے اردو ادب کے سرمائے پر مشترکہ تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جسے عرف عام میں آج کل گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔ چوں کہ اردو کا پورا خمیر شروع سے اسی نظریے کا حامی رہا یعنی ملی جلی تہذیب کو بہتر طریقے سے پیش کیا گیا اور مذہبی دکھاوے کو ہمیشہ طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ خانقاہوں کے دروازے عوام الناس کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور ہر کسی کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک، رہنمائی اور روحانی تربیت کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اسی لیے ابتدائی اردو ادب کے فروغ میں صوفیا کے ملفوظات کا اہم کردار ہے۔ حالاں کہ بنیادی اعتبار سے ان کے ملفوظات مذہبی تبلیغ کے لیے ہوتے تھے لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی جو کسی کو ناگوار محسوس ہو۔ یہیں سے اردو کے کردار میں مشترکہ تہذیب شامل ہوئی اور رفتہ رفتہ مزید قوی ہوتی چلی گئی۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر چند کہ ان کا مقصد اپنے خیالات اور تصورات کا پھیلائو تھا لیکن مقامی زبان کے استعمال نے اردو کے فروغ کی راہیں ہموار کیں۔

4.2.3 لکھنو کا سماجی و تہذیبی منظر نامہ:

دہلی کے مقابلے لکھنؤ کی آب و ہوا پر سکون تھی اور سیاسی طور سے بھی یہ ایک مستحکم و خوش حال ریاست تھی۔ دہلی پر بار بار ہو رہے حملوں سے پریشان ہو کر شعرا و ادبا لکھنو کا رخ کر رہے تھے۔ اودھ کے نوابین نہ صرف یہ کہ ادب پرور تھے بلکہ ان کے یہاں سیاسی استحکام کی وجہ سے کچھ خاص چیزیں فروغ پا رہی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ میرؔ جیسا بڑا شاعر، جس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام دہلی میں گزارے ،وہ بھی لکھنؤ کا رخ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت ریاست اودھ کی حیثیت پورے ہندوستان میں دو طرح سے اہم تھی۔ اول خوش حالی اور دوم ادب پروری۔ اسی کے ساتھ ساتھ امن کا ہونا بھی ایک اہم خوبی تھی۔ دہلی پر بار بار ہو رہے حملوں سے دہلی کی بساط اجڑ چکی تھی مگر دہلی کے مقابلے لکھنؤ پر امن تھا۔ دہلی کے عدم استحکام کے مقابلے لکھنؤ کے سیاسی استحکام نے وہاں کی فضا میں مستقبل کے خواب پرو دیے تھے ،جس کے سبب لکھنؤ کی زندگی امید افزا، پر سکون اور رومان پروری سے مزین تھی۔ اسی خوش حالی، امید افزا ماحول اور فارغ البالی نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں رومان پروری، مستی اور عیش کوشی جیسے موضوعات کو ادب میں جگہ دی۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لکھنؤ دہلی کی ماتحتی سے الگ ہوا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ دہلی سے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے اہلِ لکھنؤ نے کچھ الگ چیزوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہو تاکہ اس کی انفرادیت دہلی سے جداگانہ قائم ہو سکے۔ یہی وجوہ رہیں جس کے سبب علی جواد زیدی نے اپنی کتاب دو ادبی اسکول میں دہلی کو ”آہ“ اور لکھنو کو ”واہ“ کا دبستان کہا۔

ہر ادب اپنے عہد کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ اس نظریے سے دکنی، دہلوی اور لکھنؤ کے سماجی و تہذیبی پس منظر کو اگر دیکھا

جائے تو ان دبستانوں نے اس نظریے کو سچ ثابت کیا ہے۔ دکنی اردو کے سماجی پس منظر نے اسے وہ کیفیات عطا کیں جو اس کے تمدن میں شامل تھیں۔ اسی طرح دہلی کی تہذیبی فضا نے بھی اسے ایک خاص رنگ عطا کیا، جس میں تصوف، دلی واردات، کیفیات اور حرماں نصیبی کا ایک خاص رنگ شامل ہے لیکن لکھنؤ کی فضا دہلی سے مختلف تھی لہٰذا اس کی شاعری کا رنگ دکن اور دہلی دونوں سے الگ قائم ہوا۔ دبستان لکھنؤ سے مراد شعر و ادب کا وہ ایک خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے ابتدائی دور کے شعرا نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ، دکنی اردو اور دہلوی شاعری کے رنگ و آہنگ سے جدا اپنی ایک شناخت رکھتا ہے یعنی دہلی کی داخلیت کے برعکس لکھنؤ نے خارجیت اختیار کی۔ یہ رنگ و آہنگ لکھنؤ کو اس کی تہذیبی فضا نے عطا کیے، جس سے اس کی ایک خاص حیثیت اردو ادب میں قائم ہوئی۔ جب دہلی تباہ و برباد ہوئی اور لکھنؤ اہل دانش و حکمت کا مرکز و محور بنا تو اس سے قبل علم و ادب کے دو بڑے مراکز یعنی دکن اور دہلی کی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور آئے دن کے حملوں سے جب دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے شعرا، حکما اور ارباب علم و دانش نے دہلی کو خیر آباد کر کے لکھنو کا رخ کیا' جس کے باعث فیض آباد اور لکھنؤ میں ادب کی محفلوں کو کافی فروغ ملا۔ اورنگ زیب کے جانشین تخت کے لیے آپس میں لڑنے مرنے لگے جس کے سبب دہلی کی مرکزی سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ اس کے بعد رہی سہی کسر مرہٹوں' جاٹوں' نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ 1722ء میں دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار مقرر کیا۔ دہلی کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعادت علی خان نے بہت جلد اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی حکومت کو مستحکم کرنے کی بے مثال کوششیں کیں۔ حکومت کی خوش حالی، امن و امان اور سلطنت کے استحکام کے باعث اودھ کے حکمران عیش و نشاط کے دلدادہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طوائفیں ہر گلی کوچے میں نظر آنے لگیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ طوائفوں کے کوٹھے اعلیٰ تہذیب کے مراکز قرار دیے گئے جہاں بچوں کو آدابِ محفل سکھانے کے لیے بھیجا جانے لگا۔

4.3 شمالی ہند میں اردو ادب کا پس منظر

شمالی ہند میں اردو کا سماجی تانا بانا 2000 ق م سے آریوں کی آمد سے بننا شروع ہوتا ہے۔ آمد کا یہ سلسلہ متواتر سینکڑوں سال تک قائم رہتا ہے۔ شمالی ہند میں باہر سے آنے والوں اور مقامی حضرات کے میل جول سے ایک ایسے سماج کی بنیاد پڑی جس میں ہر طرح کے لوگوں کی یکساں اہمیت تھی۔ اسی کو دیکھتے ہوئے فراقؔ گورکھپوری نے کہا ہے:

سر زمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

اسی ملی جلی تہذیب نے ایک ایسی زبان کے لیے راہیں ہموار کیں، جس میں کسی مذہب کی کوئی خاص گنجائش نہیں تھی۔ اس زبان کا مزاج سماجی دکھاوا، ریاکاری اور مذہب کی جکڑ بندیوں کے خلاف اور رندی و سرمستی کی حمایت میں رہا۔ دہلی کو صدیوں سے مرکزیت حاصل ہے، اسی وجہ سے یہ بار بار اجڑتی اور بستی رہی لیکن اس کی مرکزیت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب دہلی تمام عالم کے لیے باعث رشک ہو گئی تھی۔ اسی کو دیکھتے ہوئے میرؔ نے کہا تھا:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

شمالی ہند میں اردو کے پس منظر پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں امیر خسرو (متوفی 1325) کے علاوہ اور کوئی ادیب نظر نہیں آتا۔ ساتھ ہی ایسا ممکن بھی نہیں لگتا کہ چودہویں، پندرہویں اور سولہویں صدی میں کوئی تخلیق کار شمالی ہند میں پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ انہیں صدیوں کے اوقات کے درمیان محمد بن تغلق اور مغلیہ افواج کے ساتھ اردو دکن پہنچتی ہے اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے قابل قدر تصانیف منظر عام پر پیش کرتی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ شمالی ہند میں دربار کی زبان فارسی تھی لیکن بول چال یعنی رابطے کی زبان کی حیثیت سے اردو کا استعمال عوام الناس میں ہو رہا تھا۔ درباری زبان چوں کہ فارسی تھی اس لیے اردو میں تصنیف و تالیف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ جب کہ اسی دوران دکن میں اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ دکن میں بہمنی سلطنت اور بعد میں بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے پر پانچ آزاد ریاستوں کا بننا کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان ہی پانچ ریاستوں میں سے دو ریاستوں نے یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور نے اردو کو خاص طور سے فروغ دیا۔ چوں کہ یہ ریاستیں شمالی ہند سے دشمنی کے سبب قائم ہوئی تھیں' اسی لیے انہوں نے فارسی کے بجائے مقامی زبان اور مقامی تہذیب کو فروغ دیا جو آگے چل کر اردو کے لیے بے حد اہم ثابت ہوا۔ زیر بحث تقریباً چار صدیوں کے دوران شمالی ہند میں جو بھی ادبی ولسانی سرمایہ ابھی تک دستیاب ہوا ہے، ان میں صوفیائے کرام کے ملفوظات خاصی اہمیت کے حامل ہیں جو مختلف تذکروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب '' اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں ان تمام ملفوظات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغلیہ دربار کی زبان فارسی ہونے کے باعث ادبا و شعرا فارسی ہی میں اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کی رسائی دربار تک ہو سکے اور کچھ مراعات حاصل ہو سکیں۔ ولیؔ دکنی اسی دوران جب دہلی تشریف لاتے ہیں اور اپنی مقامی زبان میں شعر سناتے ہیں تو دہلی والوں پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ یہیں سے دہلی میں بھی اردو کی نشو و نما کی راہیں ہموار ہونے لگتی ہیں اور دہلوی شعرا بھی اس زبان میں طبع آزمائی کرنے لگتے ہیں۔

دہلی اور لکھنو کا امتیاز دراصل دو حکومتوں اور اجڑتی اور آباد ہوتی ریاستوں کی کہانی بھی ہے۔ ان باتوں کا بھی ایک قاری کی حیثیت سے ہمیں خیال رکھنا چاہیے. چند لوگوں کے ایک جگہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یہاں دلی کے نامور شعرا کے ساتھ ساتھ نورالحسن ہاشمی نے مصحفیؔ کے تذکرہ کے حوالے سے 42 شعرا کے نام درج کیے ہیں (جنہیں انہوں نے اوسط درجے کا شاعر کہا ہے) جو دہلی سے صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کا مزاج دہلی میں پختہ ہو چکا تھا لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ ایسے شعرا نے جب خوش حالی، فارغ البالی اور رومان پروری دیکھی تو انہوں نے لکھنو کا وہی رنگ اختیار کر لیا جس میں مضمون کے بجائے ظاہری چیزوں کو اہمیت حاصل تھی۔

4.3.1 دبستانِ دہلی:

ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں زمانۂ قدیم ہی سے اقوام عالم کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے یہاں ایک مخلوط تہذیب پروان چڑھی۔ باہر سے دہلی وارد ہونے والی مختلف اقوام کے میل جول سے یہاں ایک ہمہ رنگ تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں دہلی قدیم جنگی حکمت عملی (strategy) کے اعتبار سے بہت اہم مقام پر قائم ہے، اسی لیے اسے اس زمانے میں اہمیت دی گئی تھی۔ دہلی میں

حکومت ہونے کے باعث اس کو ہندستان کا دل کہا جاتا رہا ہے، اسی سبب سے اس کی مرکزی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ سکندر لودھی نے سلطنت کو آگرہ منتقل کیا اور مغل حکمرانوں میں بابر، ہمایوں اور اکبر نے آگرہ ہی سے ہندوستان پر اپنی حکمرانی بنائے رکھی۔ شاہ جہاں نے حکومت کو آگرہ سے دہلی منتقل کیا اور شاہ جہان آباد کو دارالسلطنت بنایا اور اس طرح آباد کیا کہ آج بھی دہلی کو ہندوستان کا دل ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

دہلی میں مغلیہ حکومت کے قیام نے اردو کی راہ ہموار کر دی۔ کیوں کہ فارسی سے اردو نے بہت کچھ حاصل کیا ہے، جن میں فارسی کی چار مخصوص آوازیں یعنی "پ، چ، ژ اور گ" بھی شامل ہیں۔ زبان کے سماجی و تہذیبی ڈھانچے اور ارتقا سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح اردو نے دربار میں رسائی حاصل کی اور حاکم و محکوم کی زبان ایک ہو گئی۔ شاہی لشکر میں ہر علاقے اور ہر طبقے کے لوگ ہوا کرتے تھے، انہیں ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو سب کی سمجھ میں آتی ہو، یہیں سے اردو کا کینوس تیار ہوا اور رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے آج یہ ایک بڑی عالمی زبان کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔

مغلیہ حکمراں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت اور فارسی کا زوال اور اردو کی ارتقا و عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں مغلیہ حکومت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ:

سلطنتِ شاہ عالم از دلی تا پالم

یعنی وہ حکومت جس کی سرحدیں افغانستان سے برما تک تھیں، اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دربار کی ویرانی کے ساتھ ہی فارسی کی بساط الٹ جاتی ہے اور اردو اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اب مشاعروں میں اردو کا شاعر اپنے کلام کو پیش کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں سوچتا کہ وہ فارسی نہیں بلکہ اردو میں شعر کہہ رہا ہے۔ اس طرح اردو زبان نے فارسی کا مقام حاصل کر لیا اور دھیرے دھیرے اس میں باقاعدہ ادب بھی تخلیق ہونے لگا۔ ابھی یہ صورتِ حال چل ہی رہی تھی کہ ولیؔ دکنی کا دلی (1700ء) میں ورود ہوتا ہے۔ ولیؔ کے کلام کو سن کر دہلی کے شعرا کو حوصلہ ملتا ہے کہ وہ بھی اس زبان میں شاعری کریں۔ ولی کے کلام کی دہلی میں بڑی ستائش ہوئی۔ اس سے دہلی کے شعرا کو کافی تقویت ملی اور یہیں سے اردو ادب کے ایک باب کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے شاعر غالباً جعفر زٹل ز ٹلیکو مانا جاتا ہے، جنہیں ان کے ایک سکہ شعر پر تہِ تیغ کیا جاتا ہے۔

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

چوں کہ اس میں بادشاہِ وقت کو نشانہ بنایا گیا تھا، اس لیے ان کو اس کی سزا دی گئی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے دہلی کی بدحالی بیان کی تھی۔ مغلیہ حکمران مسلم ضرور تھے لیکن وہ ہندستانی معاشرے میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ سب کے لیے انصاف اور برابری کو قائم رکھنا ان کے لیے اولین فریضہ تھا۔ وہ یہاں کے سماج میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ انہوں نے راجپوتوں سے رشتے قائم کیے اور جمہوری قدروں کو پروان چڑھایا۔ اکبر نے دینِ الٰہی نام سے ایک مذہب چلایا، جس میں سبھی مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ آگے چل

کر مغلیہ حکمرانوں کے دربار تک اردو کی رسائی ہوئی۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر خود ایک بہترین شاعر تھے۔ یہ وہ سماجی و تہذیبی پس منظر ہے جس میں اردو کی داغ بیل پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا خمیر ابتدا ہی سے غیر مسلکی، غیر مذہبی، رواداری، اخوت کو فروغ اور مذہبی ریاکاری پر طنز کے تیر چلانا اس کے مزاج میں آیا۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے اردو ادب میں ایک نئے دور کی شروعات ہوتی ہے کیوں کہ اس وقت تک ولیؔ کی دہلی آمد ہو چکی تھی اور دہلی کے بہت سے شعرا اردو میں تخلیق کا کام کرنے لگے تھے۔ اِدھر دہلی میں یہ صورتِ حال تھی، اُدھر کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں اردو کے ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زبان کو سنوارنے کا کام بھی دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ قلم نے کیا، جس سے اردو نکھر گئی اور لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے لگی۔ اردو کی ایک شعری صنف غزل ہے جس کا تمام شعری اصناف پر غلبہ ہے اور اس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان حکمرانوں نے اس طرح کی سماجی و تہذیبی فضا قائم کی کہ عید اور تعزیہ داری میں ہندو شامل ہونے لگے اور ہولی و دیوالی میں مسلمان شریک ہو کر انہیں مبارکباد دینے لگے۔ اس ماحول نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا اور ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جسے گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔

4.3.2 دبستانِ لکھنؤ:

ہندستانی تہذیب کی اپنی کچھ خاص خوبیاں ہیں، جس میں برسہابرس سے چلی آ رہی ہماری کہانیاں، داستانیں اور روایتیں موجود ہیں۔ لکھنؤ کی داغ بیل نواب آصف الدولہ نے ڈالی تھی۔ ان کا ارادہ شاہ جہان آباد سے بہتر شہر آباد کرنے اور بہتر ریاست قائم کرنے کا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس ریاست میں الگ الگ خطوں سے لوگ آ کر آباد ہو رہے تھے، جن میں خاص طور سے دہلی کے لوگ تھے۔ لکھنؤ واقعتاً کثیر الجہت ترقی کی راہوں پر آگے بڑھا اور ایک ایسی سماجی فضا تیار کی کہ جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان ہونے کے باوجود اودھ کے حکمرانوں نے السلام علیکم کی جگہ آداب، تسلیم، کورنش اور مجرا عرض ہے جیسے نئے آداب و اطوار وضع کیے۔ لکھنوی تہذیب ہر چند کہ مٹ چکی ہے پھر بھی ابھی اس کی بو باس کہیں نہ کہیں نظر آ جاتی ہے۔ لکھنؤ والوں نے جس تہذیب کو گلے لگایا اور پروان چڑھایا اسے آج لکھنوی تہذیب کہتے ہیں۔ اس تہذیب میں مذہبی رواداری، ہمدردی، ایمانداری، قوت برداشت، خودداری، نفاست، خوش طبعی، شریف النفسی، وضع قطع، لباس غرض زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی جس کا ہر کوئی گرویدہ ہو گیا۔ 1856ء یعنی واجد علی شاہ کی گرفتاری تک لکھنؤ کی تہذیب، اس کے گلی کوچے، اس کی محفلیں، آرائش و زیبائش کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی دور میں اردو ادب بھی خوب پھولا پھلا۔ اردو زبان کی اس ریاست میں وہ ترقی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ مثنوی میں سحر البیان، گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق جیسی بے نظیر تخلیقات سامنے آئیں تو مرثیے میں میر انیس اور مرزا دبیر جیسے بہترین مرثیہ گو بھی لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے، جن کا اردو ادب میں کوئی بدل نہیں۔ انہیں اساتذہ کے ساتھ ان کے شاگرد چلا کرتے تھے۔ مشاعرے میں انیسیے اور دبیریے ایک دوسرے کی گرفت کیا کرتے تھے جس سے زبان صاف و شستہ ہوتی چلی گئی۔ اسی خوش حالی اور رومان پرور فضا میں اردو بھی خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی۔ ریاست میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں تھیں لیکن حکمرانوں کی کاوشوں سے وہ اس طرح شیر و شکر

ہو گئیں کہ دونوں نے ایک دوسرے کے کلچر کو اپنانے سے گریز نہیں کیا۔ اس سے ایک نئے معاشرے کی داغ بیل پڑی' جسے مشترکہ کلچر کہنے لگے یعنی ہندو تعزیہ داری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تو مسلمان ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں میں شریک ہونے لگے۔ ہر طرف خوشحالی کے شادیانے بجتے تھے، راگ ورنگ کی محفلیں سجتی تھیں' مشاعروں کا بڑے پیمانے پر انعقاد ہوتا تھا۔ شعرا کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ اس بخشش کے لیے رعایا کی کوئی تخصیص نہیں کی جاتی تھی۔ دہلی کی حیثیت شعر وادب میں مسلم ہو چکی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں بھی وہ باکمال پیدا ہوئے کہ اس کی اپنی ایک ممتاز ساکھ قائم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ لکھنو کا تخلیقی ادب بھی ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا، جس کی تمام عالم میں اپنی ایک منفرد حیثیت قائم ہے۔ آج اردو ادب میں دو دبستانوں کا ذکر عموماً ملتا ہے اور وہ ہے دبستانِ دہلی اور لکھنؤ۔

اودھ کی ریاست نے تقریباً سوا سو سال میں اردو ادب پر وہ اثرات ثبت کیے کہ یہ ریاست اپنی اعلیٰ تہذیب وثقافت کے لیے پوری دنیا میں مشہور و مقبول ہو گئی۔ یہاں کے حاکم ونوابین نے وہ سماجی و تہذیبی روایات قائم کیں کہ وہ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بے حد مشہور ہوئے اور آج تک لوگ اس تہذیب کو پہلے آپ پہلے آپ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کرنا، القاب و آداب کا خیال رکھنا، بڑوں اور چھوٹوں سے تخاطب میں امتیاز رکھنا آج بھی ہم اہلِ لکھنؤ سے سیکھ سکتے ہیں۔ محفل، مجلس اور طعام وغیرہ کے ایسے اطوار طے کیے کہ آج بھی زمانہ ان کو یاد کرتا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے عمارتوں میں آصفی امام باڑہ، رومی گیٹ اور باغات کا اس طرح اہتمام کیا کہ لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جانے لگا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ دہلی اور اودھ کے حکمراں مسلمان تھے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بجا ہے کہ انہوں نے پہلے حکومت کے انتظام وانصرام کو اولیت دی اور تمام باشندگانِ ریاست کو ایک نگاہ سے دیکھا۔ سماج میں انصاف قائم کرنے کو اہمیت دی اور اسی کو اپنا نصب العین سمجھا۔ انہیں اصولوں کے پیش نظر لکھنؤ آج دنیا میں اپنی منفرد شناخت و مرتبہ کا نمائندہ شہر سمجھا جاتا ہے اور اپنی تہذیبی وراثت کے سبب اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ ان چیزوں کے پیچھے اودھ کے نوابوں کا اعلیٰ ظرف اور ان کی دور اندیشی کار فرما ہے، جنھوں نے اسے اپنی محنت ولگن سے سنوارا اور حکمت و دانائی سے اس کی آبیاری کی۔

لکھنؤ کی تہذیب جسے اودھ کے نوابوں نے پروان چڑھایا وہ حقیقت میں ایرانی تہذیب تھی لیکن اس میں انہوں نے مقامی سماج اور شہریوں کو دیکھتے ہوئے ہندو اور مسلم تہذیب کے عناصر کو اس طرح پرویا کہ وہ حسین ترین تہذیب و تمدن کا نمونہ بن گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا کوئی توڑ انگریزوں کے پاس بھی نہ تھا۔ انگریز جب ہندو مسلم اتحاد سے پریشان ہو گئے تو انہوں نے اس کو توڑنے کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ جب دو بڑی قومیں آپس میں اس طرح شیر وشکر ہو جائیں کہ دونوں ایک دوسرے کی شادی بیاہ، خوشی وغم، میلے ٹھیلے اور تیج تہواروں میں شامل ہونے لگیں تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک نئے کلچر کو فروغ ملے۔ یہی اسباب تھے، جن کے باعث مشترکہ تہذیب پروان چڑھی اور دنیا کے سامنے ایک نئی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کے نام سے متعارف ہوئی۔ اسی مشترکہ تہذیب کی بدولت اردو ادب میں یہی گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی، جہاں مذہب کے بجائے رندی و سرمستی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا نے اپنی تمام تر توجہ ظاہری حسن' کشش' جاذبیت اور خوبصورتی پر صرف کی۔ داخلیت' دلی کیفیات' وارداتِ قلبی اور جذبات نگاری پر توجہ دینے کے بجائے تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب و معاشرت نے اہمیت دی۔ ناسخؔ لکھنوی نے اصلاح

زبان کی تحریک شروع کی۔ جس کے سبب انہوں نے دیسی اور سنسکرت کے الفاظ کو متروک کر کے فارسی اور عربی کے لفظوں کو جگہ دی۔ دہلی کے شاعروں نے ہندی اور دوسری زبانوں سے بھی فیض حاصل کیا لیکن لکھنوی شعرا نے زبان کی اصلاح کے نام پر عربی اور فارسی کو فوقیت بخشی۔ شعرائے لکھنؤ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے لغت پر زیادہ توجہ دی اور زبان کی ادائیگی کے معاملے میں اس پر زور دیا جب کہ دہلی کے شعرا نے مروجہ زبان کو اہمیت دی۔ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں زبان کے استعمال میں خاص فرق ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دبستانِ دہلی کی شاعری داخلی شاعری ہے اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں محبوب کا سراپا اور ظاہری شکل وصورت کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس بحث کا مجملہ ماحصل یہ ہے کہ دونوں دبستانوں کی اپنی اپنی انفرادیت ہے، جس سے دونوں دبستانوں کا امتیاز قائم ہے۔ یہ وہ چند باتیں یا خصوصیات ہیں جن کا سماجی و تہذیبی پس منظر کے ضمن میں ذکر کرنا ضروری تھا۔

4.4 دہلی و لکھنؤ کی معاشرت کا ایک سرسری جائزہ

سیاسی استحکام اور انتظامی امور کو اگر مد نظر رکھیں تو دہلی کی حالت، لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت سے ایک حد تک بالکل جداگانہ تھی۔ دلی کی اقتصادی صورتِ حال ابتر ہوتی جا رہی تھی، جب کہ اردو فروغ پا رہی تھی۔ دہلی آئے دن طرح طرح کے حملوں یا سازشوں کا نشانہ بن رہی تھی، جس سے شہری پریشان ہو کر آس پاس کی ریاستوں کا رخ کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ایسے دور میں جب کہ راجا سے پرجا تک سبھی معاشی بدحالی کا شکار ہوں، آئے دن نئے فتنے اٹھ رہے ہوں تو ایسے میں شہریوں میں مایوسی، ناکامی اور مستقبل کی ناامیدی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ میں آسودگی، خوش حالی اور انتظامی امور مستحکم تھا جس کے سبب وہاں کے لوگوں میں رومان پروری، سرمستی، عیش و عشرت، مرغ بازی اور پتنگ بازی جیسے کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ادھر دہلی کے لوگوں کا حال مایوس کن تھا تو لکھنؤ کے لوگوں کا حال امید افزا۔ اسی سے دونوں دبستانوں کے ادبا کا نظریہ زندگی سے متعلق جدا جدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دہلی تباہی کے دہانے پر تھی تو لکھنؤ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ اسی ماحول کے سبب دہلی کا دبستان ''آہ'' کا دبستان بنا تو لکھنؤ کا دبستان ''واہ'' کا۔ یعنی دہلی کی شاعری میں داخلی جذبات و کیفیات، افسوس و مایوسی، تصوف اور روحانیت کی ترجمانی کی گئی تو لکھنؤ میں خارجی حسن، واردات اور حرکات و سکنات کی منظر کشی کو ترجیح دی گئی۔ دہلی کی شاعری میں نازک مزاجی، دلگدازی اور حقیقت حال کا ہونا ضروری سمجھا گیا جب کہ اس کے مقابلے لکھنؤ میں سراپا نگاری، معاملہ بندی وغیرہ کی پیش کش پر سارا زور صرف کیا گیا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ لکھنویت اور دہلویت ایک ہی سکے کے دو الگ الگ رخ ہیں۔ دہلوی شاعری اور لکھنوی شاعری کے فرق کی شناخت سب سے پہلے شیخ امام بخش ناسخؔ نے کی تھی۔ انہوں نے جن خصوصیات کی نشاندہی کی تھی، ان خصوصیات کا خود اپنی شاعری میں لحاظ رکھا۔ شاید اسی سبب سے ناسخؔ کو دبستان لکھنؤ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

4.5 شعر و ادب پر ماحول کے اثرات

یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے کہ جس طرح کی سیاست، سماج اور ماحول ہو گا، اسی طرح کا ادب تخلیق ہو گا۔ شاید اسی لیے ساحرؔ لدھیانوی نے کہا ہے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

یہی سبب ہے کہ ہر ادب کو اپنے عہد کی عکاسی و ترجمانی کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔ شاعری اپنے عہد کے طرز تمدن، طریقۂ تفکر کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ دہلی میں جو تمدن عہد مغلیہ میں جاری تھا اور جس کا اثر تھوڑا بہت 1947ء تک باقی رہا۔ اسلام کا وہ تمدن تھا جو اس کے زوال کے زمانے میں پیدا ااور تمام ممالک اسلامی کی طرح ہندوستان میں بھی مقامی خصوصیت سے متاثر ہوا اس عہد زوال کے تمدن میں خوبیاں کم تھیں اور برائیاں زیادہ۔ برائیوں میں تصنع رواج پرستی قدامت پرستی، شخصی و دیگر اخلاقی خرابیاں جو غلط تعلیم اور افلاس کے باعث پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خود غرضی، حرص، جھوٹ، نفاق، حسد وغیرہ وغیرہ عام ہو گئی تھیں۔ طریقۂ فکر اور طرز تمدن کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں اور نتیجے کو تہذیب کہا جاتا ہے۔

اس نظریے سے جب ہم دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے تہذیبی و سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے ادب میں اتنا امتیاز کیوں ہے؟ سیاسی عدم استحکام سے سماج مایوسی کا شکار ہوتا ہے، ایسے ماحول میں رومان پرور خیالات کی شاعری شاعر نہیں کر سکتا اور اگر شاعر کر بھی لے تو قاری پڑھنا پسند نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ رومانی خیالات اسی وقت اچھے لگتے ہیں، جب انسان کے پیٹ میں اناج ہو اور وہ آسودہ حال ہو۔ دہلی کا جو ماحول تھا، ویسے ماحول میں جو ادب تخلیق ہوا، اس نے اپنے عہد اور سماج کی بھرپور عکاسی کی اور اسی طرح لکھنؤ کے ادب نے لکھنؤ کے امن و امان، شان و شوکت اور عیش پرستی کی عکاسی کی۔ ایسے پرسکون ماحول میں فنون لطیفہ، رقص و سرور کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کو بھی بہت فروغ ملا۔ دہلی کی بدامنی اور انتشار نے اہل علم کو اودھ اور خاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونے پر مجبور کیا۔ اس طرح ایک ایسا وقت بھی آیا جب شاعری کا مرکز دہلی کے بجائے لکھنؤ میں قائم ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ امراو رؤسا کی سرپرستی نے شاعری کا ایک ماحول بنایا، جس کے سبب شعر و شاعری کا چرچا بہت عام ہوا۔ ابتدا میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان پر ان کا اثر نمایاں رہا لیکن رفتہ رفتہ اس میں کمی آنے لگی۔ میرؔ جب لکھنؤ پہنچے تھے تو انہوں نے اپنا تعارف کچھ اس طرح پیش کیا تھا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ وہ اشعار ہیں جنہیں میرؔ نے اپنے تعارف کے طور پر لکھنؤ میں پیش کیا تھا۔ میر کی زندگی کے زیادہ تر ایام دہلی میں گزرے لہٰذا ان پر لکھنوی رنگ کا اثر بالکل نہیں ہوا۔ اس کے بعد مصحفیؔ اور انشاؔ تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری کہیں نہ کہیں برقرار رہی اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی بھی کہیں نہ کہیں قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے لکھنؤ کی خاص زبان، تہذیب اور

رکھ رکھاؤ نمایاں ہوتا گیا۔ اس طرح اردو ادب میں ایک نئے دبستان کی بنا پڑی، جس نے آگے چل کر اردو ادب میں دبستان لکھنؤ کے نام سے اپنا ایک منفرد مرتبہ حاصل کیا۔ دہلی کے داخلی رنگ کی ایک مثال میرؔ کے کلام سے ملاحظہ ہو۔

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں کچھ، اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

اس شعر میں خود کلامی کی کیفیت ہے یعنی شاعر کا تخاطب کسی اور سے نہیں بلکہ خود سے ہے۔ اسی طرح کا ایک اور شعر دیکھیں۔

ٹک دیر جو آ جانے میں جاناں نے لگائی
ساون کی جھڑی دیدۂ گریاں نے لگائی

درج بالا دونوں شعروں میں شاعر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے، جسے داخلی شاعری کی ایک کیفیت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خارجی شاعری کا رنگ بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ مثلاً:

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

انتہائے لاغری سے جب نہ میں آیا نظر
ہنس کے فرمانے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

یہ ایک معمولی سی مثال داخلی اور خارجی شاعری سے ہم نے پیش کی تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ دونوں دبستانوں میں بنیادی اعتبار سے کیا فرق ہے۔

4.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ہندوستان میں باہر سے آنے والوں کی زبان کیا تھی؟ اس پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں لیکن یہاں کے مقامی لوگ اس زمانے میں کون سی زبان آپسی بول چال کے لیے استعمال کرتے تھے، اس پر کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اس کے باوجود لسانیاتی نقطۂ نظر سے اتنا تو طے ہے کہ ہندوستان کے مقامی لوگ بھی کوئی نہ کوئی زبان ضرور بولتے رہے ہوں گے۔
- ہندوستان آنے والے قافلے ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے بھارت آئے تھے، اس لیے ان پر ایرانی تہذیب کے گہرے اثرات تھے۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں امیر خسرو نے ترکی اور ایرانی اثرات کو استعمال کر کے نئے تجربے کیے۔ عربی رسمِ خط نسخ کو ترقی دے کر ایرانیوں نے فارسی رسم خط نستعلیق ایجاد کیا اور آج یہی رسمِ خط اردو کا سب سے مقبول رسمِ خط بھی ہے۔
- ہندوستان کے بیشتر مسلم حکمرانوں پر ایرانی تہذیب و تمدن کا اتنا گہرا اثر تھا کہ فارسی ہی کو ہمیشہ مہذب، درباری اور تہذیبی زبان

سمجھا گیا۔ بادشاہ اور نوابین جب عام لوگوں سے بات کرتے تو انہیں ہندی یا ہندوی (اردو) کے استعمال پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ باہر سے آنے والے نو وارد بازاروں میں مقامی لوگوں سے ملی جلی زبان میں بات کرتے تھے، جس سے ایک نئی زبان کے بننے کے اسباب پیدا ہوئے۔ اسی میل جول نے ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کو پروان چڑھایا، جسے گنگا جمنی یا مشترکہ تہذیب کہتے ہیں۔

- ہندوستانی تہذیب میں مغلوں سے پہلے رات کی محفلیں، مجلسیں اور آرائش کا کہیں ذکر نہیں تھا، یہ خالص مغلیہ سلطنت کی دین ہے۔ ہندوستان میں سورج غروب ہونے کے بعد زندگی ختم اور سورج طلوع ہونے سے شروع ہوتی تھی۔ باہر سے آنے والوں میں فوجیں اور لشکر کے علاوہ اللہ کے ایسے نیک بندے بھی شامل ہیں جنہیں اپنے مذہب اور انسانیت کے پیغام سے سروکار تھا۔ یہ اللہ کے نیکوکار بندے جنہیں ہم آج صوفیائے کرام کہتے ہیں، اردو زبان کے فروغ میں ان کا اہم کردار ہے۔
- حالاں کہ ان کا زبان سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن انہیں اپنے پیغام عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ایک ملی جلی زبان کی ضرورت تھی اور وہ کام یہی ملی جلی نئی زبان جو اس زمانے میں پروان چڑھ رہی تھی، اس نے پورا کیا۔ اس سے اردو زبان کے فروغ میں مدد ملی۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان کے اولین نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات' خالق باری وغیرہ میں سب سے پہلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔
- اردو نہ صرف عوام کی زبان تھی بلکہ اس کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے حاکمینِ وقت بھی آہستہ آہستہ اس کی جانب متوجہ ہونے لگے تھے۔ ظہیر الدین محمد بابر کے ترکی دیوان میں اردو کا ایک مصرع، اکبر اعظم کا ایک اردو دوہا اور "توزک جہانگیری" میں تو اردو کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔
- ہندوستانی فوجیں، جن میں تقریباً ہر خطے کے مضبوط قد کاٹھی کے لوگ شامل ہوتے تھے، ان کو بھی آپسی رابطے کے لیے ایسی ہی ایک مخلوط زبان کی ضرورت تھی، جس سے وہ آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں۔ ان کی اس ضرورت کی بھرپائی اسی زبان سے ہوئی، جس کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اونچا اور کوئی نیچا ہوتا تھا۔ اسی روزمرہ کی ضرورت نے اردو زبان کو فروغ دیا اور سب کا ہم نوا بنایا۔ لفظ 'اردو'، اردو زبان کے لیے بہت بعد میں استعمال کیا گیا۔
- اس سے پہلے اس زبان کی شناخت کے لیے ریختہ، ہندی، ہندوی، اردوئے معلی جیسے لفظ استعمال کیے گئے۔ 'اردو' کے لفظی معنیٰ لشکر کے ہیں لیکن اس کا استعمال زبان کے معنوں میں غالباً 1775ء میں سب سے پہلے مصحفی نے کیا تھا، اس کے بعد سے لفظ اردو زبان کے لیے مستعمل ہو گیا۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے کہ ایک طرف مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور دوسری طرف اردو کا عروج ہو رہا تھا۔
- دہلی میں ذاتی طور پر ادبا و شعرا دیسی / مقامی زبان کے الفاظ اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے لیکن اس کے خاطر خواہ استعمال کی نہ تو ان میں ہمت تھی اور نہ ہی ماحول اس کے لیے سازگار تھا۔ ایسے میں ولی دکنی کی 1700ء کے آس پاس دہلی میں آمد اور ان کے کلام کی سماعت سے ان میں یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی روزمرہ کی زبان میں ادب تخلیق کریں۔

- ولیؔ کی آمد سے شمالی ہند کا منظر نامہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ وہ زبان جس میں بات چیت تو کی جا سکتی تھی مگر ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا تھا، اب اس میں بھی ادب تخلیق ہونے کے امکانات روشن ہوئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دہلی میں تخلیق کاروں کی ایک پود تیار ہو گئی۔ شمالی ہند میں اگر غور کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں صحیح معنوں میں نثری تصانیف کا سلسلہ فضل علی فضلی کی کربل کتھا سے شروع ہوتا ہے۔
- اس کے بعد دوسری نثری تصنیف ہونے کا فخر قصہ مہر افروز دلبر کو حاصل ہے، جسے عیسوی خاں بہادر نے 1732ء اور 1759ء کے درمیان تخلیق کیا۔ دونوں تصانیف کی زبان کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ پہلی کی زبان میں فارسی غالب ہے جب کہ دوسری کی زبان پہلے کے مقابلے سادہ، صاف اور رواں ہے۔ اس کے بعد اردو میں بہت سی کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ تخلیق بھی کی گئیں مگر ان تخلیقات پر فارسی کا کافی اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔
- شاعری میں نثر کے مقابلے پہلے مقامی زبان کا استعمال ہونے لگا تھا، جس میں اس عہد کی دہلی کے حالات اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ جعفر زٹلی، سوداؔ، میرؔ اور دردؔ کی شاعری میں دہلی کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جعفر زٹلی نے سکہ ٔشعر کہا تو سوداؔ نے شہر آشوب کہے۔ میرؔ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا تھا۔ انہوں نے بھی جابجا اپنی غزلوں میں دلّی کے حالات کی عکاسی کی ہے۔
- ایک طرف تو دہلی کے گلی کوچے اتنے حسین تھے کہ میرؔ نے مذکورہ شعر کہا لیکن اسی کے ساتھ جو کچھ دہلی میں ہو رہا تھا یعنی دہلی کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ یہ سید برادران کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ لوگ جب جس کو چاہتے تخت نشین کرا دیتے اور جب جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے تھے۔ اس ابتری کی کہانی کو بھی انہوں نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔
- دہلی کے وہ بادشاہ جن کے قدموں کی دھول کبھی لوگ اپنی پیشانی پر ملتے تھے، ان بادشاہوں کی آنکھوں میں جلتی ہوئی سلاخیں ڈال دی گئیں۔ ایسے دور میں دہلی ایک طرح سے بربادی کے دہانے پر تھی تو اودھ ترقی کے نئے ابواب رقم کر رہا تھا۔ اس ابتری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے حالات سے تنگ ہو کر شعرا نے پرسکون ریاست اودھ کا رخ کیا۔ لکھنؤ نے اردو ادب کو ایسے ستارے دیے، جس کی اردو ادب کو بہت ضرورت تھی۔ اس سے پہلے دہلی نے غزل اور قصیدے میں خاطر خواہ ادب پیدا کر لیا تھا۔
- لکھنؤ کے ادبا نے مرثیے اور مثنوی کو وہ مقام عطا کیا کہ اس سے آگے اس کی پرواز نہ ہو سکی۔ اسی طرح ناول اور ڈرامے میں امراؤ جان ادا اور انار کلی کی بھی حیثیت مسلم ہے۔ اس کے علاوہ زبان میں نفاست، نزاکت، رکھ رکھاؤ، القاب و آداب کے وہ معیار دبستانِ لکھنؤ کے اساتذہ نے طے کیے کہ اردو صرف نکھری ہی نہیں بلکہ سنور بھی گئی۔
- دہلی میں مروج زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کی پیش کش کو ترجیح دی تو لکھنؤ میں لفظوں کے استعمال کو برتری ملی۔ اس طرح سے داخلیت اور خارجیت کے امتیاز کے ساتھ اردو زبان دونوں طرح کے خیالات و تصورات کو پیش کرنے کی اہل ہو گئی۔ یہی دونوں دبستانوں کے سماجی و سیاسی حالات کے پیش نظر ہوا۔

6.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
لسانی	:	زبان سے متعلق	ڈول	:	بنیاد قائم کرنا، ڈھانچہ تیار کرنا
ٹھاٹھیں مارنا	:	(محاورہ) اونچی اونچی موجیں مارنا	عہد وسطیٰ	:	درمیانی عہد
عناوین	:	عنوان کی جمع	آماج گاہ	:	نشانے کی جگہ
گاہک	:	خریدار	مخلوط	:	ملا جلا، گڈ مڈ
خاطر خواہ	:	حسب منشا، خواہش کے مطابق	پذیرائی	:	قبولیت، منظوری
مساکین	:	مسکین کی جمع، غریب	یلغار	:	دشمن کی فوج پر حملہ، دھاوا
تصورات	:	خیالات	تخصیص	:	خصوصیت
ملفوظات	:	ملفوظ کی جمع، منہ سے بولی ہوئی بات	مستحکم	:	مضبوط
عیش کوش	:	عیش و عشرت کرنے والا	جانشین	:	ولی عہد، وارث
داغ بیل	:	شروع کرنا، کسی کام کی بنیاد رکھنا	مسلک	:	راستہ، طریقہ
کثیر الجہت	:	ہمہ جہت	انصرام	:	انتظام کرنا، بدوبست کرنا
فوقیت	:	بڑائی، برتری، غلبہ	آسودہ حال	:	خوش حال ہونا
معاملہ بندی	:	بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا	اقتصادی	:	معاشی
قدامت پرستی	:	بنیاد پرستی، پرانی باتوں کو پسند کرنے والا			
خانقاہ	:	درویشوں کے رہنے کی جگہ، پیر کا مقبرہ			
برصغیر	:	چھوٹا براعظم، مجازاً بھارت اور پاکستان			
داخلیت	:	اندرونی کیفیت، دلی کیفیت			

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ظہیر الدین محمد بابر نے اپنا دیوان کس زبان میں لکھا تھا؟

(a) اردو (b) فارسی (c) عربی (d) ترکی

2۔ دبستان لکھنو کا بانی کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(a) ناسخ (b) آتش (c) انشا (d) مصحفی

3۔ ولی دکنی نے دہلی کا سفر کس سنہ میں کیا؟

(a) 1600 (b) 1700 (c) 1720 (d) 1750

4۔ شمالی ہند کا پہلا شاعر کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(a) امیر خسرو (b) جعفر زٹلی (c) مسعود سعد سلمان (d) مرزا غالب

5۔ مغل سلطنت کا آخری بادشاہ کون تھا؟

(a) بہادر شاہ ظفر (b) شہنشاہ اکبر (c) محمد شاہ رنگیلا (d) ظہیر الدین بابر

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ شمالی ہند میں اردو ادب کے تہذیبی و سماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دہلی کو آہ اور لکھنؤ کو واہ کا دبستان کیوں کہا گیا؟

3۔ دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔

4۔ اردو کے پس منظر کے بارے میں اپنی معلومات سے واقف کروائیے۔

5۔ داخلیت اور خارجیت کی وضاحت کیجیے۔

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی کے سیاسی منظر نامے پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ لکھنؤ میں رومانی شاعری کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے۔

3۔ داخلی اور خارجی شاعری کی مثال کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا تا 1975ء — ڈاکٹر انور سدید

2۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں ورجحانوں کا حصہ — منظر اعظمی

3۔ اردو اور مشترکہ ہندستانی تہذیب — ڈاکٹر کامل قریشی

4۔ اودھ میں اردو ادب کا تہذیبی و فکری پس منظر — محمد حسن

5۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں — مرزا جعفر حسین

4.8.1 کے جوابات: 1-d 2-a 3-b 4-c 5-a

اکائی 5: دبستانِ دہلی

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 دبستان دہلی کا سماجی و تہذیبی پس منظر
5.3 میر تقی میرؔ
5.4 مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ
5.5 دبستانِ دہلی کے دیگر شعرا
5.5.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ
5.5.2 خواجہ میر دردؔ
5.5.3 میر سوزؔ
5.5.4 مومن خاں مومن
5.5.5 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ
5.5.6 بہادر شاہ ظفرؔ
5.6 دبستانِ دہلی کی خصوصیات
5.7 اکتسابی نتائج
5.8 کلیدی الفاظ
5.9 نمونۂ امتحانی سوالات
5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

اُردو شاعری کے دو اہم دبستان ہیں ' ایک دبستانِ لکھنوٗ اور دوسرا دبستانِ دہلی۔اس اکائی میں دبستانِ دہلی کی شاعری کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔دبستانِ دہلی کے سماجی و تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس دبستان کے دو الگ الگ عہدیعنی اٹھارہویں و انیسویں صدی کے دو اہم شعرا میر تقی میرؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی حیات اور ان کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔میرؔ اور غالبؔ کے ہم عصر جو اہم شعرا ہیں ان کی شاعری پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ دبستانِ دہلی کی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔آخر میں اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔اس اکائی میں اپنی معلومات کی جانچ کے لیے سوالات بھی دیے گئے ہیں۔پوری اکائی مکمل ہونے پر طلبا کی سہولت کے لیے نمونۂ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔آخر میں فرہنگ اور سفارش کردہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

- دبستان دہلی کی تہذیبی و سماجی مسائل کے بارے میں مختصراً جان سکیں۔
- میر تقی میرؔ اور غالبؔ کی حیات و شاعری کو بیان کرنے کے قابل ہوسکیں۔
- مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ، مومن خاں مومنؔ، ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری کو مختصراً جان سکیں۔
- دبستان دہلی کو سمجھ سکیں اور اس کی خصوصیات بیان کرنے کے قابل ہوسکیں۔

5.2 دبستانِ دہلی کا سماجی و تہذیبی پس منظر

دبستان دہلی کو سمجھنے کے لیے اورنگ زیب عالمگیرکے بعد ہندوستان کا سیاسی، سماجی و تہذیبی منظرنامہ پیش نظر رکھنا ہوگا۔شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے 1707ء میں وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔اورنگ زیب نے اسی ڈرسے اپنے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں اپنی سلطنت تقسیم کرکے جنگ وجدال سے بچانے کی کوشش کی مگر ایسا نہیں ہوا۔ معظم نے اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کردیا اور شاہ عالم بہادرشاہ کا لقب اختیار کرکے حکومت کرنے لگا۔مگر پانچ سال بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے، جن میں معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے تینوں بھائی عظیم الشان، رفیع الشان اور خجستہ اختر جہاں شاہ کو قتل کرکے 1712ء میں بادشاہت حاصل کرلی۔جہاں دار شاہ ایک نااہل اور عیاش بادشاہ تھا۔اس لیے دوسرے افراد شاہی تخت پر نظر رکھنے لگے۔جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے 1713 ء میں بادشاہ کو شکست دے کر خود

شاہی تخت پر قبضہ کرلیا۔ مگر سید برادران کو اس کی کوئی بات انتہائی ناپسند گزری اور انہوں نے 1719ء میں فرخ سیر کا قتل کرادیا۔ پھر محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ محمد شاہ کے دور میں ملک کو پے درپے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ روہیلوں کی بغاوت ہوئی، نادرشاہ و احمد شاہ ابدالی کے حملے ہوئے اور ملک میں خانہ جنگی کے حالات پید اہوگئے۔1748ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا تو احمد شاہ نے حکومت سنبھالی مگر 1754 ء احمد شاہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ پھر عالم گیر ثانی، اس کے بعد شاہ جہاں ثانی کچھ عرصے تک تخت نشیں رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے پھر دہلی پر حملہ کیا اور 1761 ء میں اس پر قبضہ کرکے شاہ عالم ثانی کو تخت نشیں کیا۔ اس طرح مغلیہ حکومت بالکل تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ میر تقی میرؔ نے احمد شاہ ابدالی کی قتل و غارت گری کا حال 'ذکرِ میرؔ' میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔ 1803 ء میں ولزلی نے دہلی پر قبضہ کرلیا مگر بادشاہ کا نام باقی رہا۔ شہنشاہ دہلی کے احکامات صرف قلعے تک محدود ہوگئے۔1806 ء میں اکبر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔ اس طرح کئی بادشاہ بنے مگر انہوں نے صرف انگریزوں کی کٹھ پتلی کے طور پر کام کیے۔ عوام معاشی تنگی اور بدحالی سے گزرنے لگی۔ بہادرشاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ رہے۔ انگریزوں نے مغلیہ حکومت پر اتنا قبضہ کرلیا تھا کہ بادشاہ کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ اسی درمیان انقلاب 1857ء کا واقعہ رونما ہوا ،جس میں بے انتہا ہندوستانی انقلابی شہید ہوئے۔ انگریزوں کو بہادر شاہ ظفرؔ سے پوری طرح حکو مت چھین لینے کا اچھا بہانہ مل گیا۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفرؔ پر 1857 ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ پھر انہیں گرفتار کرکے رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی میں فسادات، بد نظمی اور بیچارگی صاف نظر آتی ہے۔ مغلیہ حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ عوام معاشی تنگ دستی سے پریشان تھی۔ کسی ملازم کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ شاہی زندگی گزارنے والے قلعہ کے افراد کو کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ ان تمام صورت حال کاتہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔ خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ دہلی کے اسی ماحول میں اُردو شاعری پروان چڑھی۔ میرؔ نے دہلی کی اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

5.3 میر تقی میرؔ

میر تقی میرؔ کی پیدائش1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔ اصل نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ ان کے والد کا نام محمد علی متقی تھا۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے دوست امان اللہ اوربعد میں اپنے والدسے حاصل کی۔ میرؔ ابھی بمشکل گیارہ برس

کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کا 1733ء میں انتقال ہوگیا۔یہیں سے میرؔ کی زندگی میں رنج و الم کا باب کھل گیا۔میرؔ نے آگرہ میں ہی روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ مجبوراً 1734ء میں تلاش معاش کی غرض سے دہلی روانہ ہوئے۔ مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنے کے بعد جب ان کی ملاقات صمصام الدولہ سے ہوئی جن پر ان کے والد کے کئی احسانات تھے تو صمصام الدولہ نے میر تقی میرؔ کے لیے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر کردیا۔میرؔ واپس آگرہ آگئے جہاں کچھ عرصے تک ان کو وظیفہ ملتا رہا۔ مگر جب صمصام الدولہ کا انتقال ہوا تو میرؔ کا وظیفہ بھی بند ہوگیا۔جس کے بعد میرؔ نے مجبور ہوکر دوبارہ دہلی کا رخ کیا۔اس بار میرؔ نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے گھر قیام کیاجو خود عالم اور مشہور شاعر تھے۔ یہاں میرؔ سات سال تک مقیم رہے۔میرؔ کو یہاں نہ صرف معاشی پریشانیوں سے چھٹکارا ملا بلکہ وہ تعلیمی مراحل سے بھی گزرے۔کسی بات کی وجہ سے جب سراج الدین علی خاں نے میرؔ کے ساتھ بد سلوکی شروع کی تو تنگ دل ہوکر میرؔ وہاں سے دوسری جگہ چلے گئے۔

میرؔ جب سراج الدین علی خاں کے یہاں تھے تبھی سے شاعری کرنے لگے اور 1740ء میں بحیثیت شاعر ان کی شہرت ہوگئی۔ سراج الدین علی خاں کے یہاں سے نکلنے کے بعد میرؔ مختلف حکام کے یہاں ایک عرصے تک نوکری کرکے گزر بسر کرتے رہے مگر وہ ہمیشہ پریشان رہے۔کچھ دن ناگرمل سنگھ کے ساتھ بھی رہے۔ مگرجب مرہٹوں نے دہلی کو لوٹ لیا تو میرؔ کوڑیوں کے محتاج ہوگئے اور صرف شاعری ان کا مشغلہ رہ گیا۔اس طرح میرؔ اپنی عمر کے پچاس سال تک مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔انہیں کبھی آرام کا موقع میسر نہ ہوسکا،جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

میرؔ پر قسمت اس وقت مہربان ہوئی جب آصف الدولہ نے 1781ء میں انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت بھیجی۔میرؔ نے لکھنؤ پہنچ کر آصف الدولہ کی قصیدہ خوانی کی توانہیں بہت پسند آئی اور تین سو تا چار سوروپے ماہانہ تنخواہ پر بطور ملازم مقرر کیا۔اس طرح میرؔ کے لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزرے اور 20 ستمبر 1810ء جمعہ کے دن دار فانی کوچ کرگئے۔

میرؔ نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی مگر غزل ان کا اہم میدان تھا۔ان کی غزلیں ذاتی مسائل کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاس ہیں۔میرؔ ہر بات کو سادگی سے بیان کرتے ہیں۔جیساکہ میرؔ کی سوانح عمری سے پتہ چلتا ہے کہ میرؔ زندگی بھر مختلف پریشانیوں سے گزرے۔ تلاش معاش میں مختلف امرا کے یہاں کام بھی کیا۔اس وقت دہلی کے حالات بھی کچھ ایسے رہے کہ دہلی کو بار بار لوٹا گیا۔اس طرح میرؔ کی شخصیت کے داخلی و خارجی دونوں پہلو پر غم کا اثر رہا جو میرؔ کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔میرؔ کی شاعری میں عصری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔دہلی کی تباہی و بربادی اور بادشاہوں کے آنکھوں کو دہکتی سلائیوں سے جلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔میرؔ اپنے اشعار میں اکثر ہم کلامی کرتے نظر آتے ہیں۔ میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی لگتی ہے۔کیوں کہ میرؔ نے وہی کہا جو ان کے دل پر گزری۔ میرؔ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں

پاتا۔چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی　　انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گل ہومہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ　　اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

میرؔ اپنے محبوب کو مختلف طریقے سے یاد کرتے ہیں۔محبوب کے سراپا اور اس کے حسن کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔میرؔ کا محبوب اتنا حسین ہے کہ پھول و کلیاں بھی اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے کم کم کھلنا سیکھتی ہیں۔اس کے ہونٹ پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم و خوبصورت ہیں۔ پھول، آئینہ، چاند و سورج سب اس کے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔میرؔ کے اشعار میں محبوب کی ہر ادا دکھائی دیتی ہے۔معشوق کے قد و قامت، غمزہ و ادا اور میرؔ کے ساتھ اس کے نخروں کی صاف تصویریں نظر آتی ہیں۔میرؔ ہر وقت بس ذکرِ محبوب میں مصروف رہتے ہیں۔

اگرچہ دیگر کئی شعرا نے عشق کو موضوع بناکر غزل گوئی کی ہے مگر میرؔ نے جس طرح مکمل طور پر عشق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناکر عشق کو موضوع بنایا ہے وہ دیگر شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔میرؔ کی شاعری میں عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں ملتے ہیں۔انہوں نے نہ صرف عشق حقیقی کو موضوع بنایا ہے بلکہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، وحدت و کثرت، وجود و عدم، جبر و قدر پر بھی گفتگو کی ہے۔میرؔ کو زندگی کی بے ثباتی کا بھی احساس ہے۔چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا　　جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے

میرؔ کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیت، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ان کے اشعار سے قاری کو ایسی انسیت و اپنائیت ہوتی ہے گویا خود اسی کا معاملہ ہو۔ان کی زبان نرم اور رسیلی ہے۔میرؔ کی شاعری میں کہیں کہیں حیات وکائنات کے رنگارنگ مظاہر کا بھی ذکر ملتا ہے۔میرؔ اپنے اشعار میں نشتریت و چبھن بھی پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

میرؔ کے اشعار میں نرمی، غنائیت، موسیقیت اور ترنم اس طرح ہے جیسے نغمے کی لہر دوڑ جائے۔وہ اپنے اشعار میں مترنم الفاظ، چھوٹی بحروں اور نغمگی پیدا کرنے والے ردیف و قافیہ کا استعمال کرتے ہوئے تکرار الفاظ سے نغمگی پیدا کرتے ہیں۔تشبیہات و استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹاحال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میرؔ کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر میرؔ نے غزل کو بلندیوں پر پہونچایا۔غنائیت اور داخلی شاعری میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔انہیں کی غزلیہ شاعری کا نتیجہ تھا کہ وہ دور غزل کا عہد زریں کہلایا۔میرؔ کے زیادہ تر اشعار حزنیہ کیفیت رکھتے ہیں مگر یہ اشعار مایوس نہیں کرتے بلکہ ناکامی و مایوسی سے نکل کر زندگی جینے کا سلیقہ دیتے ہیں۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر تقی میرؔ کی مختلف تصانیف ملتی ہیں جن میں کلیاتِ اُردو ، جو چھ دیوان پر مشتمل ہے،کے علاوہ فارسی دیوان،ذکر میر (فارسی میں میر کی سوانح عمری) اور نکات الشعرا (تذکرہ) ہیں۔میرؔ نے غزل کے بعد مثنوی پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ان کی مثنویات میں بطور خاص دریائے عشق، معاملات عشق ،خواب و خیال ، شعلۂ عشق اور جوش عشق قابل ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو میرؔ کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کی ندرت، خوبصورت پیکر تراشی، عصری حسیت، روانی ، سلاست، نغمگی، بے ساختگی، قوت متخیلہ ، امیجری اور اپنے دور کے مسائل کی عکاسی میرؔ کو آفاقی شاعر بنادیتے ہیں۔میرؔ کی شاعری کی عظمت کے سبب انہیں خدائے سخن کہا گیا۔غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، امیر مینائیؔ اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شعرا نے نہ صرف میرؔ کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ ان کا اثر بھی قبول کیا ہے۔غالبؔ نے خود کہا کہ :

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

5.4 مرزااسد اللہ خاں غالبؔ

مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ان کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ابتدا میں اپنا تخلص اسدؔ رکھا مگر بعد میں غالبؔ استعمال کرنے لگے۔غالبؔ کی عرفیت مرزا نوشہ قرار پائی۔والد کا نام عبد اللہ بیگ تھا۔غالبؔ کے سر سے بچپن میں والد کا سایہ اٹھ چکا تھا، اس لیے ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے غالبؔ کی پرورش کی۔مگر غالبؔ ابھی آٹھ سال کی عمر کو پہونچے تھے کہ ان کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔1810ء میں تیرہ سال کی عمر میں غالبؔ کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ 1812ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔غالبؔ کی کوئی اولاد نہ تھی۔سات بچے پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔

غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔دہلی میں جب معاشی تنگی درپیش ہوئی تو غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے یہاں قلعہ میں ملازمت اختیار کرلی۔جہاں بہادر شاہ ظفرؔ نے مرزا غالبؔ کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب عطا کرکے 50 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کرکے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ذوقؔ کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ کو اپنا استاد تسلیم کیا۔1857 کے بعد جب غالبؔ کی سرکاری پنشن بند ہوگئی توان کی زندگی نہایت ہی کس مپرسی میں

گزرنے لگی۔ غالب کی صحت مزید خراب ہوتی گئی۔ مرنے سے ایک روز قبل دماغ پر فالج کا اثر ہوا اور 15 فروری 1869 ء کو وفات پاگئے۔ دہلی کی بستی حضرت نظام الدین میں انہیں دفنایا گیا۔

غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔ نئے نئے موضوعات شامل کیے۔ فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔ غالبؔ زندگی کا اچھا شعور رکھتے تھے۔ غالبؔ نے زندگی کے حقائق اور نفسیات کو بڑی سادگی سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں پھر ان کی گتھیوں کو سلجھاکر انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ غالبؔ تقلید کے قائل نہیں تھے وہ اپنا راستہ خود بناتے تھے۔ انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربے کرکے اس میں وسعت بخشی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ”غالبؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے متنوع موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے“۔

غالبؔ کی شاعری کئی حیثیت سے انفرادیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں طنز و ظرافت، رمز و ایمائیت، نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات اور تصوف کا ذکر بالخصوص پایا جاتا ہے۔ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ ان کی شاعری میں قول محال کا استعمال ملتا ہے، یعنی ایسی بات جو بظاہر درست مفہوم نہ لگے مگر غور کریں تو درست ہو۔ ایک ہی شعر کے کئی کئی معانی نکلتے ہیں۔ لطافت و نکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے۔ انسان دوستی بھی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ذیل میں چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے
یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ — تجھے ہم ولی سمجھتے جونہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ شخصی طور پر ایک اچھے انسان بھی تھے اور شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ انھوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اچھی شاعری کی۔ غالبؔ نے قصیدے بھی لکھے، لیکن دراصل وہ قصیدے کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا رنگ تو غزل میں کھلتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی ، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کو بات کرنے کا انداز آتا تھا۔ وہ ایسی جدت اور ندرت سے کام لیتے تھے کہ بات کچھ کی کچھ ہوجاتی تھی۔ غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ یہ اُن کی شخصیت کا کمال تھا کہ اتنی آفتوں کو سہنے اور ایسے ہولناک مناظر کو دیکھنے کے باوجود انھوں نے

شوخی اور ظریفانہ حس کو برقرار رکھا۔

غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو بھی بلندیوں تک پہونچا۔الغرض غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔اُن کی عظمت کے گُن اُردو شعر و ادب میں ہمیشہ گائے جاتے رہیں گے۔

5.5 دبستان دہلی کے دیگر شعرا

دبستان دہلی کو دو اہم ادوار میں تقسیم کرنے کے بعد دیکھا جائے تو ایک میرؔ کا عہد کہلاتا ہے تو دوسرا غالبؔ کا عہد۔ میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔاور میر سوزؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔اس عہد سے زبان کی اصلاح دینے والے شاہ حاتمؔ اور مظہر جان جاناں ؔ کا تعلق بھی ہے۔اس عہد میں قدیم ہندی و دکنی زبان متروک ہوئی۔اس دور کا سب سے اہم کارنامہ ایہام گوئی کا ترک کیا جانا ہے۔اُردو شاعری جس پر غزل کا قبضہ تھا اس میں قصائد، ہجو، مثنویاں اور مرثیے لکھے جانے لگے۔شعرا کی تعداد بڑھی اور تذکرے بھی لکھے جانے لگے۔غالبؔ کے عہد کے اہم شعرا میں مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔دبستانِ دہلی کے ان شعرا پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالی جارہی ہے۔

5.5.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ:

مرزا محمد رفیع سوداؔ 1706ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص تھا۔والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔مغلیہ سلطنت کے زوال کو انہوں نے مخمس و شہر آشوب کی شکل میں بڑے دلکش انداز میں تحریر کیا ہے۔دہلی کی تباہی کے بعد دیگر کئی شعرا کی طرح وہ بھی لکھنؤ روانہ ہوگئے۔لکھنؤ میں شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں سبھی نے ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کیا۔انہیں ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا۔وہیں 1781ء میں وفات پائی۔

اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔انہوں نے فارسی قصیدہ نگاری کا بغور مطالعہ کیا اوراس کی تمام خصوصیات کو اردو قصیدہ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔قصیدے کے علاوہ ان کی غزلیں، مثنویاں اورمراثی بھی ملتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب یار نے اٹھا کر زلفوں کے بال باندھے
تب میں نے اپنے دل میں لاکھوں خیال باندھے

فکر معاش عشق بتاں یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

نہ کر سوداؔ تو شکوہ ہم سے دل کی بے قراری کا
محبت کس کو دیتی ہے میاں آرام دنیا میں

5.5.2 خواجہ میر دردؔ:

خواجہ میر دردؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔خواجہ میر ان کا نام اور تخلص دردؔ تھا۔موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔دردؔ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبیت و خدا شناسی ہے۔1785ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔دردؔ نے فقیرانہ زندگی گزارنا پسند کیا۔ان کی زندگی کا عکس ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔اُردو کو ابتدا میں ترقی دینے والے چار ستونوں مرزا مظہر جان جاناںؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے ساتھ ان کا شمار کیا جاتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو یہ جوانی پھر کہاں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز
گلا تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نبھائی ہو

5.5.3 میر سوزؔ:

میر سوزؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔محمد میر ان کا نام اور سوزؔ تخلص تھا۔ابتدا میں میرؔ بھی تخلص رکھا تھا مگر میر تقی میرؔ کی شہرت کے باعث سوزؔ تخلص اختیار کرلیا۔دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد اور فیض آباد میں رہائش اختیار کی مگر آخر میں لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔1798-99ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت و صفائی ملتی ہے۔سوزؔ کی محبت اس گوشت پوست کی دنیا کی محبت ہے جس میں ناکامی و کامیابی کی درمیانی کیفیت کا اظہار ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ناکامی کے بعد کی شدت ناپید ہے۔البتہ ان کے یہاں سطحیت بھی نہیں ہے جو محبت میں کامیابی کے بعد ملتی ہے۔ان کے یہاں روز مرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔سوزؔ کے یہاں فلسفہ تصوف بھی نہیں ملتا۔سوزؔ کی شاعری میں سادگی، بے تکلفی و شیرینی ملتی ہے۔سوزؔ کا خاص میدان غزل ہے مگر مثنوی، رباعی اور مخمس میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔سوزؔ کی حیثیت میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے مساوی نہیں ہے مگر دبستانِ دہلی کے ایک اہم رکن کی حیثیت ضرور رکھتے ہے۔چند منتخب اشعار دیکھیے۔

صنم کا وصل جو چاہے تو حائل ہو نہ اے عاشق | غبار جسم اٹھ جاوے تو کچھ حائل نہیں ہوتا
بلبل نے جس کا جلوہ جاکر چمن میں دیکھا | وہ آنکھ موند اپنی ہم من ہی من میں دیکھا
اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہوگیا | آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

5.5.4 مومن خاں مومنؔ:

مومن خاںمومن کی پیدائش 1800ء میں دہلی میں ہوئی۔اصل نام محمد مومن تھا۔والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھاجو دہلی کے مشہور حکیم تھے۔چونکہ مومنؔ کا خاندانی پیشہ طب تھا، اس لیے انہیں بھی طب کی اچھی معلومات ہوگئی تھی۔وہ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔وہ نہایت ہی خوبصورت اور حسین تھے۔مومنؔ کی زندگی کا سب سے دلچسپ حصّہ ان کی حیات معاشقہ ہے۔ان کی شاعری میں عشق مجازی کا پورا رنگ ملتا ہے۔مومنؔ کی وفات 1852ء میں دہلی میں ہوئی۔

مومن خاں مومن کی غزلوں کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت بھی ملتے ہیں، مگر غزل ان کا خاص میدان ہے۔تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کی غزل کی خصوصیات ہیں۔تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کو بھی مومنؔ نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ان کی شاعری میں مکر شاعرانہ بھی پایا جاتا ہے یعنی شاعر بظاہر ایسی بات کرتا ہے جس میں محبوب کے فائدہ کا احساس ہوتا ہے مگر در اصل اس میں عاشق کا فائدہ ہوتا ہے۔عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔وہ عشق کے مختلف جذبات و حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔وعدہ کرنا اور پھر اس کو نہ نباہنا، روٹھنا اور تمنا کرنا کہ کوئی منالے، جذبات نگاری کی جو دلکش تصویرکشی مومن کے یہاں ملتی ہے وہ دیگر شعرا میں کم ملتی ہے۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری | واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا
عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو | کہ شب غم کوئی کس طوربسر کرتا ہے

مومنؔ کی درج ذیل غزل بہت مشہور ہوئی، جو معاملہ بندی کی پوری تصویر کشی کرتی ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومنؔ کے یہاں نازک خیالی، ندرت اسلوب اور شاعرانہ شوخی ملتی ہے۔مومنؔ کی عظمت کا انداز اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ درجِ ذیل شعر کے تعلق سے غالبؔ نے کہا تھا کہ مومنؔ مجھے یہ شعر دے دیں اور میرا دیوان لے لیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

5.5.5 شیخ محمد ابراہیم ذوق:

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ 1790ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوقؔ تخلص تھا۔والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔جب وہ پیدا ہوئے تو دہلی میں شعر و شاعری کا دور دورہ تھا۔انہوں نے بھی بہت کم عمر میں شاعری شروع کردی۔انہوں نے اس عہد کے مشہور استاد سخن استاد نصیر کی شاگردی اختیار کی۔مگر کچھ دنوں بعد ذوقؔ نے اپنی غزلوں پر خود ہی نظر ثانی کرنے لگے اور جلد ہی دہلی کے مشہور شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔وہ نہ صرف شاعری کرنے لگے بلکہ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔وہ بہادر شاہ ظفر کے بھی استاد رہے۔ذوقؔ کو موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔دربار دہلی سے انہیں ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا۔ 1854ء میں دہلی میں ذوقؔ کا انتقال ہوگیا۔

غزل اور قصیدہ ذوقؔ کے خاص موضوعات تھے۔اس کے علاوہ مثنوی، قطعہ، واسوخت بھی تحریر کیے۔ذوقؔ کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی ، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبیٔ محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے حسن تعلیل اور محاورے کو خوب استعمال کیا ہے۔سوداؔ کے بعد قصیدہ میں ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔شیخ محمد ابرہیم ذوقؔ کے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

5.5.6 بہادر شاہ ظفرؔ:

بہادر شاہ ظفرؔ کی پیدائش 1775 ء دہلی میں ہوئی۔ان کا پورا نام ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا۔اسی رعایت سے اپنا تخلص ظفرؔ رکھا۔تعلیم و تربیت قلعۂ معلی میں ہوئی۔بہادر شاہ ظفر اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے وارث مقرر ہوئے۔یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔بہادر شاہ ظفرؔ کی آمدنی کم اور شاہی اخراجات زیادہ تھے۔اس لیے دھیرے دھیرے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔1857 ء کی تحریک انقلاب کی ناکامی کے بعد جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا تھا، بہادر شاہ ظفرؔ کو انگریزوں نے گرفتار کرکے ان پر باغی ہونے کا مقدمہ چلایا۔پھر مجرم ثابت کرکے قیدی بناکر انہیں رنگون بھیج دیا گیاجہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیااور رنگون ہی میں مدفون ہوئے۔
بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری پر دہلی کے ابتر حالات کا اثر نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ذوقؔ کے بعد غالبؔ سے اپنی شاعری پر اصلاح لی۔تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔کلیات میں تیس ہزار کے قریب اشعار ملتے ہیں۔چند اشعار پیش ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

بہادر شاہ ظفرؔ کی پوری زندگی دہلی کے قلعہ معلی میں گزری مگر زندگی کے آخری ایام میں انقلاب 1857ء کے بعد حالات ایسے بدلے کہ انہیں رنگون میں قید کردیا گیا جہاں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔حالانکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ دہلی میں رہیں۔اپنی اس مجبوری کی داستان اپنی شاعری میں تحریر کی ہے۔

5.6 دبستان دہلی کی خصوصیات

دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تواٹھارہویں اور انیسویں صدی میں دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔مختلف حکمرانوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ کیا اس طرح دہلی کئی بار اجڑی اور پھر بسی۔چونکہ شاعر کی شاعری پر اس کے ارد

گرد کے حالات و مسائل کا بھی اثر پڑتا ہے، اس لیے دہلی کے شعرا پر بھی دہلی کے حالات کا اثر پڑا۔دہلی میں رہنے والے میرؔ اور غالبؔ جیسے اہم شعرا کی ذاتی زندگی بھی معاشی اعتبار سے کافی پریشان کن تھی، اس لیے ان کی شاعری پر اس کا مزید اثر ہوا۔یہی وجہ رہی کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ،جس کے سبب دہلی کے شعرا کے یہاں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ و سلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ملتی ہے۔

دہلی کے سیاسی حالات نے ہر شخص کے دل کو گداز اور دردمند بنادیا تھا۔حالات کے نشیب و فراز نے انھیں سادگی پسند اور تکلف و تصنع سے دور رکھا۔زندگی کی سادگی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔میرؔ و سوداؔ سے لے کر انشاؔ و مصحفیؔ کی شاعری میں ہمیں تکلف اور بناوٹ کی جگہ سادگی اور خلوص کا احساس نظر آتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ بازآ   نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نا جائے گا   (میرؔ)

جو ملا اُس نے بے وفائی کی   کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا   (مصحفیؔ)

تیرا جو ستم ہے اُس کی تو جان   اپنی تھی سو خوب کرگئے ہم   (سوداؔ)

جیسا کہ بتایاجاچکاہے کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، وہ اس لیے ہے کہ ان شعرا کا غم صرف اپنی ذات کا غم نہیں تھا بلکہ ایک عظیم الشان تہذیب کے خاتمہ کا غم تھا۔جس کا احساس اور ملک و سماج کی ابتر حالت نے ان کی زندگیوں میں غم و یاس کا زہر گھول دیا۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے   دردو غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا   (میرؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے   (دردؔ)

کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل   انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں   (غالبؔ)

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔تصوف کے اس اثر نے جذبات میں گہرائی اور خیالات میں بلندی پیدا کردی۔چند اشعار دیکھیے۔

ہر سنگ میں شرارہے تیرے ظہور کا   موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا   (سوداؔ)

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر   جدھر دیکھتا ہوں وہی روبہ رو ہے   (دردؔ)

اُردو شاعری کے پورے سرمایہ میں مضامینِ عشق و محبت و ایک غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کواپنی شاعری میں پیش کیا۔انہوں نے لکھنوی شعرا کی طرح اپنی عشقیہ شاعری کو جذبے کی بالائی سطح کے اظہار کا اسیر نہیں ہونے دیا۔انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی

ترجمانی کی۔ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی دل کی تپش اور روح کی بے قراری کا اندازہ اُن کے محبوب کو ہوجائے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں روح کی تڑپ سوز و گداز اور درد و اضطراب کی کیفیت ملتی ہے۔

پاسِ ناموس عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے (میرؔ)

جہاں‌تک دبستانِ دہلی سے وابستہ شعرا کی زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس میں بھی اُن کے مزاج کی سادگی ، صفائی،بے تکلفی او ر بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔وہ دہلی کے روز مرہ محاوروں پر جان دیتے ہیں۔وہ تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔لکھنؤ کے شعرا کی طرح عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے زبان کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ آسان و شیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اس طرح صفائی ، سادگی اور سلاست دبستان دہلی کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے (دردؔ)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے (میرؔ)

وفاکیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑناٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو (غالبؔ)

اس طرح دبستان دہلی کی خصوصیات میں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ و سلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ہے۔بقول نور الحسن ہاشمی ”دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتاد ذہنی، ایک مزاج شعری کا، جسے سمجھنے کے لیے لکھنویت سے قدم بقدم مقابلہ کرنا ہوگا۔“ اس لیے مختصراًدبستان لکھنؤ پرروشنی ڈالی جاتی ہے۔در اصل دہلی کے مسائل سے پریشان ہوکر جب چند شعرا نے آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ کا سفر کیا تو انہیں یہاں کا ماحول بڑا سازگار معلوم ہوا۔یہاں نوابوں کے یہاں دولت کی فراوانی تھی۔جب شعرا کو انعامات اور عزت و احترام ملنے لگا تو آرزو، فغاں، میر حسن، حسرت، مصحفی وغیرہ کئی شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤرہنے لگے۔ان شعرا کے سبب یہاں شعر و شاعری کا ایک ماحول بنا اور چونکہ یہاں معاشی تنگی نہیں تھی اس لیے ان شعرا کی شاعری میں واہ اور خارجیت کے ساتھ ہی معنی کے بجائے لفظیات پر توجہ دی جانے لگی۔محبوب کا سراپا کھلے لفظوں میں پیش کیا جانے لگا۔مشکل سے مشکل تر الفاظ کا استعمال کرنا شاعری کی عظمت شمار کیا جانے لگا۔لکھنؤ کے شعرا دہلی سے اپنی شاعری کو ممتاز کرنے کی غرض سے حد سے تجاوز کرگئے اور واہ، خارجیت اور مشکل الفاظ کے استعمال کو اپنی پہچان بنالی۔

غرض دبستانِ دہلی کی شاعری ہر اعتبار سے عوام و خواص میں بے حد مقبول رہی۔واضح رہے کہ دہلویت سے مراد صرف وہی شعرا نہیں ہیں جو دہلی میں رہے بلکہ وہ شعرا بھی ہیں جو دہلی کے باہر رہے مگر دہلوی انداز شاعری اختیار کی اور ان کی شاعری میں وہ خصوصیات باقی رہیں جن کی وجہ سے دبستان دہلی جانا جاتا ہے۔

5.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے 1707ء میں وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد اس کا لڑکا معظم (بہادر شاہ) اپنے بھائیوں کو قتل کرکے تخت نشیں ہوگیا۔ جیسے ہی اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے بھائیوں کو قتل کرکے 1712ء میں بادشاہت حاصل کرلی۔
- 1713ء میں جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے اس کو شکست دے کر خود شاہی تخت پر قبضہ کرلیا۔ 1719ء میں جب فرخ سیر کو قتل کردیا گیا تو محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ، عالم گیر ثانی، شاہ جہاں ثانی اور شاہ عالم ثانی حکومت کرتے رہے۔
- مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔ بہادرشاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ رہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفرؔ پر 1857 ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم گرفتار کرکے رنگون بھیج دیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔
- اٹھارہویں صدی کے اہم شعرا یعنی میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور میر سوزؔ کی شاعری پر اس کا اثر پڑا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شعرا یعنی غالبؔ، مومن خاں مومن ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری پر بھی ان حالات کا اثر ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر دہلی کی شاعری نے جو خصوصیات اختیار کرلی وہی دبستان دہلی کہلایا۔
- میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔
- خواجہ میر دردؔ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔ سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔
- سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت و صفائی ملتی ہے۔ ان کے یہاں روز مرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔
- غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔ نئے نئے موضوعات شامل کیے۔ فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔ غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔

- غالبؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مومن خاں مومن، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مومن خاں مومن کاغزل خاص میدان ہے۔ تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کے غزل کی خصوصیات ہیں۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ غزل اور قصیدہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ان کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی ، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبی محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔
- دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔
- دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کواپنی شاعری میں پیش کیا۔انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔ دبستانِ دہلی کی زبان و بیان میں بھی سادگی ، صفائی ،بے تکلفی او ر بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

5.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
غنائیت	:	موسیقیت
امیجری	:	تصویر کشی
تصنع	:	دکھاوا ، بناوٹ
ندرتِ اسلوب	:	انوکھا اسلوب
طرزِ بیان	:	بیان کرنے کا طریقہ
تصوف	:	دل سے خواہشوں کو دور کرکے اللہ کی طرف دھیان لگانا
وظیفہ	:	مالی مدد، حکمران اور سرکار سے ملنے والی رقم

5.9 نمونۂ امتحانی سوالات

5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1665 (b)1680 (c)1690 (d)1707

2۔ مغلیہ حکومت کے آخری بادشاہ کا نام کیا تھا۔

(a) بہادر شاہ ظرف (b) شاہ جہاں (c) شہنشاہ اکبر (d) ہمایوں

3۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو گرفتار کرکے کہاں بھیجا گیا تھا ؟

(a) ایران (b) رنگون (c) سعودی عرب (d) بنگلہ دیس

4۔ اکبر شاہ ثانی کس سنہ میں تخت نشیں ہوا ؟

(a) 1725 (b) 1750 (c) 1806 (d) 1820

5۔ ''نکات الشعرا'' کس کا تذکرہ ہے ؟

(a) میر تقی میر (b) مصحفی (c) شیر علی افسوس (d) محمد حسین آزاد

6۔ میر تقی میر کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) محمد علی متقی (b) محمد تقی (c) محمد عابدی (d) محمد میر

7۔ مرزا غالب کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) جون پور (b) کانپور (c) آگرہ (d) دہلی

8۔ ذیل کے کس کا شمار صوفی شاعر میں ہوتا ہے؟

(a) خواجہ میر درد (b) میر تقی میر (c) میرزا غالب (d) میر سوز

9۔ بہادر شاہ ظفر کا تاریخی نام کیا تھا؟

(a) بہادر شاہ (b) سراج الدین (c) ابو ظفر (d) محمد بہادر

10۔ میر تقی میر کا ہم عصر کون نہیں ہے؟

(a) محمد رفیع سودا (b) مرزا غالب (c) خواجہ میر درد (d) میر سوز

5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ غالبؔ کی شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ مومن خاں مومنؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفر میں سے کسی ایک کی شاعری پر روشنی ڈالیں۔

3۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں فرق واضح کریں۔

4۔ خواجہ میر دردؔ کی صوفیانہ شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

5۔ مومن خاں مومنؔ کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5.9.3 طویل مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستان دہلی سے آپ کیا سمجھتے ہیں، خصوصیات بیان کرتے ہوئے وضاحت کریں۔

2۔ میرؔ کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ پیش کیجیے۔

3۔ غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ بیان کیجیے۔

5.10 تجویز کردہ اکتسابی

1۔	دلی کا دبستان شاعری	نور الحسن ہاشمی
2۔	تاریخِ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	میر تقی میرؔ (مونوگراف)	مظفر حنفی
4۔	بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز

5.9.1 کے جوابات:

d۔1	a۔2	b۔3	c۔4	a ۔5
a۔6	c۔7	a۔8	c۔9	b۔10

اکائی 6: دبستانِ لکھنؤ

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر
6.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات
6.4 دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا
6.4.1 شیخ قلندر بخش جرات
6.4.2 انشا اللہ خاں انشا
6.4.3 غلام ہمدانی مصحفی
6.4.4 شیخ امام بخش ناسخ
6.4.5 خواجہ حیدر علی آتش
6.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا
6.6 اکتسابی نتائج
6.7 کلیدی الفاظ
6.8 نمونۂ امتحانی سوالات
6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

دبستان، فارسی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی اسکول و مدرسہ کے ہیں۔ادب میں چار دبستانوں کا ذکر ملتا ہے۔

دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ عظیم آباداور دبستانِ رامپور۔ان میں دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ جب کسی عہد یا علاقے میں وسیع تناظر میں خیال، موضوع، لب و لہجہ وغیرہ میں یکسانیت پائی جانے لگے اور ان ہی بنیادوں پر اس کی شناخت قائم ہو جائے تو اسے دبستان کہتے ہیں۔دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی خصوصیات اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں۔دونوں دبستانوں میں کچھ افتراقات و امتیازات ہیں۔دلی کی شاعری میں آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔یہ کیفیت اُس عہد کے بیشتر شعرا کے یہاں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔دلّی کی زبان میں سادگی ، سلاست اور روانی ایک اہم جزو کی شکل میں موجودہے۔غزلوں میں کرداروں کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے۔رقیب، محبوب، پیامبر، عاشق، مخبر وغیرہ دلّی کی شاعری میں ان کرداروں میں مجموعی طور پر سادگی پائی جاتی ہے۔یہاں شاعر محبوب کے سراپے کے بیان اور عشقیہ اظہار جیسے موضوعات کی وضاحت بھی اشارے کنایے میں کرتا ہے اور اس فنی باریکی کے ہنر سے خوب واقف ہے۔دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔وہاں کی شاعری میں آورد کی کیفیت موجودہے۔اس کیفیت سے وہاں کے شاعروں نے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔اِرادہ کرکے شعر باندھنا بھی ہنر ہے۔صنعتوں کا استعمال، زبان کی صحت پر زور اور صنف ریختی کے فروغ جیسے غیر معمولی کمالات دبستانِ لکھنؤ کے ہی مرہونِ منت ہیں۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- دبستان لکھنؤ کے تہذیبی وسماجی پس منظر کو سمجھ سکیں۔
- دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات مثالوں سے سمجھا سکیں۔
- دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر جرات سے متعلق گفتگو کرسکیں۔
- انشا کے طرز تحریر کے بارے میں سمجھا سکیں۔
- مصحفی کی شاعری کی خصوصیات بیان کرسکیں۔
- آتش کے کلام کی خصوصیات کون کون سی ہیں، حوالوں سے سمجھا سکیں۔
- اصلاح زبان کی تحریک پر روشنی ڈال سکیں۔

6.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر

اُردو ادب کی تاریخ میں دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس کی مضبوط و مستحکم بنیاد سعادت خاں برہان الملک نے رکھی۔اُنہوں نے اودھ میں خودمختار حکومت کی ابتدا کی۔یہ حکومت تقریباً سوا سو سال کی تاریخ پر محیط ہے جس میں شجاع الدولہ ، نواب آصف الدولہ ، سعادت خاں غازی الدین حیدر، نصیرالدین حیدر اور

واجد علی شاہ کے دورِ حکومت شامل ہیں۔ برہان الملک بہادر بڑے دوراندیش انسان تھے۔ وہ صوبے کے کاموں میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔

فیض آباد اودھ کا پہلا دارالخلافہ تھا، لیکن یہ منصوبہ بند طریقے سے نہیں بسایا گیا تھا۔ اس بنگلے کے اطراف و اکناف میں بتدریج ترقی ہوتی جا رہی تھی اور پھر یہ نہایت بارونق اور آبادی سے بھرا پُرا ہوگیا۔ شجاع الدولہ اور اُن کی اہلیہ بہو بیگم نے فیض آباد کو ادبی و ثقافتی اعتبار سے پہچان عطا کیا۔ جب دلی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ' اس وقت متعدد شاعر' فن کار اور مختلف پیشے سے وابستہ پریشان حال لوگوں نے اودھ کا ہی رُخ کیا تھا۔ بعض شاعروں کو شجاع الدولہ نے ازخود اودھ آنے کی دعوت دی تھا اور آنے والوں کو عزت و توقیر عطا کی۔ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے بھی اپنی دانشمندی سے مملکت کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔ ان کے عہد میں فن تعمیر کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ انہیں ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ مہمان نواز اور کھلے دل و دماغ کے شخص تھے۔ انہوں نے آنے والوں کی پذیرائی کی اور انہیں انعامات و اکرامات سے نوازا۔ آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی خاں تھے۔ انہوں نے تقریباً سولہ سال تک تخت و تاج سنبھالا۔ لکھنؤ کی تاریخ میں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کا دور بہترین دوررہا ہے۔ غازی الدین حیدر بھی اودھ کے نواب وزیر رہے ہیں۔ لیکن اِس زمانے کے آتے آتے انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا اور اُن کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اس دبستان کا آخری بادشاہ نواب واجد علی شاہ تھے۔ انہیں فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ انہیں اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سے بھی بہت لگاؤ تھا اور وہ ان دونوں زبانوں میں لکھا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اس آخری تاجدار' واجد علی شاہ کو انگریزوں نے مٹیا برج بھیج دیا۔ اس طرح لکھنؤ کے بادشاہوں کی سخاوت ' آپسی محبت و بھائی چارگی ' ادب دوستی' شاعروں اور دیگر فنکاروں کی قدردانی و سرپرستی کا چراغ جو برہان الملک کے عہد سے روشن تھا وہ واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ 1856 ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

دبستانِ لکھنؤ ہمیشہ سے تہذیب کا مرقع رہا ہے۔ نوابین' امرا و رؤسا اور زندہ دل لوگوں کی آماجگاہ یہ شہر اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ مرکزِ نگاہ رہا ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں یہ بات بڑے دعوے کے ساتھ لکھی ہے کہ "حال خطہ بے نظیر دل پذیر رشک گلشن جنان مسکن حورو غلمان جائے مردم خیز باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز۔ اگر دیدہ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھیے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے' آنکھ بند کرے شعر سنا۔ رضوان بھی جس کا خوشہ چیں ہے وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمین ہے۔" سرور کے اس خیال سے انکار ممکن نہیں ہے۔

کسی بھی شہر کی تاریخ میں وہاں کے بنیاد گزار کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ متذکرہ خطے کے حوالے سے شجاع الدولہ' آصف الدولہ ' غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ وہ فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی اس دلچسپی کی بازگشت ان کے عہد سے عصر حاضر تک سنائی دیتی ہے۔ ہر علاقے کی اپنی اپنی تہذیب ہوتی ہے

جس کے سبب اس علاقے کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔لکھنؤ کی تہذیب کی جھلک وہاں کے لباس ' طرز معاشرت ' غذا' عادات و اطوار میں واضح طور پر ملتی ہے۔مثلاً کڑھائی کیے ہوئے کُرتے' چوڑی دار پاجامے' دوپلّی ٹوپی' ریشمی رومال' مخملی جوتے وغیرہ وہاں کے خاص لباس ہیں۔وہاں کی رضائی گوٹے کنارے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔چکن کا کام ساری دُنیا میں مشہور ہے بلکہ اب تو یہ مخصوص کام لکھنوی ورک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

لکھنؤ کے رہن سہن ' طرز زندگی ' رسومات' عقائد' توہمات وغیرہ منفرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔دبستان لکھنؤ کی شاعری اور نثر میں طوائفوں کا ذکر بھی اکثر و بیشتر ملتا ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہاں کے نوابین اور معتبر لوگوں کے یہاں طوائفوں کو معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ لکھنؤ کے تہذیبی عناصر کا ایک اہم جزو تھیں۔وہ نوجوان لڑکوں کو آداب زندگی اور سلیقہ مندی کی تربیت دیتی تھیں۔مجرے' خواجہ سرا' لونڈیاں اور مامائیں وغیرہ وہاں کے معاشرے کا حصہ تھیں۔ سلام کرنے کا طریقہ' آداب کہنے کا انداز' چھوٹوں کو دعا دینے اور اُن سے شفقت سے پیش آنے میں وہاں کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔لکھنؤ کے بازار' باغات' سڑکیں' چوک وغیرہ بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔

لکھنؤ اہل تشیع کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو جتنی شہرت لکھنؤ میں ملی ،کسی دوسرے شہر میں نہ مل سکی۔وہاں محرم کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔وہاں کے مختلف علاقوں میں امام باڑے موجود ہیں جن میں سے بعض کی تو تاریخی اور ادبی حیثیت بھی ہے۔وہ امام باڑے فنِ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں اور قابل دید ہیں۔لکھنؤ کی تہذیب میں فنونِ لطیفہ کا بھی دخل ہے۔وہاں کے عوام موسیقی' مصوری اور خطاطی کے ساتھ ساتھ کبوتربازی' بٹیر بازی' مرغ بازی وغیرہ میں بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔یہ وہ خصوصیات ہیں جنہیں دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر کہا جا سکتا ہے اور اِسی پس منظر میں وہاں کی شاعری پروان چڑھی۔

6.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

اٹھارہویں صدی دلی اور لکھنؤ کی ادبی دُنیا اور خصوصاً شاعری کے لیے بہت نشیب و فراز کا دور رہا ہے۔اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ میں اُردو شاعری کو خوب فروغ حاصل ہوا۔دوسری طرف دلّی میں بھی اٹھارہویں صدی میں متعدد بلند پایہ شاعر و ادیب موجود تھے۔میر تقی میر' مرزا رفیع سودا' خواجہ میر درد' سوز جیسے قدآور شعرا اس عہد میں شاعری کے گیسوسنوار رہے تھے۔اِن میں سے ہر شاعر یکتا تھا۔لیکن وہاں طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگیں اور وہ دلّی جو عالم میں انتخاب تھا اُسے واقعی لوٹ کر ویران کردیا گیا۔مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس عہد میں وہاں کے شعرا و ادبا کو دلّی کے روح فرسا ماحول نے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ان میں سے بہت سے شعرا نے اودھ جانے کو ترجیح دی۔

لکھنؤ میں شعروادب کے لیے ہر طرح سے ماحول سازگار تھا۔وہاں کے شاعر' ادیب و فنکار سبھی کو بادشاہوں کی

سرپرستی حاصل تھی۔ شجاع الدولہ ' آصف الدولہ' سعادت علی خاں' واجد علی شاہ ادب دوست اور ادب نواز تھے۔ وہ نہ صرف شاعری سے شغف رکھتے تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شاعر تھے۔ واجد علی شاہ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ نیر مسعود نے اپنے ناول "طاؤس چمن کی مینا" میں واجد علی شاہ کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا نقشہ کھینچا ہے اور اودھ کے زوال آمادہ معاشرے کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ دلّی سے جتنے شعرا ہجرت کرکے لکھنؤ پہنچے اُنہیں وہاں ایک اچھا ماحول میسر آیا' دربار تک رسائی ہو گئی۔ وہاں کے نوابین ' امرا و رؤسا نے ان کے شایان شان اُنہیں نوازا۔ وہاں ان شاعروں کو چین و سکون نصیب ہوا۔ وہاں کی فارغ البالی کے ماحول نے ایسے شاعروں کی شعری تخلیقیت کو مزید قوت و توانائی عطا کی جس سے ان کی شاعری کا حسن دوبالا ہو گیا۔

دبستانِ لکھنؤ کی سرزمین ادبی حوالے سے دلّی سے مختلف تھی۔ وہاں کے ماحول اور مزاج میں رنگینی رچی بسی تھی۔ ہر طرف خوشحالی تھی۔ نوابوں کے اپنے اپنے شوق تھے۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی' گھڑسواری کا شوق' تلوار بازی اور بٹیر بازی میں دلچسپی تھی۔ گھنگھرؤں اور پائلوں کی جھنکار گلی کوچے میں سنائی دیتی تھی۔ عیش و عشرت اور داد و دہش کا دور تھا۔ اس ماحول میں جو شاعری ہو رہی تھی ان میں لفظی صنعت گری' زبان کی بازی گری' تصنع و تکلفات' صنعتوں کا استعمال' مشکل پسندی' دور کی کوڑی لانے کی کوشش' حسن و عشق اور محبوب کے سراپا کا بیان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایسے اجزا و عناصر ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری پُر ہے۔ جو شعرا یہاں پہلے سے موجود تھے ان کی شاعری متذکرہ خصوصیات سے مزین ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بات بھی حقیقت ہے کہ دلی سے آنے والے شعرا بھی یہاں کے اسی ماحول میں رفتہ رفتہ ڈھل گئے۔ اس ماحول میں ڈھلنا اُن کے طبعی میلان کے ساتھ ساتھ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ ان کی مجبوری بھی تھی۔ ایسے شعرا بادشاہِ وقت کی خوشنودگی ' دربار تک رسائی اور داد و تحسین' نیز عوام میں کلام کی مقبولیت کا ایک بہترین ذریعہ شاعری میں انفرادیت اور جدت پیدا کرنا سمجھتے تھے۔ اِسی لیے شاعروں نے شعوری اور غیر شعوری دونوں طور پر اس رنگ کو اختیار کرلینے کی کوشش کی تھی۔

ادب کی تمام اصناف میں غزل کو ہر زمانے میں شہرت ملی جس کا موضوع اور دائرہ کار اور مرکز و محور حسن و عشق ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں ان روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ محبوب کے سراپا کا بیان اور اس کی جزئیات نگاری پر زور دیا گیا ہے تاکہ لطف و انبساط کا ذریعہ بن سکے اور اسی سبب بعض دفعہ فحش اور ابتذال جیسی باتیں بھی شاعری میں در آتی تھیں۔ غزل کی مقبولیت کا یہ عالم رہا ہے کہ معروف ادیب رشید احمد صدیقی نے اسے اُردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ ابتدائی دنوں میں غزل میں عشق کی کیفیات اور قلبی واردات' جذباتی کیفیات کا اظہار ہوتا تھا۔ غزل اپنے اصطلاحی معنوں میں اس صنف سخن کو کہا جاتا ہے کہ جس میں عورتوں سے باتیں کی جائیں یا اس کے بارے میں باتیں کی جائیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس

کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ دُنیا کی بے ثباتی 'معاشرے کے جیتے جاگتے واقعات' بہار کے موسم' گرما کی شدت وغیرہ جیسے موضوعات بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ عہد حاضر میں تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس کے تعلق سے غزل کے شعر نہ کہے گئے ہوں۔ آج ہر موضوع پر غزل کہی جا رہی ہے۔

دبستانِ لکھنؤمیں اُردو کی ایک اور شعری صنف "ریختی" کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس صنف کی ابتدا دکن میں ہاشمی بیجا پوری سے ہوتی ہے اور لکھنؤ میں رنگین اس جانب متوجہ ہوئے۔ رنگین کے ساتھ انشا بھی تھے۔ رنگین کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ اِس صنف میں عورتوں کی زبان میں شاعری کے ساتھ ساتھ اس کے دُکھ درد ' نفسیات و کیفیات ' عورت کے ناز و ادا اور اس کی نشست کے آداب وغیرہ کی مکمل عکاسی کی جاتی ہے تاکہ مکمل شبیہ اُبھر سکے۔ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ ریختی مرد حضرات ہی نے لکھی ہے۔ یہاں تک کہ دربار میں بھی اُنہوں نے ہی پیش کی ہے۔ ایسے شعرا عموماً نسوانی لب و لہجے اور انداز و ادا کے ساتھ نسوانی لباس بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ مثال دیکھیے:

اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں مردوں پر جو جان کھوتی ہیں (شوق لکھنوی)

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں (انشا)

ابتدا سے ہی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ صنعتوں کا استعمال شاعری میں حسن پیدا کرتا ہے۔ دبستان لکھنؤ میں بھی اس کا کثرت سے استعمال کیا گیا۔ تشبیہ' استعارے' مجاز مرسل' مراۃ النظیر' لف و نشر وغیرہ صنعت کی قسمیں ہیں۔ ایہام بھی ایک صنعت ہے۔ ایہام کے معنی وسوسہ پیدا کرنا ہے۔ اس میں کسی لفظ کو شعر میں اس طرح برتا جاتا ہے کہ اُس سے دو معنی نکلتے ہوں۔ اس طرح قاری ایہام کا شکار ہوجاتا ہے کہ آیا شاعر نے کون سے معنی مراد لیے ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری میں صنعت ایہام کا استعمال ایک فن تصور کیا جاتا تھا۔ وہاں کے شعرا ایہام سے شاعری میں فضا قائم کرتے تھے۔ ایسے ایسے ذومعنی الفاظ تلاش کرکے شاعری میں استعمال کرتے کہ حسن میں اضافے کے ساتھ ساتھ لطف کا سامان مہیا ہو جائے۔ دبستانِ لکھنؤ میں اسے ہنر اور کمال تصور کیا جاتا تھا لیکن جب کوئی بھی چیز حد سے تجاوز کرجائے تو اس میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری بھی تکلفات کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ اُسی عہد میں ناسخ اور مرزا مظہر جان جاناں نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی۔ اُنہوں نے زبان کی صفائی پر زور دیا۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا۔ قواعد کے مطابق زبان کی اصلاح کی اور نئی نئی بندشیں اور تراکیب ایجاد کیں۔ اِنہیں دبستانِ لکھنؤ میں ایک منفرد مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ دبستانِ لکھنؤ میں ایک طرف منفرد لب و لہجے کی شاعری ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف اسی دور میں مرثیے کی ایک صحت مند روایت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ وہاں حمد' نعت' منقبت وغیرہ بھی کہے جا رہے تھے۔ میرانیس اور دبیر نے مرثیے اور رباعی کو بام عروج تک پہنچایا بلکہ اُس کے لیے سازگارماحول بھی بنایا۔ ان کے یہاں دل و دماغ کی پاکیزگی اور خراج عقیدت پیش کرنے کا جذبہ تھا۔ مرثیے کو ثواب کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں واقعات کربلا اور شہدائے کربلا کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے جس سے ایک روحانی فضا قائم ہوتی ہے۔ انیس و دبیر اس دور کے اہم مرثیہ گو تھے۔

دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات اور اہمیت دبستانِ دہلی کے مدمقابل قدرے کم تسلیم کی جاتی ہے لیکن یہ حقیقت

ہے کہ لکھنوٗ کی شاعری نے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ یہاں کے شعرا نے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے نئے نئے تراکیب ایجاد کیے' مشکل ردیف و قوافی میں شاعری کی' الفاظ کا مختلف انداز سے استعمال کیا' خارجی کیفیات و احساسات کے بیان پر کافی زور دیا۔امرا و روٴسا اور نوابوں کو خوش کرنے کے لیے قصد کرکے شاعری کرتے تھے جس سے اُن کی مشق سخن جاری رہی۔اپنی اِس صلاحیت پر وہ نازاں و فرحاں رہا کرتے تھے۔آتش نے بجا کہا ہے :

بندشیں الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش نے الفاظ کی مرصع سازی کوایک فن مانا ہے۔شاعری میں الفاظ ایسے ہی جڑے جاتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگوں کو جڑا جاتا ہے۔اِس فنکاری سے دبستانِ لکھنوٗ کے شعرا بحسن و خوبی واقف تھے اور عمل پیرا بھی تھے۔یہ اس دبستان کا خاصا بن کر رہ گیا تھا۔ دبستانِ لکھنوٗ میں زبان کی نفاست و نزاکت پر زور دیا گیا ہے۔اِس دبستان کے شعرا کو بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی اور معاشرہ خوشحال تھا۔اسی لیے وہاں شاعروں کو خوب پھلنے پھولنے اور اپنے کمالات کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔وہاں شاعری میں غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی اور مرثیے کو بھی خوب شہرت حاصل ہوئی۔

6.4 دبستانِ لکھنوٗ کے اہم شعرا

6.4.1 شیخ قلندر بخش جرأت:

شیخ قلندربخش جرأت کا اصل نام یحییٰ امان تھا۔جرات اُن کا تخلص تھا۔وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ان کے خاندان کے لوگ مغل دربار میں خدمات انجام دیا کرتے تھے۔والد کا نام حافظ امان تھا۔وہ خوددار اور خداترس انسان تھے۔اورنگ زیب کے انتقال کے کچھ برسوں بعد جب نادرشاہ نے دلی پر حملے کیے اور حد درجہ تباہی و بربادی مچادی تب دلی اُجڑ سی گئی۔ نادر شاہ کے حملے کا ذکر کتابوں میں تاریخی سانحے اور ایک سیاہ باب کی طرح ملتا ہے۔اس حملے کے دوران جرات کے والد بھی مارے گئے۔جرات بے سر وساماں ہوگئے۔مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔جرات کا شعر و شاعری سے طبعی میلان تھا۔وہ ابتدا میں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔جرات کو حسرت سے بہت عقیدت تھی۔وہ ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔شاعری کے علاوہ جرات علوم نجوم سے واقف تھے۔موسیقی سے بھی دلچسپی تھی اور ستار بھی اچھا بجایا کرتے تھے۔لیکن اُن کی شہرت و مقبولیت بحیثیت شاعر ہوئی۔جرات کی جوانی میں ہی دونوں آنکھوں کی روشنی چلی گئی جس کا قلق اُنہیں عمر بھررہا۔مرزا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنوٗ چلے آئے اور دربارسے وابستہ ہوگئے۔لکھنوٗمیں انشاو مصحفی کا طوطی بول رہاتھا۔جرات سے اُن کے معرکے شروع ہوگئے اور ان معرکوں اور مقابلوں کے باوجود جرات نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرلی۔

جرات مزاجاً بڑے رنگین تھے۔انہیں زبان پر بھی قدرت تھی۔لہٰذا وہ جذبات و کیفیات کا بیان بڑے عمدہ طریقے سے کرتے تھے۔روانی اور بے ساختگی ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی تھی۔موضوع کے اعتبارسے اُن کا مرکز و محور عاشقانہ تھا۔کبھی کبھی عشق کے بیان میں اتنی شدت اور گہرائی پیدا ہوجاتی تھی کہ وہ فحش نگاری تک پہنچ جاتی تھی۔جرات کی شاعری

میں معاملہ بندی کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔جرات کے استاد جعفر علی حسرت کے یہاں بھی یہی خصوصیت ملتی تھی لیکن جرات اُن سے بھی آگے نکل گئے۔

جرات کی زندگی کا خاصہ حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ان کی شاعری دبستانِ لکھنؤ کی شعری خوبیوں سے مملوو مزین تھی۔ جرات کا محبوب تخیلاتی و تصوراتی نہ ہوکر حقیقی تھا۔اُنہوں نے غزلیں،مثنویاں،مرثیے اور قطعات یادگار چھوڑے ہیں۔

6.4.2 انشا اللہ خاں انشا:

انشاء اللہ خاں انشا 1756ء میں مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔شاہ عالم ثانی کے زمانے میں اپنے والد ماشا اللہ ،کے ہمراہ دلی تشریف لائے۔انشا کافی پڑھے لکھے انسان تھے۔بلاکے ذہین،بذلہ سنج اور حاضر جوابی میں یکتاتھے۔وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ترکی،بھاکا،فارسی ،سنسکرت وغیرہ زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ انشا بڑے ہی ہنسوڑ قسم کے انسان تھے۔وہ کسی بھی محفل میں بلاتکلف اور بغیر کسی مصلحت کے کچھ بھی کہہ جاتے تھے۔جو دل میں آتا اُسے کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔وہ جب دلی میں تھے اس وقت بھی انشاکی اپنے معاصرین سے سردجنگ چلتی رہتی تھی۔انشا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے۔یہاں مصحفی پہلے سے موجود تھے۔دونوں میں نظریاتی اختلاف شروع ہوگیا اور حددرجہ تلخی پیدا ہوگئی۔مصحفی وہاں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔لیکن انشا نے بھی اپنی ذہانت سے سبھوں کو قائل کرلیا اور دبستانِ لکھنؤ کی دُنیائے شاعری پر چھاگئے۔انشا کی سعادت علی خاں کے دربار تک رسائی ہوگئی۔

سعادت علی خاں انشا کے لطیفے اور ان کی ذہانت کے اتنے قائل ہوگئے کہ انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔انہیں وہ وقاراور سہولتیں عطا کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔انشا اپنی اس عزت افزائی اور وقار کو سنبھال نہ سکے۔وہ اکثر حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔کبھی کبھی لطیفوں اور گفتگو کے درمیان ایسی مثالیں دے دیتے کہ وہ سعادت علی خان کی ناراضگی کا باعث ہو جاتا تھا۔رفتہ رفتہ یہ ناراضگی تلخی میں بدل گئی۔انہیں دربار سے ملنے والی سہولتوں اور بادشاہ کی کرم فرمائیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔انشا کا آخری وقت بہت عسرت میں گزرا۔انشا کی شاعری ان کے ذاتی مزاج اور لکھنوی شاعری کی خصوصیات سے مزین ہے۔کلام میں سادگی کی جگہ زندہ دلی ہے۔وہ ایسی فضا قائم کرتے تھے جہاں ہنگامہ اور حرکت ہو۔انشا سوزوگداز کے شاعر نہیں تھے۔وہ زندگی کو جینے کے قائل تھے۔جب وہ لکھنؤ پہنچے تو وہاں کی شاعری پورے آب و تاب اور شباب پر تھی۔لکھنوی شاعری کا وہ انداز،وہاں کا عیش و نشاط،محبوب کا سراپا اور معاملہ بندی کا بیان انشا کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔انشا دربار تک رسائی اور معاصر شاعروں سے معرکے کے سبب بھی ہمیشہ تذکروں میں رہے۔ان کے زمانے میں لوگ اور بالخصوص معا صر شعرا ان پر رشک کیا کرتے تھے۔لیکن اعتدال نہ ہونے کے سبب انہوں نے سب کچھ کھو دیا۔

انشا بیک وقت شاعر اورنثر نگار دونوں تھے۔انہوں نے اردو قواعد کی کتاب" دریائے لطافت "کے نام سے لکھی۔انہوں نے دو داستانیں" رانی کیتکی کی کہانی "اور "سلک گوہر "لکھیں۔دونوں ہی داستانوں میں انہوں نے عام روش سے

ہٹ کر جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"سلک گوہر "بغیر نقطے کی داستان ہے یعنی پوری داستان میں ایسا کوئی بھی حرف استعمال نہیں کیا گیا ہے جس میں نقطہ آتا ہو۔"رانی کیتکی کی کہانی "خالص بھاشا میں لکھی گئی ہے۔اردو کی یہ داستان عربی و فارسی کے الفاظ سے عاری ہے۔

6.4.3 غلام ہمدانی مصحفی:

مصحفی کے تخلص سے مشہور اس معروف شاعر کا اصل نام غلام ہمدانی تھا۔وہ 1750 عیسوی میں امروہہ ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔اٹھارہویں صدی کی پانچویں،چھٹی دہائی مغل سلطنت کے زوال اور شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔مصحفی بچپن ہی میں دلی چلے آئے تھے۔یہاں انہیں ادبی ماحول ملا۔مصحفی نے دلی میں رہتے ہوئے عربی اور فارسی زبان پر دسترس پیدا کی۔عمر کے ساتھ ساتھ شاعری میں دلچسپی کا اضافہ ہوا،محفلوں اور مشاعروں میں جانا بھی شروع کر دیا۔مصحفی کو کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا۔جب دلی کے حالات بدل گئے اور شعرا نے لکھنو کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کر دیا تو مصحفی نے بھی دلی کو خیرباد کہتے ہوئے پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔یہاں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔جب مصطفی لکھنؤ آئے اس وقت انشا اور جرات وہاں پہلے سے موجود تھے۔مصحفی کی انشا سے ان بن رہنے لگی جو لکھنو کی شاعری کی طرح ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بن گئیں۔دونوں ہی شعرابہت مشہور تھے اور ان کی شاعری کو پسند کرنے والوں اور شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔آئے دن ان کے مداحوں اور شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔اساتذہ کی چشمک مداحوں اور شاگردوں میں منتقل ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کرنے لگے۔محمد حسین آزاد نے "آب حیات "میں دونوں شاعروں کے اختلافات کا ذکر خوب کیا ہے۔ایسے بلند پایا شعراکے درمیاں چشمک اور تہذیب کی حدود کو عبور کرتی ہوئی سطحی باتیں،ان کی عظمت اور عزت و وقار کو کم کرتی تھیں۔مصحفی آخر وقت تک لکھنؤ ہی میں رہے اور 1824 ء میں یہیں ان کا انتقال ہوا۔

مصحفی بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ بہترین تذکرہ نگار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔انہوں نے فارسی شعرا کے تذکرے "عقد ثریا" کے نام سے رقم کیا اوردو تذکرے شعرائے اردو سے متعلق لکھے جو "ریاض الفصحا "اور "تذکرہ ہندی " کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

مصحفی قادر الکلام اور زود نویس شاعر تھے۔انہوں نے کثیر تعداد میں غزلیں کہی ہیں۔معاشی تنگی کی وجہ سے وہ اپنی غزلیں معاوضہ لے کر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔انہیں دلی اور لکھنؤ کے درمیان کا پل بھی کہا جاتا ہے۔اس لیے کہ ان کے یہاں دلی کی شاعری کی خصوصیات بھی ملتی ہیں اور لکھنوی شاعری کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔اس عہد میں دلی میں میر،سودا،درد،سوز وغیرہ چھائے ہوئے تھے جن کے یہاں شاعری داخلیت یعنی داخلی کیفیات سے پر ہے۔اس دور کی دلی کی شاعری تغزل سے بھرپور ہوتی تھی۔دوسری طرف دبستانِ لکھنؤہے جہاں خارجیت اور تصنع و تکلفات موجود ہیں۔لکھنو کی

شاعری ان خصوصیات سے بھری پڑی ہے۔اس کی بھرپور نمائندگی انشا،جرات اور رنگین کر رہے تھے۔مصحفی کو دونوں دبستانوں سے سروکار رہا۔مصحفی ماضی کی یاد لیے حال میں جی رہے تھے اور اس ماضی و حال کے درمیان انہیں ایک نئی راہ اختیار کرنی تھی جو منفرد بھی ہو اور ممتاز بھی۔مجنوں گورکھپوری کا یقین ہے کہ مصحفی کی شاعری میں کئی شعرا کے کلام کی خصوصیات موجود ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "مصحفی بڑے پر گو شاعر تھے۔ان کا کلام بہت سی خصوصیتوں کا حامل ہے جس میں سودا کی شوکت الفاظ، میر کا سوز و گداز، درد کی شگفتگی،فغاں کی رنگینی،انشا کی ترکیب الفاظ اور جرات کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔انہوں نے اپنی غزل کی بنیاد خلوص اور محبت پر رکھی ہے۔"(مصحفی اور ان کی شاعری،ص15مشمولہ ولی سے آتش تک'مرتبہ ایم حبیب خاں)

6.4.4 شیخ امام بخش ناسخ:

امام بخش نام تھا اور ناسخ تخلص فرماتے تھے۔ان کے والد شیخ خدا بخش تجارت کی غرض سے لاہور سے اودھ آئے اور یہیں ناسخ کی پیدائش ہوئی۔ناسخ متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام تھا۔یہ بہت لمبے چوڑے انسان تھے جنہیں کھانے کا بہت شوق تھا۔انہیں آم سے بہت رغبت تھی۔باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ناسخ بنیادی طور پر اصول پسند انسان تھے۔جب لکھنؤ دارالخلافہ بن گیا تو فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔شعر و شاعری سے انہیں ابتدا ہی سے شغف تھا،لیکن خود ہی مشق سخن کیا کرتے تھے۔کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔ناسخ نے جب شاعری کی ابتدا کی اور رفتہ رفتہ مشاعروں میں جانے لگے تو جلد ہی بہت مقبول ہو گئے۔شہر کی مشہور و معروف شخصیات نے ان کی شاگردی قبول کی۔ناسخ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔وہ کبھی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ان کے معاصر آتش تھے جن سے ان کی معرکہ آرائی تھی۔ناسخ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ان کی شناخت دو حیثیتوں سے ہے۔شاعری اور اصلاح زبان کی کوششوں کے حوالے سے۔لکھنو کی شاعری میں جو خصوصیات موجود تھی وہ کسی حدتک ناسخ کے یہاں بھی موجود ہیں۔البتہ تصنع اور صنعتوں کا کثرت استعمال ناسخ کی شاعری کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔بقول احتشام حسین "غزل میں جو جذباتی اقبال اور سوزوگداز ہوتا ہے وہ نہ صرف کہ یہاں بہت کم ہے۔"جذباتی ابال اور سوزوگداز کی کمی کے باوجود ناسخ کی غزلیں لفظی شان و شوکت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔انہوں نے کبھی کسی کی شان میں قصیدے نہیں لکھے۔ناسخ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے اور استاذ الاساتذہ کہلاتے تھے۔

ناسخ کا اہم کارنامہ اصلاح زبان کی تحریک ہے۔وہ اس کے موجد کہلاتے ہیں۔انہوں نے زبان کی تذکیروتانیث اور قواعدکا تعین کیا۔ہندی کے ثقیل الفاظ خارج کرکے اردو زبان کو صحت وسلاست اور روانی عطا کی۔ناسخ کے زمانے میں دبستان لکھنو کی شاعری کا جو انداز تھا'ناسخ نے اس سے منفرد ایک ایسا طرز ایجاد کیا جس سے لکھنؤکی ادبی دنیا مزید مستحکم ہوگئی۔ناسخ

نے اردو زبان کے لیے جو اصول و قواعد وضع کیے وہ خود بھی ان اصولوں پر ہمیشہ کار بند رہے۔یہی اصول کی پابندی ان کی شاعری کے اڑان اورپروازمیں حارج ہوجاتی ہے۔زبان کی صفائی کے سبب شاعری میں پابندی سی لگ جاتی ہے اور شاعر خیال بندی کے بجائے قوائد و مفاہیم کا شکار ہو جاتا ہے۔

6.4.5 خواجہ حیدر علی آتش:

خواجہ حیدر علی نام اور آتش تخلص تھا۔آتش کے بزرگوں کا وطن بغداد تھا مگر ان کے آباو اجداد دلی منتقل ہوگئے تھے۔والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔آتش اپنے والد کے ہمراہ نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد چلے آئے۔وہ جب کم عمر ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔والد کے انتقال کی وجہ سے ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔آتش کی دوستی کچھ ایسے لڑکوں سے ہوئی ہے جو امرا ورئوسا کے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی دوستی کی وجہ سے آتش کی زبان کافی نکھر گئی۔وہ عربی و فارسی زبان کی درسی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے تاکہ اس میں مہارت پیدا کرسکیں۔اس زمانے میں فیض آباد میں ”سپاہ گری “اور ”تلوار بازی “کا بھی شوق پایا جاتا تھا۔آتش نے بھی ان کی تربیت حاصل کی اور مہارت پیدا کرلی۔معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ وہ ”تلوار یے“ کے نام سے مشہور ہوگئے۔وہاں کے رئیس محمد تقی خاں سے آتش کی ملاقات ہوئی۔وہ آتش کی شاعری سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے یہاں ملازمت پر رکھ لیا۔غازی الدین حیدر کے زمانے میں محمد تقی حافظ آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگئے۔آتش بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔اس وقت وہاں جرات، انشا، مصحفی ،رنگین وغیرہ شاعری کی دنیا پر راج کررہے تھے۔انشا و مصحفی کی معرکہ آرائیاں شباب پر تھیں۔آتش نے بعض معنوں میں مصحفی کارنگ اختیار کیا اور ان ہی کی شاگردی قبول کی۔رفتہ رفتہ آتش کی ایک منفرد پہچان بن گئی اور ان کا شمار لکھنؤکے مشہور شعرا میں ہونے لگا۔

آتش کے مزاج میں توکل تھا۔مال و دولت سے بے نیاز رہے۔دربار تک رسائی کی تگ ودو یا امرا و رئوسا سے قربت کی کوشش انہوں نے کبھی نہیں کی۔نہ کسی کے لیے قصیدے لکھے۔قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے جہاں آسائش کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔امیروں کے بجائے غریبوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔شاعروں کی سیاست اور سماجی ہنگامہ خیز باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔اودھ کے دربار سے انہیں 80روپے ماہوار ملتے تھے۔اسی میں گزر بسر کرتے تھے۔ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ان میں رند، صبا ،وزیر اور نسیم نے خوب شہرت پائی۔آتش کے معاصر شاعروں میں ناسخ بھی تھے جن سے ان کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی لیکن دونوں کو ایک دوسرے کا پاس و لحاظ بھی تھا۔خصوصاً آتش ناسخ کا باقاعدہ ادب کیا کرتے تھے۔ان کی معرکہ آرائی کی ادبی ،تہذیبی اور اخلاقی حدیں تھی۔

آتش کے کلام کے موضوعات میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے ان کی شاعری میں رنگا رنگی تنوع اور تہہ داری پائی جاتی ہے۔لیکن بنیادی طور پر ان کی شاعری میں عشق ،تصوف اور بنی نوع انسان کی بقا کا تصور ملتا ہے۔اُردو شاعری میں عشق

کے موضوعات ابتدا ہی سے ملتے ہیں۔دبستانِ لکھنو کی شاعری میں یہ رنگ اور بھی گہرا ملتا ہے۔آتش نے اس روایتی انداز کو اختیار کیا۔

حالانکہ خلیل الرحمن اعظمی کہتے ہیں کہ"آتش کے بہترین کلام پر بھی خارجیت کا رنگ بہت گہرا ہے لیکن یہ خارجیت اس خارجیت سے بہت مختلف ہے جس کے لیے اہل لکھنؤ بد نام ہیں۔"

آتش کی شاعری لکھنؤ کی پر تکلف اور پر کشش ماحول میں پروان چڑھی تھی۔اس میں مزید نکھارنے اور سنوارنے کا کام آتش کے استاد مصحفی نے کیا۔آتش کی غزل میں محبوب کا سراپا 'انداز وادا'اور اس کے جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

آتش کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی گہرا ہے۔وہ قناعت پسند صبر و شکر کرنے والے اور درویشانہ مزاج کے مالک تھے۔ان کی شخصیت میں ٹھہراؤاور پختگی تھی۔کسی بھی بڑی شخصیت سے وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ان کی اپنی ایک دنیا آباد تھی جس میں وہ بہت خوش اور مطمئن تھے کہتے ہیں:

بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں　　　بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا

بوریئے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر　　　چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار

بادشاہی سے فقیری اور تخت سلیماں کے بجائے بو ریا کو اہمیت دینا آتش کی شاعری کے صوفیانہ رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔آتش نے عام روش سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اس طرح دبستان لکھنؤ کے سرمایہ سخن میں بیش بہا اضافہ کیا اور آنے والے شعرا کے لیے راستے ہموار کیے۔آتش کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔اس میں ہر مذہب وملت کی شمولیت تھی۔وہ انسانیت کے قائل تھے۔اُن کی شاعری میں اخلاق' انسانی مسائل' آپسی میل جول اور بھائی چارے کا ذکر بار بار آتا ہے۔آتش کے شاگردوں میں دیاشنکر نسیم'وجے دیال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اپنی مثنوی کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر خواجہ حیدر علی آتش کا انتقال1846ء میں ہوا۔

6.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا

دبستانِ لکھنؤ کے مشہور و معروف شعرا میں انشا ' مصحفی' ناسخ و آتش وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ادب میں ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف کیا جاتا رہے گا۔ایسے شعرا کو بقائے دوام عطا کرنے والے ان کے شاگرد رشید بھی ہوتے ہیں۔ناسخ کے تلامذہ میں وزیر' برق' رشک وغیرہ اہم نام ہیں۔وزیر لکھنؤ کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔وہ دُنیاوی و مادی چمک دمک سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔امرا' روٗسا اور نوابین وغیرہ کی قربت اور مہربانیوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔واجد علی شاہ نے انہیں اپنے یہاںآنے کی دعوت دی تھی لیکن اُنہوں نے اُسے نظر انداز کردیا۔وہ ناسخ کے زبردست حامی تھے۔ناسخ کے بنائے ہوئے اصلاح زبان سے متعلق اصول و قواعد کی پیروی بھی کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اس

کی تقلید کی۔اُن کا انتقال 1853 ء میں ہوا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان مرتب نہیں کیا تھا۔ بعد میں ان کے شاگردوں نے ان کی غزلیں اکٹھا کرکے دیوان کی شکل میں شائع کیا اور اس کا نام دفترِ فصاحت رکھا۔ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نا مہرباں، کل مہرباں ہو جائے گا

رشک آنا سخ کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں زبان، قواعد، لفظیات، محاورے وغیرہ پر خاص غوروفکر کیا کرتے تھے۔رشک کی شاعری ان خوبیوں سے بھری پڑی ہیں لیکن شاعری صرف انہیں اوصاف کی متقاضی نہیں ہوتی ہے۔ ہر صنف کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔رشک کی غزلوں میں ایجاز و اختصار اور رنگینی و دلکشی کی کمی کھٹکتی ہے۔ غزلوں میں نزاکت اور سوز و گداز کو بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ترنم و روانی بھی غزل کو مزید حسن عطا کرتی ہے۔اور یہ تمام وہ خصوصیات ہیں جو غزل کو مقبولِ عام سے خاص بنا دیتی ہیں۔رشک کی غزلوں میں ان خصوصیات کی واضح کمی نظر آتی ہے۔اُن کی وفات 1867 ء میں ہوئی۔

خواجہ حیدرعلی آتش کے بھی متعدد شاگرد تھے جن میں سے رند، شوق لکھنوی اور دیا شنکر نسیم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نسیم کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔1812 ء میں پیدا ہوئے۔ نسیم نے ابتدا میں غزلیں کہی تھیں۔ایک شعر دیکھیے:

اب درد جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے
وہ جوش جو برسوں مرے سینے میں نہاں تھا

نسیم کی غزلیں اب بہت کم ملتی ہیں۔ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں محض مثالیں ہی بن کر رہ گئی ہیں۔ نسیم اُردو کے علاوہ فارسی زبان کے اچھے واقف کار تھے۔اُنہوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ان کی غزلیں بھی فن کے اعتبار سے بھرپور تھیں لیکن وہ اپنی شاہکار مثنوی ”گلزار نسیم“ کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں۔ گلزار نسیم ابتدا میں کافی طویل تھی۔ نسیم اسے اپنے استاد آتش کے پاس لے گئے اور آتش ہی کے مشورے سے اُنہوں نے اسے مختصر کردیا۔ گرچہ اس میں تشبیہ و استعارے کا خوبصورت و برمحل استعمال اور رعایت لفظی کا التزام کیا گیا ہے مگر اس مثنوی کی نمایاں خوبی ایجاز و اختصار بن گئی۔ بقول رشید حسن خاں:

”اختصار (واقعات اور الفاظ دونوں کا) رعایت لفظی کی مدد سے معنویت کی پیکر تراشی،
بندش کی چستی، جس کے فیض سے اشعار کی روانی، ضرب الامثال سے چشمک زنی کرتی

ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کے علاوہ تشبیہوں اور استعارات کی ندرت بھی اس مثنوی
کی ایک خاص صفت ہے۔"   (مثنوی گلزار نسیم' معیاری ادب۔ ص8)

توتا کا شجر پر آنا اور پھل کھا کر انسانی شکل اختیار کرلیناانتہائی کم سے کم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔اس سے کہانی کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ملتی ہے۔گلزارنسیم طبع زاد مثنوی نہیں ہے۔یہ کہانی پہلے فارسی زبان میں نثر میں تھی۔نہال چند لاہوری نے اسے اُردو میں ترجمہ کیا جسے بعد میں دیاشنکر نسیم نے نظم میں ڈھال دیا۔اس بلند پایہ مثنوی نگار کی وفات 1844 ء میں ہوئی۔

لکھنو کے ایک اور اہم شاعر میر حسن ہیں جو میر غلام ضاحک کے صاحبزادے تھے۔ضاحک دلی کے متوطن تھے۔میر حسن کی پیدائش بھی دہلی میں ہی ہوئی تھی لیکن جب اٹھارہویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں مرہٹوں اور جاٹوں نے دہلی میں تاراجی پھیلا دی تب دہلی کے دیگر شاعروں کی طرح میر غلام ضاحک کو بھی اپنے فرزند کے ساتھ لکھنؤ آنا پڑا۔اس وقت میر حسن کی عمر محض تیرہ برس تھی۔میر حسن کے فرزند میر خلیق تھے اور خلیق کے فرزند میر انیس تھے۔خلیق نے تاعمر مرثیہ ہی لکھا اور انیس نے مرثیہ نگاری کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

میر حسن نے مرثیے' قصیدے' غزلیں' مثنویاں اور تذکرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔لیکن میر حسن ہمیشہ اپنی مثنویاں خصوصاً گلزار ارم اور "سحرالبیان" کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔سحرالبیان ان کی آخری مثنوی ہے جسے ان کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا حاصل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔اس مثنوی کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔سادہ بیانی' جذبات نگاری اور جزئیات کی عکاسی اس کی اہم خصوصیات ہیں۔آزاد اپنی مایہ ناز کتاب آب حیات کے دور چہارم میں یوں رقمطراز ہیں:

"میر حسن مرحوم نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان' فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا جیسے آبِ رواں۔اصل واقعہ کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا اور انہیں باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔باوجود اس کے اصول فن سے بال بھر ادھر یا اُدھر نہ گرے۔قبول عام نے اسے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں نے دل و زبان کے حوالے کیا۔اس نے خود اس اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام جو حرف بھی نہ پہچانتے تھے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔ارباب نشاط نے محفلوں میں اس کی نغمہ سرائی کرکے لوگوں کو رُلایا۔"

(آب حیات، ص243-44)

سحرالبیان 1784 ء میں لکھی گئی۔دلّی میں میر حسن کی خواجہ میر درد سے قربت رہی اور لکھنؤ میں میر ضیا سے شاعری پر مشورہ لیا کرتے تھے۔دبستانِ لکھنؤ کی شاعری جن خصوصیات کی وجہ سے جانی جاتی ہے ' سحرالبیان میں اس کا اثر کم

ہی نظر آتا ہے۔ذومعنویت اور صنعتوں کے کثرتِ استعمال کی بجائے اُس میں سادگی ' سلاست اورروانی موجود ہے جو دبستانِ دہلی کا طرہ ٔامتیاز ہیں۔البتہ سحر البیان کی مرکزی کردار بدر منیر لکھنؤ کے نوابی گھرانوں کی نسوانی کردار کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔بے نظیر کا کردار بھی اِسی نوعیت کا ہے۔مثنوی کا اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو ان دونوں کردار وں میں حرکت و عمل کا فقدان نظر آتا ہے۔لیکن حقیقت میں یہ لکھنؤ کے ایسے ماحول کے پروردہ کردار ہیں جہاں کے شہزادے شہزادیوں سے عیش و عشرت کے علاوہ مزید کچھ توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔یہ زندگی کے مسائل سے نبرد آزمانہیں ہو سکتے تھے۔معرکے سر کرنا ان کی زندگی کا مقصد نہیں ہوتا تھا۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو میر حسن نے اپنے عہد کے لکھنؤ کے کردار کو من و عن پیش کیا ہے۔اور ان کی یہی خوبی انہیں دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

جرات اور انشا کے معاصرین میں رنگین بھی ایک اہم شاعر ہیں۔رنگین کا قیام چند سالوں کے لیے مرزا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ میں رہا۔رنگین بہت ہی ذہین' ذکی و فہیم اور وسیع المطالعہ تھے۔اُنہیں اُردو' عربی' فارسی' ترکی ' پنجابی' مرہٹی وغیرہ زبانوں پر دسترس حاصل تھا۔شعروادب کے علاوہ فلسفہ' حکمت اور قرآن و حدیث کا اچھا مطالعہ تھا۔رنگین جب دلّی سے لکھنؤ تشریف لائے تو وہ عہد لکھنو کے عروج کا دور تھا۔رنگین مزاجاً اسم با مسمیٰ تھے اور اسے مزید تقویت وہاں کے ماحول سے حاصل ہوئی۔وہ شاعری میں خارجی پہلو کا بیان بڑی جزئیات کے ساتھ کرتے تھے۔صنف ریختی کی مقبولیت میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔رنگین مولانا روم سے بہت متاثر تھے اور یہی وجہ ہے کہ رنگین کے مجموعہ کلام میں حکیمانہ و صوفیانہ موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس پر مولانا روم کی تحریروں کا اثر نظر آتا ہے۔رنگین کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں شاعر و ادیب' نواب' طبیب' مولوی غرض یہ کہ مختلف پیشے سے وابستہ لوگ موجود تھے۔رنگین ان تمام سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے۔رنگین کی غزلوں کا مرکز و محور عشق تھا اور عشق کے بیان میں وہ کسی حد تک جا سکتے تھے۔ انہیں طوائفوں سے بڑی قربت تھی۔انہوں نے اس طبقے کی بہت عمدہ جزئیات نگاری کی ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

حوروں کے عوض مجھے الٰہی دُنیا میں تو ایک نازنین دے

کب مجھ کو بہشت کی خواہش جو کچھ دینا ہے سو یہیں دے

مندرجہ بالا شاعروں کے علاوہ بھی لکھنؤ میں کثیر تعداد میں شاعر و ادیب تھے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔لکھنؤ کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔قدیم سے لے کر جدید دور تک وہاں کے شاعروادیب نے ادب میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس دلایا ہے۔وہاں کی زبان ' تہذیب و تمدن' لباس اور نشست کے آداب وغیرہ اسے منفرد اور ممتاز مقام عطاکرتے ہیں۔اس کی اپنی ایک ادبی تاریخ رہی ہے جس کے نگار خانے میں جرأت' انشا' مصحفی' ناسخ ' آتش' نسیم' میر حسن' میر ضمیر' میر خلیق' میر انیس' مرزا دبیر' ہادی رُسوا' چکبست' ثاقب' محشر' آرزو' اثر لکھنوی وغیرہ جیسے شعرا جگمگا رہے ہیں۔

6.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اُردو ادب میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ان دبستانوں نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔لکھنؤ کی شاعری اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔
- یہاں کے شعرا اور دلّی سے ہجرت کرکے آنے والے شاعروں کو بھی یہاں کے نوابین اور امرا کی سرپرستی حاصل تھی۔یہاں کے فرمانرواشجاع الدولہ ' آصف الدولہ ' غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کھلے دماغ کے مالک تھے۔ان میں سے بیشتر کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔
- غازی الدین حیدر خود بھی شاعری کرتے تھے اور واجد علی شاہ کی تو کئی کتابیں تھیں۔شاعروں کو انعامات و اکرام سے سرفراز کرنااور اُن کی قدرومنزلت اُن کے مزاج کا خاصا تھا۔
- دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں دیگر فنی خصوصیات کے علاوہ لفظی صنعت گری' تصنع و تکلف' صنعتوں کا استعمال' محبوب کے سراپے کا کھل کر بیان وغیرہ جیسی خصوصیات کثرت سے موجود تھیں۔یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔دبستان لکھنؤ میں صنف ریختی کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔
- لکھنؤ کے مشہور شعرا میں ناسخ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔اُنھوں نے مرزا مظہر جان جاناں کے ساتھ اصلاح زبان کی تحریک چلائی۔اُنھوں نے زبان کی صفائی پر زور دیا۔ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا۔
- قواعد کے مطابق زبان میں درستگی' نئی نئی بندشیں اور تراکیب ایجاد کیں۔دبستان لکھنؤ میں غزلوں کے ساتھ ساتھ مرثیے کو بھی خوب ترقی ملی۔
- انیس و دبیر نے مرثیہ نگاری کو اوج ثریا تک پہنچایا۔لکھنؤ کے اہم شاعروں میں جرات' انشا' مصحفی' ناسخ' آتش' نسیم' شوق' رنگین' رشک وغیرہ شامل ہیں۔ان شعرا کی غزلوں میں دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہے جسے اُردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

6.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ریختی	:	وہ نظم جو عورتوں کی زبان میں کہی جائے
فحش	:	بیہودہ باتیں
ترجیح	:	فوقیت' برتری
اسم بامسمی	:	جیسا نام ویسا ہی عمل

مرہون منت	:	احسان مند، شکر گزار
موقر	:	توقیر والا، عزت والا
جزئیات	:	تفصیل، معمولی سے معمولی بات کی وضاحت
طبع زاد	:	اپنی ایجاد، اختراع
انتشار	:	گھبراہٹ، تتر بتر ہونا، پریشانی، فکر
صنعت	:	شاعری کی اصطلاح، مراد فنکاری و کاریگری، پیشہ، ہنر
تصنع	:	بناوٹی، دکھاوا

6.8 نمونۂ امتحانی سوالات

6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فیض آباد کے بعد لکھنؤ کو اودھ کا دارالخلافہ کس بادشاہ نے بنایا؟

(a) واجد علی شاہ (b) سعادت خاں (c) شجاع الدولہ (d) آصف الدولہ

2۔ "لکھنو کا دبستانِ شاعری" کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(a) ابواللیث صدیقی (b) ایم۔ حبیب (c) احتشام حسین (d) جمیل جالبی

3۔ انگریزوں نے کس بادشاہ کو "مٹیا برج" بھیج دیا؟

(a) سعادت خاں (b) واجد علی شاہ (c) شجاع الدولہ (d) آصف الدولہ

4۔ جرات کا پورا نام کیا تھا؟

(a) انشاللہ خاں (b) امام بخش (c) یحییٰ امان (d) شیخ قلندر بخش

5۔ انشااللہ انشا کہاں پیدا ہوئے؟

(a) مرشد آباد (b) لکھنؤ (c) دہلی (d) ممبئی

6۔ دریائے لطافت کس نوعیت کی کتاب ہے؟

(a) قواعد (b) تنقید (c) تاریخ (d) تذکرہ

7۔ "ریاض الفصحا" کس کی کتاب ہے؟

(a) مومن (b) غالب (c) مصحفی (d) میر

8۔ شیخ امام بخش ناسخ کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) خدا بخش (b) امام بخش (c) قلندر بخش (d) نبی بخش

9۔ خواجہ حیدر علی آتش کے آباواجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) ایران (b) ترکی (c) بغداد (d) فلسطین

10۔ "سلک گوہر" کس نوعیت کی کتاب ہے؟

(a) ناول (b) داستان (c) افسانہ (d) ڈراما

6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستانِ لکھنؤ کے نسبتاً کم معروف شعرا کا تعارف کرائیے۔

2۔ مصحفی اور اُن کی شاعری کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

3۔ انشاء اللہ خاں انشا کی شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ آتش کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5۔ اصلاح زبان کی تحریک پر روشنی ڈالیے۔

6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

3۔ خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

6.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی
2۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ابواللیث صدیقی
3۔ ولی سے آتش تک (کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین)	ایم حبیب خاں
4۔ تاریخ ادب اُردو (جلد دوم، حصہ دوم)	جمیل جالبی
5۔ اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین

6.8.1 کے جوابات: 1-d 2-a 3-b 4-c 5-a

6-a 7-c 8-a 9-c 10-b

اکائی7: شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل
7.3 اٹھارہویں صدی کی اہم نثری تصانیف
7.3.1 کربل کتھا
7.3.2 قصہ ٔ مہرافروزو دلبر
7.3.3 نوطرز مرصع
7.3.4 نوآئین ہندی
7.3.5 عجائب القصص
7.4 متن برائے مطالعہ
7.5 اکتسابی نتائج
7.6 کلیدی الفاظ
7.7 نمونہ ٔ امتحانی سوالات
7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

اُردو زبان و ادب میں نثر اور نظم کا مفہوم بہت وسیع معنوں میں لیا جاتا ہے۔ نظم سے مراد تمام شعری اصناف ہیں

اور نظم ازخودایک مقبول صنف سخن ہے۔اور اسی طرح ہم نثری ادب سے مراد اُن اصناف کو لیتے ہیں جو شعری نہ ہوں۔ نثری ادب کی دو شاخیں ہوتی ہیں۔افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب۔افسانوی ادب سے مراد وہ اصناف ہیں جن کی بنیاد قصے کہانیوں پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کہانیوں میں تصوراتی اور تخیلاتی عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔یہ دراصل تخلیقی ادب ہوتا ہے۔غیرافسانوی ادب کا تعلق انسان کے ذاتی تجربات و مشاہدات سے ہوتا ہے جسے وہ ادبی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔مثلاً سفر نامے' خودنوشت، خاکے، رپورتاژ وغیرہ۔افسانوی ادب میں داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ شامل ہے۔داستان اُردو کی قدیم نثری صنف ہے۔جب انسان فرصت کے اوقات میں اپنی دل بستگی کے سامان کا متلاشی تھا اُس وقت داستانوں کا سننا اور سنانا کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔اُردو نثر میں داستان وہ واحد صنف ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر ہوا کرتے ہیں۔ڈرامہ ' ناول اور افسانہ سماجی مسائل و معاملات کی عکاسی کرتے ہیں۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ہر صنف کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور انہیں تقاضوں کے پیش نظر ادب میں اس صنف کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔نیز اس کا تعین قدر کیا جاتا ہے۔یہاں اس موضوع پر آپ کو معلومات فراہم کرنا مقصود ہے کہ شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا کس طرح ہوا۔مزید یہ کہ اس دور میں کون کون سے مصنف تھے اور ان کی کون کون سی تصنیفات سامنے آئیں۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نظم و نثر کی تعریف و تفہیم کر سکیں۔
- اُردو نثر کے ابتدائی نقوش کی وضاحت کر سکیں۔
- فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" سے متعلق سمجھا سکیں۔
- قصۂ مہر افروز ودلبر اور نواب عیسوی خاں کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔
- نوطرز مرصع کی موضوعاتی و فنی خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔
- نو آئینِ ہندی اور عجائب القصص کی تفصیل سے واقف کرا سکیں۔

7.2 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

فورٹ ولیم کالج سے قبل اُردو زبان نوخیز تھی۔شمالی ہند میں نثری ادب کی صورت گری ہورہی تھی۔اس میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش کثرت سے تھی۔اس صورتحال میں اُردو' دوسری زبانوں سے دامن بچاتے ہوئے نکھرنے سنورنے اور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کی جدوجہد کررہی تھی۔اُردو کے ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین اپنی مایہ ناز کتاب "اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں اُردو کے ابتدائی دور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"لسانیات کے علما نے دلّی کے آس پاس کی اُردو زبان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے

> اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بول چال کے لیے یہ زبان ایک ترقی پذیر شکل میں بہت دنوں سے رائج تھی اور آپس کے تعلقات میں بہت سی ایسی کہاوتیں ' ایسے محاورے اور جملے پیدا ہوگئے تھے جو عوام سے اس کے تعلق کا پتہ دیتے ہیں۔" (ص۔78)

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں صنف داستان کی مضبوط و مستحکم بنیاد رکھی گئی اور نثری تصنیفات کی مختلف النوع تحریریں سامنے آئیں۔ دیباچے' اُردو شاعروں سے متعلق تذکرے' لغات اور ترجمے وغیرہ اُردو نثر کی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ اُردو کا ابتدائی دور تھا، جسے اُردو زبان کہا جا رہا تھا، اسی آدھی ادھوری زبان میں شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہو چکی تھی اور نثر کی شمع نے بھی روشنی دینی شروع کردی تھی۔ جعفر زٹلی جو اس عہد کا بہت ہی معروف شاعر تھا' وہ اپنی مزاحیہ شاعری اور پھکڑپن کے لیے جانا جاتا ہے۔ اُس کے یہاں نثر کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ یہ نثری تحریریں باضابطہ طور پر نہیں ہیں بلکہ ٹکڑوں کی شکل میں ملتی ہیں جن سے اُس عہد کی سیاسی اور معاشی حالات کا پتہ چلتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں خصوصاً شمالی ہند میں اُردو نثر میں بہترین اضافہ ہوا ہے۔ یہ میرؔ و سوداؔ کا دور تھا جسے اُردو شاعری کا عہد زریں کہاجاتا ہے۔ اس وقت اُردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ اور ان کے برادر خورد خواجہ میر اثرؔ بھی موجود تھے۔ میر سوز، انشا' مصحفی، نظیراکبرآبادی، میرحسن وغیرہ جیسے مایہ ناز شعرا بھی شاعری میں کمالات دِکھا رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سبھی بحیثیت شاعر اپنی شناخت رکھتے تھے۔ یہ نثرنگار نہیں تھے۔ البتہ اس زمانے میں نثر کا ایک بہترین نمونہ سودا کے دیباچے کی شکل میں منظر عام پر آتا ہے جس سے اس عہد اور وہاں کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ گرچہ اُردو قصیدے کے صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنھوں نے قصیدے کے فن کو اوج ثریا تک پہنچایا ہے۔ اُنھوں نے ہجویہ قصیدے لکھ کر ایک نئی طرح کی بنیاد ڈالی۔ سودانے غزلیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور مرثیے لکھ کر بھی اُردو ادب میں بہترین اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے جب مرثیوں کو مرتب کیا تو اس پر ایک مبسوط دیباچہ بھی تحریر کیا جو کئی بار مجموعے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس نثری نگارش کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ سودا نے میر تقی میر کی مثنوی "شعلہ عشق" کو نثری پیکر عطا کیا، لیکن اب یہ نثری کارنامہ دستیاب نہیں ہے۔ تذکرے اور تاریخ کی کتابوں میں محض ذکر ملتا ہے۔ سودا کے معاصر خدائے سخن میر تقی میر جو اُردو غزل کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔ انھوں نے بھی نثری کارنامے انجام دیے ہیں۔ میرؔ نے نکات الشعرا لکھ کر اُردو شاعروں کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے۔ اس میں شاعروں سے متعلق معلومات فراہم کرکے اُردو ادب کو بیش قیمت تحفہ عطا کیا ہے، لیکن اس تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اُردو ادب میں ترجمے کے ذریعے بھی غیر معمولی اضافے ہوئے ہیں۔ ترجمہ بنیادی طور پر ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو کہتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے دوسری زبانوں کے ادب اور اس کی باریکیوں کو

سمجھا جا سکتا ہے۔اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ دونوں اپنے وقت کے عالم دین تھے اور اسلام کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کے والد متقی، پرہیز گار، صوفی بزرگ تھے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دونوں ہی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے کام کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مذہب کی تبلیغ میں خاص حلقے یا طبقے کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے بلکہ اس معاملے میں عوام وخواص ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کی توسیع و ترویج میں صوفیائے کرام کا بھی حصہ رہاہے۔ اس دور میں بھی مذہبی نوعیت کی کتابیں لکھی گئیں مگر وہ وقت کے ہاتھوں تلف ہو گئیں۔

تصوف اور ترجمے کے حوالے سے ایک اہم نام معین الدین حسین علی کا ہے جنھوں نے فارسی تصنیف کو اُردو میں منتقل کیا۔ جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "7160-61 میں معین الدین حسین علی نے تصوف کی فارسی کتاب جامِ جہاں نما کو اپنے الفاظ میں اُردو نثر میں لکھا جس میں تصوف کے دقیق نکات کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

اسی تسلسل میں مزید فرماتے ہیں کہ جامِ جہاں نما میں دراصل تصوف کے مسائل پر بات کی گئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کی نثر میں غوروفکر کے ساتھ تصوف جیسے سنجیدہ موضوع پر نہ صرف گفتگو کی جا رہی تھی بلکہ رقم طرازی بھی کی جا رہی تھی۔ شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی بھی ایک مترجم کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اُنہوں نے "عم پارہ" کی تفسیر خدائی نعمت کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کی اشاعت کئی بار عمل میں آئی اور "تفسیر مرادیہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں رستم علی بجنوری نے "قصہ و احوال روہیلہ" کے عنوان سے تاریخ لکھی، جس میں 1730 ء سے لے کر 1755 ء تک رونما ہونے والے روح فرسا واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں دلّی اُجڑ سی گئی تھی۔ مغل حکومت کی جو بنیاد بابر کے زمانے میں رکھی گئی تھی وہ اورنگ زیب کے دور حکومت تک مزید مستحکم ہوتی رہی لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس میں وہ پائیداری نہ رہی۔ ایک عجیب سی کشمکش کے ساتھ زندگی گزررہی تھی۔ سچ پوچھیے تو نہ پہلے جیسی دلّی تھی اور نہ داددینے کا ماحول باقی تھا۔ مورخوں نے ان تمام حالات و واقعات کو کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ تاہم رستم علی بجنوری نے روہیلہ کی جو تاریخ رقم کی ہے، اُس میں تمام واقعات کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی کیفیات کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ تاریخ بہت ہی آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ نیز واقعات کو ترتیب وار اور پر اثر بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ "قصہ و احوال روہیلہ" میں رستم علی نے انگریزی الفاظ کا بھی جا بجا استعمال کیا ہے۔

شمالی ہند میں پہلی باقاعدہ نثری کتاب واقعات کربلا کے بیان پر مشتمل "کربل کتھا" ہے۔ یہ فضلی کی تصنیف ہے

(جس پر آگے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔)

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک شمالی ہند میں نثری ادب کے فروغ میں دیباچے ' تاریخ اور ترجمے نے بہت اہم کردار نبھایا ہے۔اُردو کی قدیم نثری صنف داستان ہے۔داستان نویسی کا باقاعدہ آغاز 1635 ء میں وجہی کی تصنیف ''سب رس'' سے ہوتا ہے۔وجہی دکن کا رہنے والا تھا۔وہ قطب شاہی عہد کا بہت ہی مشہور شاعر و ادیب تھا۔دربار سے اُس کی گہری وابستگی تھی۔اور یہیں اس نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر داستان قلم بند کی۔دکن میں داستان نگاری کی تقریباًایک صدی کا وقفہ گزرجانے کے بعد عطاحسین تحسین نے ''نوطرزمرصع'' کے عنوان سے ایک داستان لکھی۔''قصہ مہرافروز دلبر'' کے عنوان سے عیسوی خاں بہادر نے داستان لکھی۔مہرچند کھتری نے ''نوآئین ہندی'' اور شاہ عالم ثانی نے ''عجائب القصص'' اور شاہ حسین حقیقت نے جذب عشق لکھ کر داستان نگاری کی صحت مند روایت کی بنا ڈالی۔ان تمام داستانوں سے متعلق مزید معلومات فراہم کی جائے گی۔

7.3 اٹھارہویں صدی کی اہم نثری تصانیف

7.3.1 کربل کتھا:

شمالی ہند میں اُردو نثرکے ابتدائی دور کے مصنفین میں فضل علی فضلی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔تاریخی اعتبار سے شمالی ہند میں اُردو نثر کی ابتدا محمد شاہی عہد سے ہوتی ہے جس میں فضلی کی تصنیف کربل کتھا کو اولیت حاصل ہے۔ان کا نام فضل علی تھا۔اُنہوں نے 1732-33ء میں کربل کتھا تصنیف کی اور 1747-48 ء میں نظرثانی کی ہے۔انتخاب کربل کتھا کے مرتب پروفیسر حنیف نقوی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''فضلی کے بارے میں اب تک مستند طور پر جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں' اُن کا واحد ماخذ کربل کتھا ہے۔اس کتاب کے دیباچے کے مطابق 1145 ھ تک جبکہ اُس کا نقش اول تیار ہوا' اُن کی عمر نے ''حدود عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا تھا۔'' بالفاظ دیگر وہ اُس وقت بائیسویں یا تئیسویں برس میں تھے۔اس اعتبار سے محتاط طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ 1122 ھ / 1710 ء کے اواخر یا 1123 ھ /1711 ء کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ اپنی تعلیم و تربیت اور مبلغ علم کی طرف اُنہوں نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔''

ان کے حالات زندگی کے بارے میں باقاعدہ طور پر کچھ نہیں ملتا ہے۔محققین کی رائے میں بھی اختلاف ہے۔ مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے ''طبقات الشعرائے ہند'' میں فضلی اور کربل کتھا کا ذکر کیاہے۔اس کے بعد تحقیق کا ایک سلسلہ چل پڑا اور اب یہ تصنیف شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔فضلی کی ترجمہ شدہ تصنیف ''کربل کتھا'' میں چیدہ چیدہ دکنی زبان کے الفاظ اور محاورے ملتے ہیں، لیکن اس کے باوجود محققین کی رائے ہے کہ وہ شمال کے رہنے والے تھے۔فضلی

فارسی زبان کے اچھے واقف کار تھے۔کربل کتھا میں فارسی کے اشعار 'الفاظ اور عربی زبان میں عبارتیں ملتی ہیں۔اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔اول اس زمانے میں اُردو 'فارسی آمیز ہوتی تھی۔دوم اس تصنیف کا پس منظر مذہبی نوعیت کا ہے۔کربل کتھا کا ماخذ ''روضتہ الشہدا''ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تحریر کردہ ہے۔وہ ایران کا رہنے والا تھا۔اس کی مادری زبان فارسی تھی اور فارسی میں ہی اُنہوں نے روضتہ الشہدارقم کی جو تاریخی و مذہبی نوعیت کی کتاب ہے۔اسے محرم کے مہینے میں پڑھا جاتا تھا۔روضتہ الشہدا میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا بیان بہت ہی پردرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔تاہم فارسی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا آسان نہ تھا۔فضلی نے اسے اُردو زبان میں منتقل کرکے کارِ نیک کیا ہے اور اس کا نام کربل کتھا رکھا۔کربل سے مراد کربلا اور کتھا کا مطلب کہانی ہے۔یعنی کربلا کی کہانی۔کربل کتھا میں مقدمہ ' دیباچہ' بارہ مجلس اور خاتمہ کی پانچ فصلیں ہیں۔

پہلی مجلس میں حضور نبی کریمؐ ' ان کی عزیز از جان صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور دونوں نواسوں حضرت امام حسینؓ اور امام حسنؓ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ان سب کی محبت اٹوٹ تھی۔مصنف نے اسے تمہیدی انداز سے پیش کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کا ذہن پوری طرح سے تیار ہو جائے۔دوسری مجلس میں نبی کریم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ ' ان کے خاوند حضرت علیؓ اور ان کے بیٹے حضرت امام حسنؓ اورامام حسینؓ کی قربت اوران کی آپسی محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔کربل کتھا کے اس دوسری مجلس میں امام حسنؓ اور اماحسینؓ کے کردار کو اُبھارا گیا ہے۔حضرت فاطمہؓ کی وفات کا بیان انتہائی دردآمیز انداز میں موجود ہے۔ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے کہ :

یہ دوسری مجلس ہے سو اس میں سر بہ سر
خیرالنسا کے مرنے کا ' یاروں حوال ہے

اس مجلس میں حضرت فاطمہؓ کی خوبیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔حضرت فاطمہؓ کو اپنے شوہر حضرت علیؓ سے بہت محبت تھی۔وہ ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔حسنؓ اور حسینؓ سے محبت اور اُن کے تئیں فکر کو بھی اُبھارا گیا ہے۔تیسری مجلس میں حضرت علی' چوتھی مجلس میں حضرت حسنؓ اور پانچویں میں حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت اور وصال کا بیان ہے۔چھٹی مجلس کربل کتھا کا بہت ہی پراثر حصہ ہے۔اس میں حضرت مسلم بن عقیل کے دو فرزند حضرت محمد اور ابراہیم کی شہادت کا بیان پیش کیا گیا ہے۔حضرت مسلم کے ان دونوں فرزندان کے سر قلم کرکے دریائے فرات میں بہا دیے گئے تھے۔کربل کتھا کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ساتویں مجلس میں حضرت امام حسینؓ اور حضرت حُر کی آپسی محبت کو پیش کیا گیا ہے۔مجلس کے اس حصے میں حُر کی شجاعت' امام حسینؓ سے وفاداری کا بیان ملتا ہے۔اس مجلس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

یہ مجلس ہے گی ساتویں' تس میں حسینؓ کا
کعبے سے کوفے کوں سفر اور حُر کا حال ہے

آٹھویں مجلس میں حضرت قاسمؓ کی شہادت کا بیان ہے۔کربل کتھا کا یہ حصہ اس لیے بھی بہت پُر اثر اور دردناک

ہو گیا ہے کہ حضرت قاسمؑ کا اُسی دن عقد ہوتا ہے اور اسی دن وہ شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ سانحہ کوئی اتفاقیہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ حضرت قاسم، امام حسین اور نئی نویلی دُلہن وغیرہ سبھوں کو معلوم تھا۔ اُردو مرثیہ گوئیوں نے واقعات کربلا کے اس دن کے منظر پر بہت لکھا ہے۔ نویں اور دسویں مجالس میں بھی حضرت علی اکبرؑ امام حسینؑ کی شہادت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ گیارہویں مجلس میں شیر خوار علی اصغرؑ کی شہادت کا بیان ہے۔ علی اصغرؑ معصوم چھوٹے بچے تھے۔ انہیں پیاس لگی تھی، لیکن دُشمنوں نے تیر چلا دیا تھا، جس سے وہ شہید ہو گئے۔ بارہویں مجلس آخری مجلس ہے، جس میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا بیان انتہائی پُردرد انداز میں کیا گیا ہے۔ اس شہادت کے ساتھ ہی واقعات کربلا تاریخ کا ایک باب بن جاتا ہے جو آج تک لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں محفوظ ہے۔ اس حصے کا آخری باب بہت ہی روح فرسا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ”اے شِمر! جانتا ہے کہ آج کون دن ہے؟ کہا: جمعہ اور روزِ عاشورا۔ پھر فرمائے: پہچانتا ہے کہ کون سی ساعت ہے؟ کہا: وقت خطبہ اور نماز پڑھنے کا۔ فرمائے کہ اِس وقت خطیب میرے دادا کی اُمّت کے منبروں پر خطبے پڑھتے اور نعت میرے دادا کی کہتے اور توں مجھ پر ایسا ظلم کرتا؟ رسولِ خدا نے منھ اپنا میری چھاتی پر رکھا اور توں اِس طرح میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ وہ بوسے میرے حلق پر دیا اور توں شمشیر یہاں چلاتا۔ میں روحِ زکریا نبی اپنے داہنے طرف اور روحِ یحیٰی بائیں طرف اپنے دیکھتا اور توں میری چھاتی پر چڑھا۔ اے شمر! وقتِ نماز ہے۔ اُٹھ میری چھاتی سے کہ منھ طرف قبلہ کے کروں اور دو رکعت نماز پڑھوں کہ مجھ کوں نماز میں شہید ہونا باپ سے میراث ہے۔ جب کہ میں نماز میں ہوں، جو چاہے سوکر، آہ! تب شمرِ لعین سینۂ بے کینۂ امام پر سے اُٹھااور حضرت اتنی طاقت رکھتے تھے کہ منھ قبلہ طرف کرکے نماز میں مشغول ہوئے۔ واویلا، شمرِ ملعون روسیاہ صبر نہ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔(کربل کتھا، ص 84-85)

بارہ مجلسوں کے بعد پانچ فصلیں ہیں۔ اُن میں واقعات کربلا کے بعد کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

کربل کتھا کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ فضلی نے روضتہ الشہدا سے ترجمہ کرکے اسے حیات جاودانی عطا کی۔ جب یہ تصنیف معرض وجود میں آئی اس وقت یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ البتہ رفتہ رفتہ مرثیے کی شکل میں اس واقعے کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا۔

7.3.2 قصہ مہر افروزو دلبر:

قصہ مہر افروز ودلبر اُردو کی قدیم داستان ہے۔ اس کے مصنف نواب عیسوی خاں ہیں۔ وہ ہندی زبان میں بھی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ”بہاری ست سئی “ کے دوہوں کی شرح ”رس چندرِکا“ کے عنوان سے لکھی۔ قصہ مہرافروز دلبر میں

بھی عربی فارسی سے زیادہ سنسکرت الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔پوری داستان پر دیومالائی اثرات ملتے ہیں۔یعنی اس میں ہندوستانی تہذیبی عناصر پر مبنی متعدد کہانیاں اور ذیلی قصے موجود ہیں۔مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ ”یہ قدما کی زبان کا پہلا ہیولیٰ یا زبان دہلی کا پہلا ادبی نقش ہے، جس پر ایک طرف ہندی شاعری کی چھاپ ملتی ہے ، دوسری طرف فارسی داستانوں کے جملوں کا دروبست پایا جاتا ہے۔“ (قصہ مہرافروز ودلبر ص۔22)

مجموعی طور پر اس داستان کی زبان سادہ ، سلیس اور عام فہم ہے۔کہانی دلچسپ اور تجسس سے بھرپور ہے۔یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی کہانی کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اس کی مجموعی فضا میں محو کردے۔قصہ مہرافروزودلبر میں قدیم مثنویوں کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔لیکن بنیادی طور پر یہ ایک طبع زاد داستان ہے۔کرداروں کی بہتات اور مافوق الفطرت عناصر کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔کہانی میں روایتی انداز سے ایک بادشاہ ہے جو لاولد ہے۔اولاد کی محرومی کے سبب تخت و تاج سے کنارہ کشی اختیار کرکے فقیری کا روپ دھار لیتا ہے اور جنگل کو اپنا ٹھکانا بنا لیتا ہے۔لیکن خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ایک فقیر کی دعا سے اُس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔شہزادے کا نام مہرافروز رکھا گیا اور شاہانہ انداز سے اُس کی پرورش کی گئی اور پھر تربیت کا اہتمام کیا گیا۔اُسی محل میں وزیر زادہ اندیش بھی رہتا ہے۔یہ دونوں جنگل جاتے ہیں اور ایک خوبصورت جانور کا تعاقب کرتے ہیں مگر جانور اچانک نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔اور یہ دونوں خود کوپریوں کے دیس میں پاتے ہیں۔وہ ایک جادوئی دُنیا ہے۔بقول مسعود حسین خاں”سنگ مرمر کی چار دیواری‘ حکاکی‘ لاجوردی‘طلائی کام دروازے پر‘ پانی کی چدّریں‘ نشیمنے‘ چبوترے اور بنگلے‘ غرض کہ کوہِ قاف میں پہنچ گیا۔“ (قصہ مہر افروز و دلبر۔ص19)مہرافروز وہاں پریوں کے بادشاہ کی بیٹی دلبر سے ملتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔پھر یکے بعد دیگر کئی معرکے سر کرنے پڑتے ہیں۔کئی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل و دماغ ششدر رہ جائے۔ایک لمبی جدوجہد کے بعد مہر افروز اور دلبر کی ملاقات ہوجاتی ہے۔اور آخر کار دونوں کی مرادیں بر آتی ہیں۔داستان کے اختتام پر مصنف نے غیر محسوس طریقے سے قصے سے مربوط کرکے ”نصیحت نامہ“ پیش کیا ہے۔یہ نصیحت نامہ دوحصوں میں منقسم ہے۔ایک ایک حصے میں بادشاہ اور وزیر اپنے اپنے فرزند کو نصیحتیں کرتے ہیں۔پوری داستان میں چھ ضمنی کہانیا ں ہیں۔یہ داستان ادب میں ایک خاص مقام و مرتبے کی حامل ہے۔اس کی وجہ شمالی ہندوستان کی قدیم داستان ہونے کے علاوہ اس کا اُردو ہندی زبان کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہونا بھی ہے۔مسعود حسین خاں اس داستان سے متعلق فرماتے ہیں:

> ”قصہ مہرافروز ودلبر کی ادبی حیثیت پلاٹ کی ندرت یا کردار نگاری سے زیادہ اس کے سادہ و ادبی اسلوب میں ہے۔اُردو کے قدیم ادب میں اس سے زیادہ سہل اور سادہ عبارت نظم و نثر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔“ (قصہ مہرافروز و دلبر۔ص20)

عیسوی خاں کی یہ داستان ناموں کے حوالے سے تمثیلی نوعیت کی ہے۔مصنف نے یہ اہتمام شعوری طور پر کیا ہے۔

مثلاً بادشاہ کا نام عادل شاہ ہے۔ فرزند مہرافروز اور ملکہ پری چہرہ ہے۔ اکثر داستانوں میں وزیر کو عقلمند اور وزیرزادے کو ذہین اور متحرک دِکھایا جاتا ہے۔ اس داستان میں بھی وزیر کا نام جہاں دانش اور وزیر زادے کا نیک اندیش ہے۔

پرستان کے شہر کا نام حسن آباد' باغ محبت افزا' پہاڑ کوہ گلستاں' بادشاہ جہاں بخش اور بیٹی دلبر ہے۔ یہی دلبر اور مہرافروز اس داستان کے بنیادی کردار ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو وجہی کی داستان ''سب رس'' میں بھی ناموں کا یہی انداز ہے اور اس طرز کو سراہا گیا ہے۔ عیسوی خاں کی معلومات وسیع اور نظر گہری تھی۔ اُنہوں نے عوام کے ذوق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کامیاب کوشش کی ہے۔ پوری داستان میں تجسس اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ قصہ مہرافروز ودلبر میں دلّی اور اس کے اطراف و اکناف کی تہذیب ومعاشرت' وہاں کے آداب اور ماحول کی جھلکیاں نمایاں طورپر نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ ایک یادگار داستان ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

7.3.3 نوطرز مرصع:

نوطرز مرصع عطا حسین تحسین کی تصنیف ہے۔ یہ ایک فارسی داستان بعنوان ''قصہ چہار درویش'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ نوطرز مرصع کا اصل نام ''انشائے نوطرز مرصع'' ہے۔ اس میں انشا پردازی اور تخیل کی آمیزش ملتی ہے۔ اُس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کم ہوتی چلی گئی۔ ایک زمانے تک قصہ چہاردرویش کے مصنف امیر خسرو کہلاتے رہے لیکن کتاب کی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ محمد معصوم اس کے مصنف ہیں۔

عطا حسین تحسین اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک انگریز جنرل اسمتھ کے میر منشی تھے۔ اُنہیں کے ساتھ تحسین نے کلکتے کا سفر بھی کیا۔ اسمتھ اپنے وطن کولوٹ گیا اور تحسین پٹنہ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے۔ وہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور اُن کی خوب طوطی بولتی تھی۔ تحسین کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی تصنیف شجاع الدولہ کے حضور میں پیش کریں لیکن صد افسوس کہ کتاب کی تکمیل سے قبل شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ تحسین نے اُن کے صاحبزادے آصف الدولہ کو اپنی یہ تصنیف پیش کردی۔

داستان''نوطرز مرصع'' کی ابتدا پہلے لکھی گئی مثنویوں اور داستانوں کے انداز سے ہوتی ہے۔ ولایت روم کا بادشاہ فرخندہ سیر ہے اور وہ لاولد ہے۔ اولاد کے غم میں وہ سلطنت سے کنارہ کشی کرکے ایک گوشے میں پناہ لے لیتا ہے۔ اس کا وزیر خردمند ہے۔ وزیر نے بادشاہ کو بہت سمجھایا اور خدا پر بھروسہ رکھنے کی ترغیب دی۔ بادشاہ ازسرنو سلطنت کی ذمہ داری نبھانے لگتا ہے اور راتوں کو عبادت اور مقابر کی زیارت میں گزارتا ہے۔ ایک رات اُس نے دیکھا کہ دور کہیں ایک چراغ ٹمٹا رہا ہے۔ بادشاہ اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چاردرویش آپس میں باتیں کررہے ہیں۔ بادشاہ چھپ کر اُن کی باتیں سننے لگا۔ پہلے درویش نے اپنی کہانی سنائی جو ملک دمشق سے متعلق تھی۔ دوسرے درویش نے حاتم طائی کی سرگزشت اور ملکہ بصرہ اور شہزادہ نیم روز کا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد تیسرے درویش نے اپنا قصہ بیان کیا اور اتنے میں صبح ہو گئی۔ بادشاہ

دربار میں واپس آگیا اور یہاں اُس نے سبھی درویشوں کو بلایا تاکہ وہ چوتھے درویش سے قصہ سن سکے۔بادشاہ نے بھی فرخ سیر اور خواجہ سگ پرست کا قصہ سنایا۔اس کے بعد چوتھا درویش اپنی کہانی سناتا ہے۔اسی دوران خوشخبری ملتی ہے کہ بادشاہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی کالے بادل کا ایک ٹکڑا آتا ہے اور شہزادے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ دودن بعد وہ شہزادہ واپس آتا ہے۔یہ سلسلہ اسی طرح شروع ہوگیا۔کافی وقت گزرجانے کے بعد بادشاہ نے چار درویشوں کے مشورے سے ایک خط شہزادے کے ساتھ بھیج دیا۔اب جبکہ شہزادہ واپس آیا تو بادشاہ کے خط کے جواب میں جناب ملک شہپال بن شاہ رُخ نے اسے آنے کی دعوت دی۔بادشاہ درویشوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔اور وہاں سب کی مرادیں بر آئیں۔ مجموعی طور پر یہ داستان بھی دیگر داستانوں کی طرح خوشیوں پر ختم ہوجاتی ہے۔بظاہر داستان میں ایک قصہ ہوتا ہے اور پھر قصے کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے قصے ہوتے ہیں۔یہاں اِس داستان میں پانچ قصے ہیں۔چار درویشوں کے چار قصے اور ایک بادشاہ کی طرف سے سنایا گیا قصہ۔مصنف کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے تمام قصوں میں ایک منطقی ربط پیدا کردی ہے اور اس کا تسلسل کچھ اِس طرح رکھا ہے کہ یہ بظاہر ایک ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

''نوطرز مرصع'' کے حوالے سے یہ عام تاثر ہے کہ اس کی عبارت کو پر تکلف زبان' فارسی الفاظ کے کثرت استعمال اور صنعتوں کے افراط نے بوجھل بنادیا ہے۔کہیں کہیں تو مقفع و مسجع انداز کی عبارت بھی ملتی ہے۔لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اٹھارہویں صدی میں زبان و ادب کی صورتحال کے پس منظر میں نوطرز مرصع کی زبان مشکل نہیں تھی۔جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُردو زبان نکھرتی چلی گئی۔اس کی زبان ثقیل ہے اور تفہیم کا مسئلہ اس داستان کی شہرت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔پُر تکلف اور مرصع و مسجع زبان نے اسے عوام پسند نہیں بننے دیا۔بعد میں منظرعام پر آنے والی میر امن کی تصنیف ''باغ وبہار'' کا ماخذ نوطرز مرصع ہی ہے۔اس کا متن سادہ اور عام فہم ہے۔باغ و بہار میں آسان زبان استعمال کرنے کا مقصد انگریزوں کو اُردو سے واقف کرانا تھا۔قابل غور یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں نوطرز مرصع لکھی گئی اس وقت اُردو زبان پر عربی اور خصوصاً فارسی زبان کا خاصا اثر موجود تھا۔اور یہی خواص کی زبان' علمی و ادبی حلقوں کی زبان بھی سمجھی جاتی تھی۔اٹھارہویں صدی کا معتبر شاعر نظیراکبرآبادی بول چال اور عام فہم زبان استعمال کرنے کے سبب اپنے عہد میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہوسکا۔لوگوں نے ان کے کلام کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔اس طرح نوطرز مرصع زبان و بیان کے اعتبار سے کافی اہم داستان ہے اور یہیں سے آنے والے وقتوں میں نثر کے لیے راہیں ہوار ہوئیں۔

7.3.4 نوآئینِ ہندی:

''نوآئین ہندی'' کا شمار اٹھارہویں صدی کی منفرد تصنیف میں ہوتا ہے۔یہ سیاسی خلفشار کا زمانہ تھا۔انگریزوں کا تسلط بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔اُنہیں بتدریج کامیابی ملتی جارہی تھی اور اسی کامیابی کی وجہ سے ان کے ارادے پختہ ہوتے جا رہے تھے۔ان حالات میں انہیں ہندوستان کی مقامی زبان اُردو سیکھنے کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔انگریزوں کی ضرورت اور

خواہش نے مصنفین کو ایسی نثر لکھنے کی طرف متوجہ کیا جو آسان ہو، روزمرہ سے قریب ہو اور عام بول چال میں استعمال کی جاتی ہو۔"نوآئین ہندی" اس کی بہترین مثال ہے۔

مہرچند کھتری علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ان کی زندگی لکھنؤ اور اکبرآباد میں گزری۔ان کے والد کا نام رام چندر تھا۔یہ خاندان محمد شاہ کے زمانے میں لاہورسے دہلی آیا اور شاہی ملازمت سے وابستہ ہوگیا۔مہرچند کے بڑے بھائی شاعر تھے اور بندو تخلص فرماتے تھے۔چھوٹے بھائی کشن چند کا تخلص "عاشق" تھا۔مہرچند فارسی زبان میں بھی شاعری کیا کرتے تھے اور "ذرہ" تخلص کرتے تھے۔

نوآئین ہندی کے بارے میں محققین کی رائے ہے کہ یہ داستان کئی لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں اُردو اور فارسی زبانوں میں لکھی ہے۔ان میں سے رجب علی بیگ سرور کا نام کافی اہم ہے۔اُنھوں نے شگوفہ محبت کے عنوان سے یہی داستان قلم بند کی ہے جو سرور کی ایک اہم تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔

نوآئینِ ہندی مہرچند کھتری مہر کی تصنیف ہے، جو 1793ء میں تحریر کی گئی۔دراصل مہر کسی انگریز کو اُردو زبان سکھانے پر معمور ہوئے تھے۔اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ آسان اور عام فہم زبان میں کوئی ایسی کہانی تحریر کی جائے جس سے زبان سکھانے میں سہولت ہو۔ان کے سامنے تحسین کی تصنیف نوطرز مرصع موجود تھی لیکن اس کی زبان انہیں مشکل لگی۔مہرچند کھتری آسان اور روز مرہ کی زبان میں لکھنا چاہتے تھے۔تاکہ تفہیم و ترسیل کا مسئلہ پیش نہ آئے اور خاص و عام اس سے استفادہ کرسکیں۔لہٰذا اُنھوں نے فارسی زبان میں تحریر کردہ "آذر شاہ اور سمن رُخ بانو" کا قصہ آسان زبان میں اُردو میں لکھا۔یہ قصہ بہت مشہور تھا۔حالانکہ یہ اس سے قبل لکھی جانے والی داستانوں کی طرح ہی ہے۔بادشاہ آذرشاہ اور ان کی بیگم زلالہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔بادشاہ مایوسی کے عالم میں سلطنت چھوڑ دینے کا ارادہ کرتا ہے لیکن ایک پہنچے ہوئے فقیر نے کہا کہ اگر ملک ختن کی شہزادی سمن رُخ بانو سے شادی کرلے تو اولاد جیسی نعمت نصیب ہوگی۔آذرشاہ سمن رُخ بانو سے شادی کرلیتا ہے۔لیکن ان کی پہلی بیوی زلالہ، سمن رُخ بانو کی دُشمن بن بیٹھی اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرنے لگی۔سمن رخ بانو اور آذر شاہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔مرادیں پوری ہوتی ہیں۔یہاں تصادم، کشمکش، تجسس، چھوٹے چھوٹے واقعات اور ضمنی کرداروں کی مدد سے داستان اختتام پذیر ہوتی ہے۔

مہرکھتری نے نوطرز مرصع کے انداز پر اپنی داستان کا نام نوآئینِ ہندی رکھا۔یہ داستان ملک محمد اور گیتی افروز کے نام سے بھی مشہور ہے۔ملک محمد کے اطراف پوری کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔داستان دلچسپی سے پُر ہے۔مصنف نے واقعہ نگاری پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔

7.3.5 عجائب القصص:

عجائب القصص شاہ عالم ثانی کی تصنیف ہے جو اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں لکھی گئی۔ممتاز محقق ڈاکٹر جمیل جالبی اس کی تاریخ تصنیف 1792-93 بتاتے ہیں۔اس کی تصنیف کے وقت شاہ عالم ثانی نابینا تھے۔عجائب القصص بہت طویل

داستان ہے۔ گیان چند جین ''اُردو کی نثری داستانیں'' میں لکھتے ہیں''ایک نابینا شخص اتنی طویل داستان کا شیرازہ درست نہیں رکھ سکتا۔منشیوں نے اس کی ترتیب میں ہاتھ بٹایا ہوگا۔چنانچہ پلاٹ میں بھول چوک حیرت انگیز حد تک مفقود ہے۔''

داستان کی ابتدا حمد' نعت ' منقبت کے بعد اصل قصے سے ہوتی ہے۔ملک ختن کے بادشاہ مظفرشاہ اور اُس کے وزیر کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔فقیروں کی دعاؤں سے دونوں کے یہاں لڑکے تولد ہوئے۔اسی طرح روم کے بادشاہ اور اس کے وزیر کے یہاں بھی درویشوں کی دعاؤں سے لڑکیاں پیدا ہوئیں۔بادشاہ مظفر شاہ کا فرزند شجاع الشمس خواب میں روم کے بادشاہ کی بیٹی مہرنگار کو دیکھتا ہے اور اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔مظفرشاہ اپنے بیٹے کے لیے مہر نگارسے شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ابتدا میں‌مہر نگار شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بعد میں وہ بھی شجاع التمش کو خواب میں دیکھ کر دل دے بیٹھتی ہے۔کافی مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

شاہ عالم ثانی کی تصنیف عجائب القصص جب منظرعام پر آئی تو اُس وقت اُردو زبان' عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کی گرفت سے قدرے باہر آچکی تھی۔اس دور کی اُردو میں سلاست اور روانی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔عجائب القصص بھی زبان کی اِنہیں خصوصیات سے مملو دکھائی دیتی ہے۔رواں زبان کے علاوہ اس زمانے کے رسوم و رواج ' عقائد ' تہذیب' آداب و اطوار کا عکس بھی اِس میں دکھائی دیتا ہے۔بقول جمیل جالبی:''عجائب القصص اُردو نثر کی تاریخ کی وہ کڑی ہے جس نے فورٹ ولیم کالج سے پہلے اس کے سفر مستقبل کا رُخ متعین کر دیا۔'' (تاریخ ادب اُردو' جلد دوم' حصہ دوم' ص996)

کہانی کے اعتبار سے اس داستان میں جدت نہیں پائی جاتی ہے۔اس کے مطالعے سے اُس زمانے میں لکھی گئی مثنویوں اور نثری داستانوں کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔اس میں‌نوطرز مرصع اور سحرالبیان کا خصوصی طور پر عکس نظر آتا ہے۔اکثر داستانیں کسی ملک کے شہزادے سے شروع ہوتی ہیں۔بادشاہ کا لاولد ہونا' سلطنت اور دولت و حشمت کو چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے کا سلسلہ عام طور پر ملتا ہے۔پھر نجومی کی پیشن گوئی پر بادشاہ یا شہزادے کا عمل پیرا ہونا' اولاد کا نہ ہونا' کسی پری وش کو خواب میں دیکھ کر اُس پر فریفتہ ہونایا کسی کی زبانی دور دراز کی شہزادی کے حسن کی تعریف سن کر دل و جان سے فدا ہونا' داستانوں کی عام روایت رہی ہے۔داستانوں میں تلاش و جستجو بھی لازمی جزو کے طور پر شامل ہوتا ہے۔شہزادی کی تلاش ' نایاب قسم کے پھول کی تلاش' آب حیات کی تلاش وغیرہ۔اور اس تلاش میں عموماً شہزادہ صحرا کی خاک چھانتا ہے اور آخر میں‌منزل مقصود کو پالیتا ہے۔لیکن کچھ داستانیں اپنی زبان و بیان ' لفظیات ' صنعتوں کے استعمال وغیرہ سے منفرد اور ممتاز ہوتی ہیں۔داستانوں میں اپنے عہد کے سماجی ' سیاسی اور تہذیبی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں جس سے اس دور کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔

شمالی ہند میں اِس دورکی آخری تصنیف شاہ حسین حقیقت کی ''جذب عشق'' کی شکل میں سامنے آتی ہے جسے اُنہوں نے فارسی سے اُردو میں 1796-97 ء میں‌منتقل کیا ہے۔شاہ حسین حقیقت معروف شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

اُنھوں نے محض 25 برس کی عمر میں جذب عشق رقم کی۔اس قصے کے دیباچے میں شاہ حقیقت نے خود لکھا ہے کہ یہ ایک سچے واقعے پر مبنی ہے۔

"جذب عشق" موضوعاتی سطح پر ایک رومانی قسم کی داستان ہے۔اس کا مرکزی کردار جوان رعنا ہے جو مرہٹوں کی فوج میں شامل ہے۔ایک دفعہ اتفاقیہ طور پر اس کی نظر ایک خاتون پر پڑتی ہے۔وہ بھی اُسے دیکھتی ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے پر فریفتہ ہوجاتے ہیں۔ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے،لیکن جب لڑکی کے گھر والوں کو اس کی خبر ملتی ہے تو وہ اس کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ایک دفعہ جب دونوں محو گفتگو تھے تو لڑکی کے گھر والے جوانِ رعنا پر پیچھے سے وار کردیتے ہیں۔جوانِ رعنا بڑی بہادری سے اُن کا سامنا کرتا ہے۔لیکن لاعلمی کے سبب وہ تالاب میں کود جاتا ہے۔اسے تیرنا نہیں آتا ہے۔لڑکی بھی اس کی محبت میں تالاب میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔کچھ ہی دیر بعد دو لاشیں ایک ساتھ سطح آب پر نظر آتی ہیں اور باوجود کوشش کے دونوں کو ایک دوسرے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔پانی میں ڈوب کر مرنا اور مرنے کے بعد اس طرح ایک ہوجانا میر تقی میر کی مثنویوں' خاص طور پر "دریائے عشق " کی یاد دلاتا ہے۔جذب عشق ایک عشقیہ داستان ہے۔اس داستان کی مقبولیت کم ہے اس لیے کہ یہ زبان و بیان کے اعتبار سے ایک کمزور داستان تصور کی جاتی ہے۔

7.4 متن برائے مطالعہ (نمونۂ متن)

کربل کتھا :

آہِ دردناک بھر زارزار رو کہا؛ اے جانِ حسین!اپنے باپ کی وصیّت پر عمل کرے گا اور مجھ لیے مَرے گا۔پس مجھے بھی تیرے حق میں ایک وصیّت کی ہے چاہیے کہ میں بھی بجالائوں۔پھر ہاتھ قاسم کا پکڑ ، خیمہ میں سِدھار' قاسم کی ماں کوں فرمائے'پوشاک ِ نو قاسم کو پنھائواوراپنی بہن زینب کوں فرمائے ؛ جامہ دانی بھائی حسن کی لائو'اُس میں سے جامہ قیمتی بھائی حسن کا نکال قاسم حسن کوں پنھائے اور چیرا اپنے ہاتھ سے اُس سر پر باندھ اپنے بھائیوں عون و عباس کوں بُلائے۔پھر وہ بیٹی اپنی کہ نام زدِ قاسم تھی' اس سے نکاح باندھے فرمائے ؛ اے قاسم ! یہ امانت تیرے باپ کی ہے ' وہ آج لگ مجھ پاس تھی'اب لے۔یہ کہہ ہاتھ اُس کا قاسم کے ہاتھ دے باہر سِدھارے۔

قاسم ہاتھ دلھن کا پکڑ منھ اُس کا دیکھتا تھا کہ لشکرِ عمرِ سعد سے آواز آئی ؛ اے حُسین !کوئی اور رہا ہے تو میدان میں بھیج۔جوں وہ آواز قاسم کے کان پہنچی' ہاتھ دلھن کا چھوڑ' چاہاکہ باہر جاوے'دلھن نے دامن پکڑ کہا؛ اے قاسم ! کیا خیال رکھتا اور کہاں جاتا؟ قاسم نے کہا؛ اے نورِ دیدہ! قصدِ میدان رکھتا۔دامن چھوڑ کہ تیری دُلھنی اور میری دامادی قیامت پر پڑی۔پھر دلھن کہی؛ عجب بات فرماتے کہ دلھنی تیری اور دامادی میری قیامت پر پڑی۔پس فرد اے قیامت تمھیں کہاں پاؤں اور کس نشان سے پہچانوں؟ قاسم اپنی آستین پھاڑ کہا؛ اِس نشان سے ' مجھے میرے باپ اوراپنے داداپاس ڈھونڈیو۔

قصہ مہر افروزو دلبر:

بادشاہ کیں ایک وزیر تھا' تِس کانا نو تھا جہاں دانش۔تِس کا ایک بیٹا تھا کہ نیک اندیش اُس کا نانو تھا۔سو اُس میں اور بادشاہزادے میں بہت اخلاص تھا' اور ہمیشہ وہ ساتھ ہی رہتے تھے'ایک روز ایسا اتفاق ہوتاہے کہ بادشاہزادہ و وزیر زادہ شکار میں اکیلے ہوجاتے ہیں تو ان کے تائیں جانور درخت کے اوپر ایک خوش رنگ بولتا ہوا نظر پڑاکہ ایک ایک پَر کا رنگ اُس کے ہزاروں پر مور کے کوں رَشت دیتا تھا اور آواز اُس کی کوں بلبل کی مثال دیجے ' تو بلبل تو ہزارداستان ہوتی ہے' پر اس کی ایک ایک داستان ہزار ہزار داستان تھیں' اور جواُسے سُرود کہیے تو سُرود ایک سوز رکھتا ہے۔اُس کی ایک ایک آواز ہزاروں سوز رکھتی تھی۔شاہزادے کوں دل و جان سے آواز' رنگ اُس کا خوش آیا۔تماشے کے واسطے نزدیک اُس کے گیا۔وہ جانور وہاں سے اُڑ کر اور جگہ جائے بیٹھا۔بادشاہزادہ اوراُس کے پچھیں جاتا ہے۔ازبسکہ بادشاہزادہ محو جو ہوگیا تھا۔

نوطرزِ مُرصّع:

آہ حسرت مرے دل کی نہیں برآتی ہے — مفت باتوں میں مری عمر چلی جاتی ہے
قطع اُمید ہے اور یاس نظرآتی ہے — ہائے یہ زندگی کیا کیا مجھے دکھلاتی ہے
اس مصیبت کا بیاں کیجیے کس سے افسوس — درد اس دل کا عیاں کیجیے کس سے افسوس

یہ کہتا خراماں خراماں مضطر و متفکر خفگی طبیعت کی سے سب کار پرداز ان کارگاہِ خلافت کے تئیں ' جواب مجرے کا فرماکے ' قدم فراں روائی و جہانداری کا بیچ دامن قناعت کے کھینچ کر ایک گوشہ میں تنہا جابیٹھا اور ساری حلاوت و مزہ زندگانی کے سے تلخ کام ہوکے ارشاد فرمایا کہ ہرگز کوئی خویش وبیگانہ سے سوائے خادمانِ درگاہ کے بیچ خَلوت سرائے بادشاہی کے باریاب نہ ہو اور اضطراب شدتِ رقّتِ طبع کے سے مجنون دل 'اندوہ منزل' اُس کے کا بیچ خیال جمال لیلیٰ کامرانی کے پڑھنے ' اس بند مخمس کے سے مشتغل تھا۔

یاالٰہی میں کہوں کس سیتی اپنا احوال
تجھ سوا کون ہے ' جس سے میں کہوں دل کا ملال
یارب اس رنج سے اب اس دل شیدا کوں نکال
تیری ہی ذات سے رکھتا ہوں میں ہردم یہ خیال

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اٹھارہویں صدی کے نثری کارناموں کے محاسبے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی میں نثر کے مختلف نمونے ملتے ہیں اور مختلف النوع قسم کے اسالیب بھی ملتے ہیں۔اُردو ادب کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی بنیادی طور

پر شعری اصناف کے لیے جانی جاتی ہے۔میر' سودا' درد' سوز' انشا' میرحسن وغیرہ ایسے متعدد شاعر ہیں جو اس صدی میں موجود تھے۔لیکن ان میں سے بعض ایسے شاعر ہیں جو نثری کارناموں کے حوالے سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

- اٹھارہویں صدی میں نثر کے حوالے سے جعفرزٹلی کا نام سرفہرست ہے جن کے نثری نمونوں کے مطالعے سے اس وقت کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔سودا نے بھی مرثیوں کو یکجا کرکے دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔یہ دیباچہ خود ایک عمدہ نثری نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔میر تقی میر نے بھی اُردو شاعروں کے تذکرے لکھے۔اس کی کافی اہمیت ہے لیکن یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔
- اس کے علاوہ ترجمے کے توسط سے بھی نثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قران کے تراجم کیے۔ادبی نوعیت کی کتابوں میں فضلی کی ''کربل کتھا'' تحسین کی ''نوطرز مرصع'' جیسی نادر تصانیف ترجمے ہی کی مرہون منت ہیں۔قصہ مہر افروز و دلبر عیسوی خاں بہادر کی داستان ہے۔اسے شمالی ہند کی قدیم نثری تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے۔
- ہری چند مہر کی تصنیف ''نوآئینِ ہندی'' اور شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' بھی اٹھارہویں صدی کی نمائندہ کتابیں ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے آخر تک اُردونثر اپنا ارتقائی سفر طے کرتی رہی ہے اور اس عہد میں نثر کی صحت مند روایت ملتی ہے۔اسلوب کی سطح پر بھی اس صدی میں بہترین تبدیلی ملتی ہے۔
- اُردو پر عربی اور فارسی کے نمایاں اثرات ہونے کے باوجود ایک نکھرا ہوا اسلوب سامنے آتا ہے۔سلیس اور رواں زبان میں ادب پارے لکھے گئے جن میں سے کئی اب بھی اُردو ادب کے شاہکار ہیں۔
- غرض یہ کہ اس صدی میں اُردو نثر کی مضبوط اور مستحکم داغ بیل ڈالی گئی جس نے فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں کے لیے راہیں ہموار کردیں اور جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

7.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
رفاقت	:	ساتھ' دوستی' محبت
کربل کتھا	:	کربلا کی کہانی
مختلف النوع	:	مختلف قسم کی
معاصر	:	ایک ہی دور کے' ہم عصر
تذکرے	:	یادگار' سرگزشت' سوانح عمری
محاورے	:	وہ کلمہ یا کلام جسے اہل زبان نے لغوی معنی سے الگ کسی خاص مفہوم کے لیے

		مخصوص کر لیا
کہاوتیں	:	قول، ضرب المثل
اوجِ ثریا	:	انتہائی بلندی پر
کثرت	:	زیادہ
آمیزش	:	ملاوٹ
نوطرز مرصع	:	نئے انداز کی سجی ہوئی تحریر
مقفیٰ	:	جس میں قافیے کا اہتمام کیا گیا ہو
نگارشات	:	نگارش کی جمع، تحریریں

7.7 نمونۂ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ”کربل کتھا“ کے مصنف کون ہیں؟

(a) نواب عیسوی خاں (b) جعفر زٹلی c) امیر خسرو (d) فضل علی فضلی

2۔ ”قصہ مہرافروز و دلبر“ کا خالق کون ہے؟

(a) نواب عیسوی خاں (b) عطا حسین تحسین (c) میر چند کھتری (d) شاہ حسین حقیقت

3۔ "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" کس نے لکھی ہے؟

(a) محمد حسن (b) احتشام حسین (c) آل احمد سرور (d) وہاب اشرفی

4۔ ”کربل کتھا“ میں کتنی مجلسوں کا ذکر ملتا ہے؟

(a) آٹھ (b) دس (c) بارہ (d) چودہ

5۔ کربل کتھا کو کس نے مرتب کیا؟

(a) حنیف نقوی (b) مولوی کریم الدین (c) فضل علی فضلی (d) عیسوی خاں بہادر

6۔ ”نکات الشعرا“ کس زبان میں لکھی گئی ہے؟

(a) اردو (b) فارسی (c) ترکی (d) عربی

7۔ "نورطرز مرصع" کا اصل نام کیا ہے؟

(a) چہار درویش (b) نو آئین ہندی (c) انشائے نوطرز مرصع (d) عجائب القصص

8۔ ”نوطرز مرصع“ کس تصنیف کا ترجمہ ہے ؟

(a) چہار درویش (b)نو آئین ہندی (c)انشائے نوطرز مرصع (d)عجائب القصص

9۔ ''نو آئینِ ہندی'' کس سنہ میں تحریر کی گئی؟

(a) 1730 (b) 1750 (c)1793 (d) 1810

10۔ "جذبِ عشق"کا مصنف کون ہے؟

(a)شاہ عالم ثانی (b)شاہ حسین حقیقت (c)شاہ رفیع الدین (d)شاہ عبد القادر

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''نو طرز مرصع '' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ ''کربل کتھا'' پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ عجائب القصص کا خلاصہ لکھیے۔

4۔ ''نکات الشعرا'' کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

5۔ نواب عیسوی خاں بہادر کی کردار نگاری ''قصہ مہرافروز و دلبر'' کے حوالے سے بیان کیجیے۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نثری ادب کی تعریف کیجیے اور اُردو کے نثری ادب میں ''نو آئینِ ہندی '' کے مقام کا تعین کیجیے۔

2۔ اُردو نثر کی تاریخ میں عطا حسین تحسین کے مقام و مرتبے کا تعین کیجیے۔

3۔ شمالی ہند میں اُردو نثر کے ابتدائی نقوش سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	کلاسیکی نثر کے اسالیب	آفتاب احمد آفاقی
2۔	تاریخ ادب اُردو (جلد دوم٬ حصہ دوم)	جمیل جالبی
3۔	قصہ مہر افروز و دلبر (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں)	عیسوی خاں بہادر
4۔	کربل کتھا (مرتبہ حنیف نقوی)	فضل علی فضلی
5۔	نوطرز مرصع (ترتیب و تہذیب: پروفیسر ارتضیٰ کریم)	میر محمد حسین عطا خاں تحسین

7.7.1کے جوابات: 1۔d 2۔a 3۔b 4۔c 5۔a

6۔a 7۔c 8۔a 9۔c 10۔b

بلاکIII : دکن میں اردو

اکائی 8: جنوبی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت
	8.2.1	بہمنی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر
	8.2.2	عادل شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر
	88.2.3	قطب شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر
8.3		اکتسابی نتائج
8.4		کلیدی الفاظ
8.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	8.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	8.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	8.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
8.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

اس اکائی میں جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کا جائزہ لیا جائے گا۔اس کے بعد بہمنی دور،عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور کے سماجی وتہذیبی پس منظر پر علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالتے ہوئے بہمنی،عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے اردو دب کے ارتقا کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا جائے گا۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کا جائزہ لے سکیں۔
- بہمنی دور کے اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کر سکیں۔
- عادل شاہی دور کے اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کر سکیں۔
- قطب شاہی دور کے اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کر سکیں۔

8.2 جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت

جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کے فتوحات سے بہت پہلے ایسے صوفیا اور علما کے نام ملتے ہیں جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔حاجی رومی،شاہ مومن،باباسید مظہر عالم،شاہ جلال الدین گنج رواں،سید احمد کبیر حیات قلندر،باباشرف الدین،بابا شہاب الدین وغیرہ وہ حضرات ہیں جو سرزمین جنوبی ہندپر تبلیغی وروحانی کام بھی کررہے تھے۔تیرہویں صدی عیسوی میںعلاء الدین خلجی کی فوجیں شمالی ہند سے جنوبی ہند پہنچتی ہیں۔اس میں فوج کے علاوہ اہل ہنر، تاجر،صوفی اور فقیر بھی شامل ہیں۔پیر مقصود، پیر جمنا، شاہ منتخب الدین زر زری بخش ، پیر میٹھے، خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتال، شاہ برہان الدین غریب، امیر خسرو کے دوست امیر حسن سنجری شیخ فرید الدین وغیرہ اہل شمال نے جنوبی ہند کے الگ الگ علاقوں میں مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے زبان کے اظہار کی تمام مشکلیں دور ہو گئیں۔

چودہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اردو زبان بول چال کی ایک رواں زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔دکن کے مختلف علاقے جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں ،شمالی ہند کی عام استعمال کی بول چال کی اردو سے واقف ہوچکے تھے۔1327ء میں دوسرا اہم واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اردو جنوبی ہند میں بڑے وسیع پیمانے پر پھیلنے لگی۔سلطان محمد تغلق کا یہ فیصلہ کہ ملک کا پایۂ تخت دہلی کی بجائے دیوگیری (دولت آباد) بنایا جائے،تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے لیکن زبان کے اعتبار سے بھی اردو کے حق میں یہ فیصلہ بہت ہی سود مند اور کار آمد ثابت ہوا۔بادشاہ کے حکم پر کئی صوفیا، علما، شعرا، ادیب، سپاہی پیشہ اور دیگر فن کار دیوگیری پہنچے ان میں سے بہت سے یہاں بس گئے۔ان کی علمی زبان تو فارسی تھی لیکن عام بول چال کی زبان اردو تھی۔یہ زبان کھڑی بولی پر مبنی تھی اور اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی آمیزش تھی۔ چودہویں صدی کے ربع دوم میں جب تغلق حکمران دہلی میں زوال پذیر ہوگئے تو جنوبی ہند میں ان کی گرفت کمزور ہوگئی۔

8.2.1 بہمنی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر:

خاندان تغلق کے زوال کے بعد،ہندوستان کے مختلف علاقے خود مختار ہوگئے چنانچہ 1347ء میں سر زمین دکن پر علاء

الدین حسن بہمنی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ بہمنی خاندان میں کوئی اٹھارہ حکمران ہوئے جنھوں نے کم وبیش دوسوسال تک حکمرانی کی اور جنوبی ہند کو ایک نئے تہذب و تمدن سے آگاہ کیا۔ جس زمانے میں بہمنی سلاطین نے جنوبی ہندمیں تہذیب وتمدن کی شمع جلائی یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کا تمدن دنیا کا اعلیٰ ترین تمدن سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح بہمنی خاندان کی جنوبی ہند حکمرانی سے مراد ایک انتہائی ترقی یافتہ قوم کی حکمرانی تھی جو جنوبی ہندوستان میں قیام پذیر تھی۔

جس خطے پر بہمنی خاندان نے حکومت کی 'اس میں تین زبانیں بولنے والے لوگ آباد تھے یعنی یہ علاقہ تلنگانہ 'کرناٹک اور مہاراشٹرا کے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ ان علاقوں پر متعدد چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی حکومتیں قائم تھیں، جو آپس میں بر سر پیکار رہتی تھیں۔ بہمنی سلاطین نے جنوبی ہند میں بسنے والی ان چھوٹی چھوٹی قوموں کومتحد کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان میں قومی اتحاد اور یکجہتی کے تصور کو فروغ دیا اورعلوم وفنون کی روشنی پھیلائی۔ اس طرح بہمنی حکومت کا قیام جنوبی ہند کے لیے،ایک نئے شاہی خاندان کی حکومت کا آغاز ہی نہیں تھا بلکہ ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن اور اعلیٰ نظریہ حیات کی روشنی سے مستفید ہونے کا ایک عظیم موقع بھی ثابت ہوا۔ بہمنی سلاطین کے زمانے میں جنوبی ہند کا علاقہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عراق'ایران'ترکستان اور افغانستان کے عالموں اور باکمالوں کے لیے باعث کشش بن گیا۔ آئے دن دور دراز ملکوں کے شاعر'علما اور فن کار قدر دانی کی توقع میں، جنوبی ہند میں وارد ہوا کرتے تھے۔ بہمنی حکمرانوں نے،جن میں اکثر علم وادب اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی قدر داں گزرے ہیں،ہر خطے کے شاعروں،عالموں اور ہنرمندوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور صحیح معنوں میں،جنوبی ہند میں ایک بین الاقوامی تمدن کی بنیاد ڈالی۔ سلاطین دکن نے اپنی حکمرانی کے طویل عہد میں علم کی توسیع اور اس کی اشاعت کی جانب بڑی توجہ کی تھی۔ بہمنی حکمرانوں میں محمد شاہ اور فیروزشاہ نے علم کی ترقی و ترویج میں جو حصہ لیا وہ تابناک ہے۔ یہ دونوں بادشاہ خود صاحب علم اور علم دوست تھے۔

بہمنی خاندان کا آٹھواں حکمران فیروز شاہ بہمنی نہ صرف ایک بے مثال مدبراور کامیاب بادشاہ تھا بلکہ بے حد ذہین اور دور اندیش بھی تھا۔ اس فرماں روا کے دور حکومت میں،جنوبی ہندکا علاقہ اپنے بین الاقوامی تمدن کے لیے غیر معمولی شہرت اختیار کرگیا۔ فیروز شاہ بہمنی نے اپنی سلطنت میں بسنے والے تمام طبقات' جو مختلف رنگ ونسل سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے'کے مابین یکجہتی اور اتحاد پیدا کرنے کی تحریک چلائی۔ اسی تحریک کے زیر اثر بعد کے زمانے میں اکبر اعظم نے دہلی میں'محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ میں اور ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بیجاپور میں اسی بین الاقوامی تمدن کو رائج کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ بہمنی دور کی اس عظیم الشان یونیورسٹی کے کھنڈر آج بھی آثارقدیمہ کی حیثیت سے باقی ہیں اور دیکھنے والوں کے لیے اپنی عظمت اور شان وشوکت کا مرثیہ سناتے ہیں جسے مدرسہ محمود گاواں کہا جاتا ہے ۔بیدر کا مدرسہ محمود گاواں کئی سوسال تک تشنگان علم کا مرکز رہا۔

بہمنی دور اردو ادب کا قدیم ترین عہد ہے۔ اس عہد کے اہم ادیبوں اور شاعروں میں خواجہ بندہ نواز' فخردین

نظامی،مشتاق،میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، محمود اور فیروز بیدری کے نام قابل ذکر ہیں۔دکنی کے سب سے پہلے شاعر اور نثر نگارخواجہ بندہ نواز فیرزشاہ بہمنی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ اسی(80) سال کی عمر میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے تھے۔خواجہ بندہ نواز دہلی کے مشہور صوفی حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ اور خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کے سب سے اہم شاگرد اور خلیفہ تھے۔ان سے ایک تصنیف "معراج العاشقین"منسوب ہے،جسے سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے شائع کیا تھا۔لیکن یہ کتاب ان کی نہیں ہے بلکہ بعد کے دور کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی ہے۔اس کے علاوہ نظم و نثر کے چند اور چھوٹے چھوٹے رسالے جیسے شکارنامہ،تلاوت الوجود،چکی نامہ وغیرہ بھی خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہیں لیکن کسی بھی تصنیف کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خواجہ صاحب ہی نے تحریر کی ہے۔ان سے منسوب تمام رسائل دکنی اردو میں ہیں اور ان کا موضوع تصوف ہے۔

فخردین نظامی بیدر کا متوطن اور بہمنی دور کا ایک اہم شاعر ہے۔اس کی مثنوی"کدم راؤ پدم راؤ"اردو کی اولین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔یہ مثنوی بہمنی خاندان کے مشہور حکمران سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی۔اس لیے اس کی زبان بھی آج کی زبان سے الگ اور مشکل معلوم ہوتی ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے یہ انداز ہ لگانا دشوار نہیں کہ نظامی ایک قادرالکلام اور پر گوشاعر تھا۔زبان وبیان پر اسے بے پناہ قدرت حاصل تھی،اس نے اپنی مثنوی میں ضرب الامثال اور محاوروں کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔مثنوی"کدم راؤپدم راؤ" کو اردو زبان کی تاریخ میں،اس لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اردو کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔اس سے پہلے کی جو تحریر یں دستیاب ہوئی ہیں سب کی سب تصوف اور مذہب سے متعلق ہیں۔صرف اس مثنوی میں اد بیت کی چاشنی نظر آتی ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے ایک بہت بڑے صوفی اور شاعر ہیں۔خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ صوفیاسے تعلق رکھتے ہیں۔شمس العشاق نے اپنے بزرگوں کی طرح درس وتدریس اور تصنیف کے لیے دکنی زبان کا استعمال کیا۔ان کی تصانیف میں مغزمرغوب،شہادت الحقیق،خوش نامہ اور خوش نغز مشہور اور اہم ہیں۔میراں جی شمس العشاق کی سبھی تصانیف کا موضوع تصوف ہے۔انہوں نے اپنے مریدوں، معتقدوں اور عام لوگوں کی تلقین و ہدایت کے لیے بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔

بہمنی عہد کے اہم اور باکمال شعرا میں سید شاہ اشرف بیابانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کی تصانیف میں نوسرہار،لازم المبتدی اور واحد باری ہیں۔اشرف بیا بانی کی سب سے اہم اور قابل ذکر مثنوی نوسر ہار ہے۔یہ مثنوی نو ابوب اور بیس فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔اس کا موضوع شہادت حضرت امام حسین اور واقعہ کربلا کا بیان ہے۔اس مثنوی کے ہر باب کو گو یا ایک انمول ہار کہاگیاہے۔اور اسی مناسبت سے اس کا نام "نوسرہار"تجویز کیا گیا ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوسر ہار مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی تھی اسی لیے اس میں سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔

بہمنی دور کے آخری عہد میں فیروز بیدری نے ایک باکمال سخن ور کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔اس کی ایک مختصر سی مثنوی پرت نامہ کے علاوہ چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔لیکن گولکنڈہ کے بلند پایہ شاعروں مثلاً محمد قلی قطب شاہ،وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے اپنے کلام میں جس انداز سے فیروزؔ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا کہ فیروزؔ بیدری اپنے وقت کا ایک استاد سخن تھا۔فیروزؔ کا ہم عصر محمودؔ تھا جس نے دکنی کے علاوہ پنجابی اور فارسی میں شاعری کی۔اسے بھی استاد مانا گیا۔

بہمنی دور کے دیگر شعرا میں قریشی بیدری،مشتاقؔ اور لطفیؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔قریشی نے ایک مثنوی "بھوگ بل"اپنی یادگار چھوڑی ہے۔مشتاقؔ اور لطفیؔ کی چند غزلیں اور قصیدے دستیاب ہوئے ہیں۔

8.2.2 عادل شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر :

پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب بہمنی حکومت کو زوال ہوا تو جنوبی ہند میں پانچ نئ اور خود مختار سلطنتوں کا قیام عمل میں آیا۔بیجاپور میں عادل شاہی،گولکنڈہ میں قطب شاہی احمد نگر میں نظام شاہی،برار میں عماد شاہی اور بیدر میں برید شاہی سلطنت قائم ہوئی۔ان ریاستوں میں بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی مملکت کو،اردو ادب کے ارتقا کے علاوہ سماج، تہذیب وثقافت کی ترقی کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

عادل شاہی سلاطین نے قطب شاہی حکمرانوں کی طرح نہ صرف دکنی شعرو ادب کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی بلکہ مقامی تہذیبی رجحانات اور اقدار کی ترویج واشاعت میں بھی اہم حصہ لیا۔اس خاندان کے تمام سلاطین صاحب سیف وقلم اورمیدان کار زار کے سورما ہونے کے علاوہ علوم و فنون اور شعر وسخن کے رسیابھی تھے۔یوسف عادل شاہ سے سکندر عادل شاہ تک،عادل شاہی خاندان کے نو(9)فرمان رواؤں نے کم و بیش دو سو سال تک بیجاپور پر حکمرانی کی۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔بہمنی سلطنت جب کمزور ہوگئی تو اس نے1490ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔یوسف عادل شاہ کا زیادہ تروقت اگرچہ کہ سلطنت کے استحکام میں گزرا لیکن اس کے باوجود اس نے شاعروں، ادیبوں اور اہل فن کی سرپرستی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا ذوق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔وہ طبلہ،ستار،طنبورہ اور عود خوب بجاتا تھا ساتھ ہی ساتھ اسے فن موسیقی،عروض وقافیہ میں بھی مہارت تھی۔علما، فضلا اور اہل ہنر کا بڑا قدر دان تھا۔اس نے کئی قلعے اور خوب صورت عمارتیں بنواکر شہر بیجاپور کی زینت بڑھائی۔اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں فرخ محل اور آنند محل کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یوسف عادل شاہ کی وفات کے بعد،اس کا فرزنداسمٰعیل عادل شاہ 1518ء میں بیجاپور کے تخت کا وراث بنا۔اسمٰعیل بھی اپنے والد کی طرح ادب نواز اور رعایا پرور حکمران تھا۔اس کو بھی فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ تھا۔فارسی میں شعر کہتا تھا۔شاعری،موسیقی اور نقاشی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔اسمٰعیل عادل شاہ کو فارسی اور ترکی سے غیر معمولی دلچسپی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے ایک شہر کا نام چندا پور اورایک محل کانام چمپا محل رکھا،جس سے اس کی مقامی تہذیب

وتمدن سے اثر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔اسمٰعیل عادل شاہ کے انتقال کے بعداس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ مملکت بیجاپور کے تیسرے حکمران کی حیثیت سے1534ء میں تخت نشین ہوا۔اگرچہ ابراہیم خود شاعر نہیں تھا لیکن اپنے آباد اجداد کی طرح ذوق علم وادب سے بہرہ مند تھا۔شاعروں'عالموں اور اہل فن کار کا بڑا اقدر دان تھا۔

ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند اور عادل شاہی دور کا چوتھا حکمران علی عادل شاہ1557 ء میں تخت نشین ہوا۔اس حکمران کے دور میں علم و فن اور شعر و سخن کو خوب ترقی ہوئی۔وہ بڑا اولوالعزم اورصاحب تدبیربادشاہ تھا۔علی عادل شاہ شعرا اور اہل علم کی سر پرستی میں اپنے آبا و اجداد سے بھی آگے تھا۔اس کے ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ وہ سفر میں بھی کتابوں کے صندوق اپنے ساتھ رکھتاتھا۔اس کے دور میں رفاہ عام کے بہت سے کام ہوئے۔اس نے کئی مسجدیں 'قلعے اور محلات تعمیر کروائے۔اس کے دور میں صنعت و حرفت اور تجارت کو کافی فروغ ہوا۔شاہ پور جس کو خود بادشاہ نے بسایا تھا، بہت بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔

علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور سلطنت بیجاپور کا پانچواں تاجدار ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں بیجاپور کے تخت کا وارث بنا۔وہ بھی نہ صرف صاحب علم و فضل تھا بلکہ مصوری،نقاشی،موسیقی،شاعری اور خطاطی میں بھی قدرت رکھتا تھا۔اسی وجہ سے اس کو"جگت گرو"کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔کتاب ''نورس''ابراہیم عادل شاہ ثانی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے اس کے شاعرانہ کمال اور فن موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے با کمال دکنی شعرا میں عبدلؔ بیجاپوری اور مقیمیؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد،اس کا فرزند محمد عادل شاہ 1226ء میں سر یر آرائے سلطنت بنا۔اس نے اپنے والد کی قائم کردہ تمام روایات کو برقرار رکھا اور اہل علم و ادب اور اہل فن کی قدر دانی میں اپنے آباوجداد سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔اس دور کے شاعروں میں رستمی،ملک خوشنود،ظہورابن ظہوری،صنعتی،حسن شوقی وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مملکت بیجاپور کا ساتواں حکمران علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ 1656ء میں بیجاپور کے تخت پر رونق افروز ہوا،دیگر عادل شاہی سلاطین کی طرح شاہیؔ بھی ایک علم دوست اور ادب نواز بادشاہ تھا،اس کو شاعری،موسیقی اور فن تعمیر سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔وہ دکنی اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔وہ نورس 'کی طرز کے راگ اورگیت لکھنے پر بھی مہارت رکھتا تھا۔شاہیؔ کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں میں حسینی محل،بادشاہ محل،جامع مسجد،حسینی مسجد،عرش محل اور علی داد محل قابل ذکر ہیں۔اس کے دربار سے ملک الشعرا ملا نصرتی،امین الدین اعلیٰ،ہاشمی اور مرزا جیسے اردو کے سخن ور وابستہ تھے۔علی عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد سکندر عادل شاہ 1672ء میں مملکت کا وارث بنا۔اس حکمران کا دور اندرونی اور بیرونی خلفشا رکی وجہ سے اضطراب اور بے چینی کا زمانہ تھا۔شیواجی اور اورنگ زیب کے حملوں کی وجہ سے مملکت بیجاپور کو زبر دست خطرہ لاحق ہوگیا تھا اور آخر کار 1656ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت کے ایک صوبے

میں شامل کرلیا لیکن ایسے پر اضطراب عہد میں بھی علم وفن، تہذیب وتمدن اور شعروسخن کا چراغ برابر جلتا رہا۔سکندر عادل شاہ کے عہد کے شاعروں میں عبد اللطیف،سیوا، مومن اور معظم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

عادل شاہی دور اردو ادب کے ارتقا کے سلسلہ میں ایک نمایاں مقام رکھتاہے۔اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو کو مختلف ارتقائی منزلوں سے روشناس کیا اورمختلف اصناف شعر جیسے غزل،مثنوی،قصیدہ،رباعی کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی با قاعدہ توجہ کی۔لیکن مجموعی حیثیت سے شاعری کا پلہ نثر نگاری کے مقابلے میں بھاری ہے۔عادل شاہی دور کے کم وبیش تمام حکمران علم وادب اور شعروسخن کے سرپرست اور دلدادہ تھے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو اور عادل شاہ ثانی شاہیؔ کو اس خاندان کے دیگر فرمانرواؤں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ دونوں نے نہ صرف عالموں،شاعروں،ادیبوں اور اہل فن کاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی بلکہ دونوں موسیقی اور فن کے قدر دان بھی تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی شعر کہتے تھے،خصوصاً علی عادل شاہ شاہیؔ کو بہ حیثیت شاعرایک اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل ہے۔شاہی کے علاوہ اس عہد کے دیگر اساتذہ سخن میں حسن شوقی،ملک الشعرانصرتی اور ہاشمی بیجاپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔حسن شوقی قدیم دکنی کے دو یاتین اہم غزل گو شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔غزلوں کے ایک دیوان کے علاوہ اس کی دومثنویاں "فتح نامہ نظام شاہ"اور"میزبانی نامہ"ہیں۔

حسن شوقیؔ ایک باکمال مثنوی نگار اور اعلیٰ پایہ غزل گوتھا۔"فتح نامہ نظام شاہ "(1564ء)دکنی اردو کی ایک قدیم ترین مثنوی ہے۔جس میں نظام شاہ کوقصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرا اسی کے سرباندھا ہے حالاں کہ اس جنگ میں وجیانگر کے راجارام کے خلاف چار بادشاہوں(ابراہیم قطب شاہ' علی عادل شاہ اول،حسین نظام شاہ اور علی برید شاہ) نے فتح حاصل کی تھی۔

"میز بانی نامہ" میں محمد عادل شاہ کی اس شادی کو موضوع بنایا گیاہے جو نواب مظفر خاں کی دختر سے ہوئی تھی۔اس مثنوی میں محمد عادل شاہ کی علم پروری اور اہل علم وہنر کی قدر دانی اور اس کی شجاعت وفیاضی کا بھی تذکرہ ملتا ہے حسن شوقیؔ کو غزل گو کی حیثیت سے دکنی اردو کے شاعروں میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اس کی غزلیں قدیم اردو شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کی ترجمانی کرتی ہیں۔سادگی' روانی' موسیقیت اور نغمگی حسن شوقیؔ کی غزل کا نمایاں وصف ہے۔

نصرتیؔ عادل شاہی عہد کے عظیم المرتبت شعرا میں شمار ہوتا ہے۔نصرتیؔ نے شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی اور ملک الشعرا کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔نصرتیؔ کی تین مثنویاںگلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ ا سکندری کے علاوہ غزلوں،قصائد اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔

"گلشن عشق"ایک بزمیہ مثنوی ہے۔جس میں کنور منوہر اورمدمالتی کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔جب کہ" علی نامہ" رزمیہ شاعری کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔اس مثنوی میں سات بلند پایہ اور معرکتہ الآرا قصیدے بھی شامل ہیں۔نصرتیؔ

ایک بے مثال قصیدہ گو،بلند پایہ مثنوی نگار اور باکمال غزل گو بھی تھا۔قصیدہ نگاری کے میدان میں دبستان دکن کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کا نہیں ہے۔اگر چہ اس کے قصائد کی تعدادزیادہ نہیں ہے لیکن بلندی تخیل،شوکت لفظی اور گھن گرج کے نقطہ نظر سے نصرتیؔ کے قصائد نہ صرف دبستان دکن بلکہ قصیدہ نگاری کی تاریخ میں بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

بیجاپور سلطنت کا آٹھواں تاجدار سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نہ صرف ایک عظیم الشان مملکت کا مطلق العنان حکمران تھا بلکہ قدیم دکنی زبان کا ایک صاحب دیوان شاعر اور سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔شاہیؔ نے کم وبیش تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔اس کے کلیات میں غزلوں،قصیدوں اور مثنویوں کے علاوہ گیت،دوہرے گیت اور جھولنا بھی ملتے ہیں۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے شاہی عادل شاہی دور کے اہم متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔اس کے قصیدے بھی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔شاہیؔ کے کلام میں مقامی تہذیبی روایات اور مقامی ماحول کی بھر پور ترجمانی ملتی ہے۔اس نے اپنے تجربات زندگی ،مشاہدات اور احساسات کو سادگی اور روانی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہاشمیؔ،عادل شاہی دور کے آخری دورکے شعرامیں ایک پر گو اور باکمال شاعر تھا وہ نابینا تھا۔اس نے اورنگ زیب عالم گیر کے صوبہ دار نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کی مدح میں قلعہ چینجی کی فتح(1698ء)کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔ہاشمیؔ نے ریختی میں ایک مکمل دیوان اپنی یاد گار چھوڑا ہے،جوشائع ہوگیاہے اس کی غیر مطبوعہ تصانیف میں مثنوی "یوسف زلیخا" (1687ء) معراج نامہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کی ایک مختصر ہجویہ مثنوی بھی شائع ہوئی ہے۔مثنوی "یوسف زلیخا" تقریبا پانچ ہزار ابیات پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی ہے۔عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے دیگر شعرا نے بھی یوسف زلیخا کو موضوع بناکر اور بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن اس موضوع پر سب سے بلند پایہ مثنوی ہاشمی بیجاپوری کی ہی ہے۔ہاشمی ایک بے مثال مثنوی نگار،بلند پایہ غزل گو اور با کمال قصیدہ نگار بھی تھا۔

عادل شاہی دور کے شاعروں نے اگر چہ غزل،قصیدہ،مرثیہ اور رباعی کی صنف پر بھی باقاعدہ توجہ دی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی، مثنوی کی صنف ہی تمام اصناف سخن پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔اس دور کے دیگر قابل ذکر مثنویوں میں برہان الدین جانمؔ کی ارشاد نامہ، عبدلؔ کی ابراہیم نامہ' مقیمیؔ کی چندربدن و مہیار 'ملک خوشنودؔ کی جنت سنگار 'رستمیؔ کی خادرنامہ' علی رحمتی کی "پنددل بند"ایاغیؔ کی نجات نامہ' صنعتیؔ کی قصۂ بے نظیر اور عاجزؔ کی لیلیٰ مجنوں کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

عادل شاہی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی با قاعدہ توجہ کی گئی لیکن جہاں تک عشقیہ موضوعات اور ادبیات کا تعلق ہے،نثر نگاری کے مقابلے میں شاعری کا پلہ بھاری نظر آتاہے۔اس دور کی کم و بیش تمام نثری تصانیف چوں کہ صوفیائے کرام کی تخلیقات ہیں اس لیے ان پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔عادل شاہی دور کی نثری تصانیف میں جانمؔ کی کلمتہ الحقائق' امین الدین اعلیٰ کی کلمتہ الاسرار 'معظم بیجاپوری کی شرح شکار نامہ اہمیت رکھتی ہیں۔

8.2.3 قطب شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر:

قطب شاہی مملکت کا بانی فرماں رواسلطان قلی تھا۔اس کے آباواجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔اس خاندان کے

بعض افراد،ترکستان سے ایران اور ہندوستان منتقل ہوگئے۔سلطان قلی بہمنی مملکت کے حکمران محمد شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر آیا اور دربار شاہی میں ملازمت اختیار کرلی سلطان قلی نے اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت خوب ترقی کی۔1496ء میں اس کو تلنگانہ کا صوبیدار بنایا گیا۔اپنی صوبیداری کے دور میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے تلنگانہ کے عوام میں کافی شہرت حاصل کی۔جب بہمنی سلطنت زوال آمادہ ہوگئی تو 1518ء میں سلطان قلی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔سلطان قلی کو بڑھاپے میں اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کروایا اور جمشید قطب شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔جمشید قلی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا لیکن سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے اہل دربار کا ایک طبقہ اس کی حکومت کے خلاف ہوگیا اور سبحان قلی کی چند مہینوں کی بادشاہت کے بعد سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قطب شاہ کو1550ء میں تخت نشین کیا گیا۔ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد گولکنڈہ کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ابراہیم قطب شاہ کے دور میں اس ریاست کو بڑا استحکام حاصل ہوا۔اس نے نظم ونسق میں مفید اصلاحیں کیں۔ابراہیم کی زندگی کا بڑا حصہ چوں کہ ایک تلگو ریاست وجیانگر میں بسر ہواتھا۔اس لیے اس کے مزاج میں مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔یہی وجہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین بڑی یکجہتی وہم آہنگی پیداہوگئی تھی۔ابراہیم قطب شاہ کو فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ تلگو زبان سے بھی دلچسپی تھی تلگو شاعروں میں وہ بالعموم "ملکی بھرام "کے نام سے مقبول تھا۔اردو ادب کی تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس دور میں گولکنڈہ کی سرزمین پر پہلی بار شعر وادب کی شمع روشن ہوئی۔قطب شاہی دور کے اولین شعرا فیروزؔ، محمودؔ اور ملاخیالیؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند سلطان محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں گولکنڈہ کے تخت پر رونق افروز ہوا۔اس کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقت ور سلطنت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی اور اس کا دور حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر بڑی حدتک امن و امان میں گزرا۔محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک خوش نما شہر کا بانی،رعایا پرور حکمران اور دکنی تہذیب و تمدن کا معمار تھا بلکہ قدیم اردو کا ایک خوش گو شاعر بھی تھا۔اس کے عہد میں ایران کے ایک مشہور عالم میر محمود مومن حیدر آباد آئے تھے،جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔مملکت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی میر محمد مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی امور سے بڑی حدتک بے فکر اور آزاد رہ کر عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔وہ ایک طرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے تو دوسری طرف اپنے دور کا ایک باکمال خوش نویس بھی۔محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی متعدد عمارتوں میں ثلث،کوفی،نسخ،نستعلیق،طغراوغیرہ نہج خط کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔جس تہذیب وتمدن کو "ہند المانی کلچر" کے نام سے یاد

کرتے ہیں اس کے نمایاں خدوخال سلطان محمد قلی قطب شاہ،اکبر اعظم اور ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کے عہد ہی میں نظر آتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی انسان دوستی اور مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں کی سرپرستی میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔اس کے با اعتماد مشیروں،مقربین اورعمائدین سلطنت میں بہت سے ہند وبھی شامل تھے۔اس کے عہد حکومت میں‌متعدد مسجدیں،خانقاہیں،عاشور خانے،محلات شاہی اور با غات بنوائے گئے۔اس کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدر آباد کی تاسیس ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد،اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈہ کا بادشاہ بنا۔وہ بھی اپنے آباوجداد کی طرح علوم وفنون کا بہت شوقین تھا لیکن اس کا مزاج وکردار محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں‌قدرے مختلف تھا۔ محمد قلی قطب شاہ شعر وادب اور رقص و موسیقی کا دلدادہ تھا جب کہ محمد قطب شاہ کو فنون لطیفہ سے کہیں زیادہ مذہبی علوم،فلسفہ اور تاریخ سے کافی دلچسپی تھی۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں مکہ مسجد کی تاسیس اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔اگرچہ اس مسجد کی تعمیر پشتوں کے بعد مکمل ہوئی۔لیکن اس کا سنگ بنیاد خود محمد قطب شاہ ہی نے اپنے دست مبارک سے رکھاتھا۔سلطان محمد قطب شاہ کے بنوائے ہوئے دیگر محلات میں امان محل اپنی آرائش وزیبائش کے اعتبار سے بہت مقبول تھا۔

محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد،عبداللہ قطب شاہ 1625ء میں سلطنت گولکنڈہ کے ساتویں حکمران کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح علم و ہنر،شعر وادب اور رقص و موسیقی کا قدر داں تھا۔وہ خود بھی ایک صاحب دیوان شاعر تھا اس نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی قائم کردہ تمام سماجی،تہذیبی اور ادبی روایات کو ازسر نوجلا بخشی۔سلطان عبداللہ کو محمد قلی قطب شاہ کی طرح مذہبی اور غیر مذہبی تقاریب اور تہوار وں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ان تقاریب کے موقع پر زر کثیر خرچ کرکے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح اس نے متعدد باغ اور شاہی محلات تعمیر کر وائے تھے۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا داماد اور مملکت گولکنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ 1672ء میں تخت نشین ہوا۔اس کے دور حکومت میں مرہٹوں اور مغلوں کی یورش کی وجہ سے گولکنڈہ میں‌بے اطمینانی،اضطراب اور انتشار پیدا ہوگیا تھا۔جنوبی ہند کی سیاسی تاریخ کے ایسے نازک عہد میں شاہ ابوالحسن نے حکمت عملی اور تدبرکام لیتے ہوئے ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔یہاں تک کہ1686ء میں مغل حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

قطب شاہی دور کے اولین شعرا میں فیروزؔ،محمودؔ اور خیالیؔ کے نام ملتے ہیں یہ تینوں شعراابراہیم عادل شاہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔فیروزؔ دراصل بیدر کا باشندہ تھا اور بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں گولکنڈہ چلاآیا۔گولکنڈہ آنے سے قبل وہ بیدر کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔گولکنڈہ کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔فیروزؔ کی

گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ ولیؔ کا سفر دہلی ،جس کے بعد شمالی ہند میں اردو کا چراغ روشن ہوا۔فیروزؔ کی مختصر سی مذہبی رنگ کی مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔فیروزؔ کی طرح سید محمودؔ اور خیالیؔ بھی قطب شاہی دور کے ابتدائی اہم شاعر تھے جنھیں دکنی کے بلند پایہ شعرا محمد قلی قطب شاہ،وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے استاد سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔محمودؔ اور خیالیؔ کی دو تین غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔

قطب شاہی دور کے نامور اور باکمال شاعروں اور ادیبوں میں ملک الشعرا اسداللہ وجہیؔ،سلطان محمد قلی قطب شاہ،ملک الشعرا غواصیؔ اور ابن نشاطیؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

اسداللہ وجہیؔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت کا ملک الشعرا اور قدیم اردو دکنی زبان کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور بلند پایہ ادیب بھی تھا۔وجہیؔ کی اہم شعری تصنیف " قطب مشتری"(1609ء) ہے۔اس مثنوی میں محمد قلی اور بنگالہ کی شہزادی مشتری کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔عشقیہ شاعری میں ڈوبی ہوئی اس طبع زاد مثنوی میں وجہیؔ نے سلطان وقت محمد قلی قطب شاہ کے مزاج و کردار،شجاعت، فیاضی اور جذبۂ محبت کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔اس مثنوی کے مطالعہ سے وجہیؔ کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

وجہی کی دوسری اہم تصنیف '' سب رس ''ہے۔دکنی ادب کی یہ معرکتہ الارا تصنیف سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635ء میں لکھی گئی یہ داستان ایک فارسی تصنیف "حسن ودل" کے قصہ پر مبنی ہوتے ہوئے بھی ایک تخلیقی شاہکار کہی جاسکتی ہے۔کیوں کہ وجہیؔ نے پیچیدہ اور خشک فلسفیانہ مسائل کو ادبی حسن کے ساتھ دکنی اردو میں بیان کیا ہے۔''سب رس'' قدیم اردو کی ایک داستان ہی نہیں بلکہ اردو نثر کے دو یا تین منتخب پاروں میں شمار کی جاتی ہے۔یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں مختلف انسانی جذبات و احساسات یا انسانی صلاحیتوں اور قوتوں مثلاً عقل،دل،خیال،غصہ،حسد وغیرہ کو کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔سب رس کا اسلوب مقفٰی ہوتے ہوئے بھی سادہ وپر کار ہے۔بعض مقامات پر وجہی نے انشائیوں کی صورت میں ،حقائق حیات کے متعلق فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات بیان کیے ہیں جس کی وجہ سے یہ داستان زندہ جاوید ہوگئی ہے۔قطب مشتری اور سب رس کے علاوہ وجہیؔ نے چند اردو غزلیں اور ایک فارسی دیوان بھی اپنی یاد گار چھوڑا ہے۔ایک اور نثری تصنیف "تاج الحقائق" بھی وجہیؔ سے منسوب کی جاتی ہے۔

قطب شاہی سلطنت کا پانچواں حکمران،محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں غزل،قصیدہ،رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔جہاں تک غزلوں کی تعداد اور تنوع کا تعلق ہے،محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا سب سے اہم شاعر قرار پاتا ہے۔اس کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت سادگیٔ بیان ہے۔اس نے اپنے جذبات،احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی،روانی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔محمد قلی قطب شاہ کی شاعری گویا اس کی زندگی کا آئینہ ہے جس میں اس کے واقعات حیات کی متحرک تصویریں

دیکھی جاسکتی ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں درد و غم اور ہجر وفراق کی کیفیات کی ترجمانی تقریباً نہیں ملتی۔اس لحاظ سے وہ اردو کا ایک منفرد شاعر ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی نجی سماجی اور سیاسی زندگی کے تجربات کو اپنے کلام میں بے کم وکاست بے نقاب کیا ہے۔اس نے عید میلاد،شب معراج،شب برات جیسے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور بسنت،دیوالی اور ہولی پر بھی۔لیکن یہ ساری تقاریب خواہ وہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا موسمی تہواروں کی،محمد قلی قطب شاہ کے لیے عیش وعشرت کے ایک تازہ عنوان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وجہیؔ اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دبستان گولکنڈہ کے نامور شاعروں میں ملک الشعرا غواصیؔ کا نام قابل ذکر ہے۔غواصی دکنی زبان کا ایک قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر ہے۔وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا،محمد قلی کے عہد میں اس نے شاعری کا آغاز کیا اور بہت جلد ایک پر گو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔عبد اللہ قطب شاہ کے دور میں ترقی کرکے وہ قطب شاہی سلطنت کا ملک الشعرا بن گیا۔تین مثنویوں میناست ونتی، سیف الملک وبدیع الجمال اور طوطی نامہ کے علاوہ غزلوں،قصیدوں،رباعیوں اور مرثیوں پر مشتمل غواصیؔ کا ایک دیوان بھی ہے۔غواصیؔ کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اور ایک نئی طرز کا بانی کہتا ہے۔غواصیؔ کی یہ شاعرانہ تعلّی بے جا نہیں ہے۔غواصی کی تینوں مثنویوں کے قصے طبع زاد نہیں ہیں۔لیکن ا س نے اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں بڑی حد تک طبع زاد مثنویوں کی حیثیت دے دی ہے۔زبان وبیان کی سادگی،تاثر کی فراوانی،ماحول کی ترجمانی اور حقیقت نگاری غواصیؔ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔غواصیؔ نے غزل،قصیدہ اور رباعی کے میدان میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایاہے۔خصوصاً غزل گوئی کے میدان میں قدیم اردو کا کوئی شاعر اس کی برابری کو نہیں پہنچتا۔زبان وبیان کی سادگی،سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی غواصیؔ کے تغزل کا نمایاں وصف ہے۔

دبستان گولکنڈہ کے دیگر شاعروں میں احمدؔ گجراتی،عبد اللہ قطب شاہ،ابن نشاطیؔ،جنیدی،فائزؔ اور طبعیؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

احمد گجراتی نے اپنی دو مثنویاں ”یوسف زلیخا“اور” لیلیٰ مجنوں“محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔عبد اللہ قطب شاہ بنیادی طور پر غزل گوشاعر ہے لیکن اس کی غزلیں اس کے پیش رو شعرا وجہیؔ،محمد قلی قطب شاہ اور غواصیؔ کے مرتبے کو نہیں پہنچتیں۔ابن نشاطیؔ قطب شاہی سلطنت کا ایک اہم مثنوی نگار ہے۔اس کی مثنوی ”پھول بن“ دکنی ادب کی ایک شاہکار تصنیف ہے۔یہ تصنیف وجہیؔ اور غواصیؔ کی مثنویوں کے بعد دبستان گولکنڈہ کی سب سے اہم اور دلچسپ مثنوی ہے” پھول بن “کے مطالعہ سے ابن نشاطیؔ کے کمال فن اور قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جنیدیؔ کی ”ماہ پیکر “، فائزؔ کی ”رضوان شاہ وروح افزا “ اور طبعیؔ کی ”بہرام وگل اندام “دبستان گولکنڈہ کے عہد آخر کی منتخب اور نمائندہ مثنویاں ہیں۔اسی طرح وجہیؔ کے علاوہ قطب شاہی دور کے دیگر نثر نگاروں میں میراں یعقوب اور عابدشاہ حسینی کے نام مشہور ہیں۔

8.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- جنوبی ہند میں علاالدین خلجی کے فتوحات سے بہت پہلے ایسے صوفیا اور علما کے نام ملتے ہیں جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔جیسے شاہ مومن ؛شاہ جلال الدین گنج رواں؛سید احمد کبیر حیات قلندر؛باباشرف الدین، بابا شہاب الدین وغیرہ۔
- تیرہویں صدی عیسوی علاء الدین خلجی کی فوجیں شمالی ہند سے دکن پہنچتی ہیں۔اس میں فوج کے علاوہ اہل ہنر، تاجر، صوفی اور فقیر بھی شامل ہیں۔
- علا الدین خلجی سے فتح دکن کے بعد بعض اہم صوفیوں کے نام ملتے ہیں جیسے شاہ راجو قتال؛ شاہ برہان الدین غریب وغیرہ صوفیائے کرام جنوبی ہند کے مختلف خطوں میں مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے زبان کے اظہار کی تمام دشواریاں دور ہو گئیں۔
- سلطان محمد تغلق نے 1327ء میں پایہ تخت دہلی کے بجائے دیو گیری (دولت آباد) منتقل کیا،لیکن 1347ء میں علاء الدین حسن بہمن شاہ نے جنوبی ہند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا اور اپنی سلطنت کا پایہ تخت دولت آباد کے بجائے گلبرگہ کو منتقل کر دیا۔
- بہمنی خاندان نے دوسو سال تک سر زمین جنوبی ہند پر حکمرانی کی۔بہمنی سلاطین نے علوم و فنون کے رشتہ سے مہا راشٹرا ؛ کرناٹک اور تلنگانہ کے علاقوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کی۔بہمنی سلاطین علم و ادب ؛ شعر و سخن اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی قدر دان تھے۔
- بہمنی دور کے شاعروں اور ادیبوں میں خواجہ بندہ نواز ؛ نظامیؔ بیدری؛ اشرفؔ بیابانی؛ میراں جی شمس العشاق اور فیروزؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔میراں جی شمس العشاق؛ فیروزؔ اور اشرفؔ کی مثنویاں مذہبی اور صوفیانہ موضوعات کی ترجمانی کرتی ہیں جب کہ فخر دین نظامیؔ کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔
- دبستان بیجاپور کے نمائندہ شاعر حسن شوقیؔ،شاہیؔ،نصرتیؔ اور ہاشمیؔ ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔
- حسن شوقی،نصرتی اور ہاشمی بلند پایہ مثنوی نگار بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غزل گوئی کے میدان میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔
- سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے رباعیاں اور مختلف موضوعات پر نظمیں بھی ملتی ہیں۔

- محمد قلی قطب شاہ کا دیوان دراصل اس کی زندگی اور شخصیت کا آئینہ ہے۔سادگی،روانی،برجستگی،سلاست اور حقیقت نگاری محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔
- محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا اسداللہ وجہیؔ اپنے زمانے کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھا۔اس کی طبع زاد مثنوی ”قطب مشتری“ نہ صرف قطب شاہی عہد کی ایک لاجواب تصنیف ہے بلکہ اردو مثنوی کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی مستحق ہے۔
- وجہیؔ ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھا اس کی تصنیف ”سب رس“ نہ صرف دکنی اردو نثر کی شاہکار تخلیق ہے بلکہ اردو نثر کے دو یا تین منتخب نثری شہ پاروں میں شمار ہوتی ہے۔
- محمد قلی قطب شاہ اور وجہیؔ کے بعد قطب شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر غواصیؔ ہے۔اس نے نہ صرف مثنوی نگاری کے میدان میں نمایاں جوہر دکھائے اور”مینا ست ونتی“ ،”سیف الملک وبدیع الجمال“ اور” طوطی نامہ“ جیسی بلند پایہ مثنویاں تصنیف کیں بلکہ قصیدہ نگاری،غزل گوئی اور رباعی گوئی میں اہم مقام حاصل کیا۔
- غواصیؔ کے بعد اس دور کے شعرا میں ابن نشاطیؔ نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔اس کی صرف ایک ہی مثنوی"پھول بن" دستیاب ہوئی ہے۔
- محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بادشاہ بنا۔اس کو زیادہ تر مذہبی علوم اور فلسفہ و تاریخ سے دلچسپی تھی۔اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔وہ علم وہنر،شعر وسخن اور رقص و موسیقی کا دلدادہ تھا۔اس کے بعد سلطان ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا۔یہ اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔اسی کے عہد میں 1686ء میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کیا۔

8.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ہیولیٰ	:	ڈول،ڈھانچ،خاکہ،ماہیت
آمیزش	:	ملاوٹ،ملونی
برسرپیکار	:	جنگ کے لیے آمادہ
شیرازہ	:	انتظام،تنظیم
ضرب المثل	:	وہ جملہ جو مثال کے طورپر کہا جائے،جمع ضرب الامثال
فنون لطیفہ	:	وہ فنون جو انسان کے ذوق آرائش جمال کی تسکین کے لیے وجود میں آتے ہیں
ترویج	:	رواج دینا،اشاعت کرنا

تصنیف و تالیف	:	کتابیں لکھنا، کتابیں مرتب کرنا
تلقین وہدایت	:	تعلیم وتربیت، نصیحت وہدایت
استحکام	:	مضبوطی، پختگی
جگت گرو	:	استاد، عالم
خطاطی	:	خوش نویسی، کتابت
سریر آرا	:	تخت نشین
بزمیہ	:	بزم سے متعلق
رزمیہ	:	رزم سے متعلق
معرکتہ الآرا	:	زبردست، زور آور
مطلق العنان	:	بے لگام، خود مختار
طبع زاد	:	اپنی ایجاد، طبیعت سے نکلا ہوا

8.5 نمونۂ امتحانی سوالات

8.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a) علی عادل شاہ (b) ابراہیم عادل شاہ (c) اسمعیل عادل شاہ (d) یوسف عادل شاہ

2۔ "نورس" کس کی کتاب ہے؟

(a) ابراہیم عادل شاہ ثانی (b) علی عادل شاہ (c) اسمعیل عادل شاہ (d) یوسف عادل شاہ

3۔ "مثنوی گلشن" عشق کس کی تصنیف ہے؟

(a) ملاوجہی (b) نصرتی (c) غواصی (d) ابن نشاطی

4۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a) محمد قلی (b) جمشید قلی (c) سلطان قلی (d) ابراہیم قلی

5۔ "سب رس" کس کی تصنیف ہے؟

(a) ملاوجہی (b) نصرتی (c) غواصی (d) ابن نشاطی

6۔ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد کس نے رکھا؟

(a) محمد قلی قطب (b) جمشید قلی قطب (c) ابراہیم قلی قطب (d) سلطان قلی قطب

7۔ "سیف الملک وبدیع الجمال" کس کی مثنوی ہے؟

(a) ملاوجہی (b) نصرتی (c) غواصی (d) ابن نشاطی

8۔ مثنوی "قطب مشتری" پہلی مرتبہ کب شائع ہوئی؟

(a) 1609 (b) 1615 (c) 1620 (d) 1625

9۔ مثنوی "یوسف زلیخا" کس کی تخلیق ہے؟

(a) ملاوجہی (b) نصرتی (c) احمد گجراتی (d) ابن نشاطی

10۔ "دکن میں اردو" کس کی تصنیف ہے؟

(a) محی الدین قادری زور (b) نصیر الدین ہاشمی (c) سیدہ جعفر (d) محمد علی اثر

8.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ بہمنی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ بہمنی دور میں اردو ادب کے ارتقا کے موضوع پر ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ عادل شاہی دور کے کسی ایک شاعر پر مختصر نوٹ لکھیے۔

5۔ قطب شاہی دور کی مثنویوں کا جائزہ لیجیے۔

8.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ عادل شاہی دور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ قطب شاہی دور کے شعروادب پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ عادل شاہی دور کی مثنویوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

8.6 تجویز کردہ کتابیں اکتسابی مواد

1۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) — ڈاکٹر جمیل جالبی

2۔ تاریخ ادب اردو(۱۷۰۰ء تک)پہلی چار جلد — پروفیسر سیدہ جعفر وپروفیسر گیان چند

3۔ دکن میں اردو — نصیرالدین ہاشمی

4۔ اردو زبان کی تاریخ — مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

8.5.1 کے جوابات: 1-d 2-a 3-b 4-c 5-a

6-a 7-c 8-a 9-c 10-b

اکائی 9: بہمنی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 بہمنی دور میں اردو ادب

9.2.1 حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

9.2.2 فخر دین نظامی

9.2.3 میراں جی شمس العشاق

9.2.4 سید شاہ اشرف بیا بانی

9.2.5 قطب الدین قادری فیروز

9.2.6 سید عبداللہ حسینی

9.2.7 مشتاق

9.2.8 لطفی

9.3 اکتسابی نتائج

9.4 کلیدی الفاظ

9.5 نمونۂ امتحانی سوالات

9.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اس اکائی میں بہمنی دور میں اردو ادب کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس عہد کے اہم شاعروں کے کلام کا

مختصراً جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی بہمنی دور میں صوفیائے کرام کی تعلیمات و ارشادات اور تصنیف و تالیف کے حوالے سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے معلو مات فراہم کی گئی ہیں۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- بہمنی دور کے اہم شاعروں اور مصنفین کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کر سکیں۔
- بہمنی دور کے شاعروں کا مختصر تعارف پیش کر سکیں۔
- بہمنی دور میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں صوفیائے کرام کی خدمات سے متعلق معلومات پر گفتگو کر سکیں۔

9.2 بہمنی دور میں اردو ادب

دکن میں اردو زبان کی نشوونما کے سلسلے میں کچھ سیاسی واقعات اور لسانی اختلاط نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔علا الدین خلجی نے 1310ء تک دکن کو فتح کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔1327ء میں محمد شاہ تغلق نے اپنی سلطنت کے پائے تخت کو دولت آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔محمد شاہ تغلق کا یہ فیصلہ سیاسی لحاظ سے جو بھی حیثیت رکھتا ہو، اردو زبان کی نشوونما کے لیے کار آمد ثابت ہوا۔اس کے حکم پرجب دہلی سے آبادی کا بہت بڑا حصہ دولت آباد منتقل ہوا وہ اپنے ساتھ اردو زبان لے کر آیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جب بادشاہ نے دہلی واپس جانے کا ارادہ کیا تو سبھی لوگ واپس نہیں گئے ،جو یہاں بس گئے وہ اردو زبان بولتے رہے۔آہستہ آہستہ اس پر مقامی زبانوں کا بھی اثر ہونے لگا۔اس تمام عرصے میں‌اردو زبان کا خمیر پورے طور پر تیار ہوچکا تھا اور اس میں اتنی توانائی اور سکت پیدا ہوگئی تھی کہ اسے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا جاسکے۔محمد تغلق کے آخری دورِ حکومت میں ''امیران صدہ'' نے متحد ہوکر بغاوت کردی۔1347ء میں دکن میں تغلق کی بادشاہت ختم ہوگئی اور علا الدین حسن بہمنی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

علا الدین حسن نے اپنی فتوحات سے سلطنت کو بہت وسعت دی تاکہ یہ قدرتی حدودتک پہنچ جائے۔یہ علا الدین کی سیاسی دوراندیشی تھی اوربغیر اس کے سلطنت مستحکم نہیں ہوسکتی تھی۔اس کے انتقال کے وقت بہمنی سلطنت کے حدودشمال میں مانڈو سے شروع ہوکر جنوب میں دریائے تنگ بھدرا تک اور مشرق میں بھونگراور مغرب میں گوداتک پھیلے ہوئے تھے۔

علا الدین حسن ایک علم دوست حکمران تھا۔اس کے دربار میں مولانا لطف اللہ، ملا اسحاق سرہندی،ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیرالدین شیرازی،صدرالشریف سمرقندی اور رضی الدین جگاجوت جیسے نامی علماء جمع تھے۔مولاناعصامی بھی بہمنی دربار کے علماء میں شامل تھے۔مولانا عصامی دکن آئے تو علا الدین نے ان کی بڑی قدرکی۔اس سرپرستی کے باعث

مولانا نے ایک مبسوط تاریخ مثنوی کی ہیئت میں لکھی جو فتوح السلاطین کے نام سے موسوم کی گئی۔ یہ تاریخ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے شروع ہوکر علا الدین بہمنی شاہ پر ختم ہوتی ہے۔ بہمنی شاہ کا انتقال 1358ء میں ہوا۔

علا الدین حسن کا جانشین اس کا فرزند محمد شاہ ہوا، اس کا وزیر سیف الدین غوری تھا جو بادشاہ کا خسر بھی تھا۔ ان دونوں نے مل کر سلطنت کے نظم و نسق کو بہت کچھ سنوارا اور انتظام ملک کے لیے کتاب "نصائح الملوک" لکھی۔

محمد شاہ کو سلطنت کے رعب و داب کا بہت خیال تھا، بڑے اہتمام سے دربار کو آراستہ کیاجاتاتھا۔ تخت فیروزہ اسی کے عہد میں تیارہوا۔ بہمنی سلطنت کوچارصوبوں میں تقسیم کیاگیا اور تمام علاقے کو چوروں اور قزاقوں سے پاک کردیاگیا۔ ملک میں امن و امان قائم تھا۔ اخلاقی اصلاح کے لیے شراب بند کردی گئی تھی۔

محمد شاہ کے بعد اس کا فرزند مجاہد شاہ تخت نشین ہوامگر اس کے چچا داود خاں نے اس کو قتل کرادیااور خود بادشاہ بن بیٹھا مگر چند ماہ کے بعد ماراگیا۔ اس کے بعد محمد شاہ ثانی حکمراں ہوا جو بانیٔ سلطنت حسن خاں کا پوتاتھا۔ مورخین نے اس کے عدل و انصاف کی بڑی تعریف کی ہے' محمد شاہ صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ علامہ فضل اللہ آنجو جیسے صاحب علم جو دنیائے اسلام کے مشہورعلامہ سعد اللہ بن تفتازانی کے شاگرد رشیدتھے، گلبرگہ آئے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر کی۔ محمد شاہ کے زمانہ میں کئی علماء ایران و عراق سے گلبرگہ تشریف لائے۔ حافظ شیرازی کو بھی اسی زمانے میں مدعو کیاگیا تھا لیکن وہ نہ آسکے ، بادشاہ کے عطیہ کے شکریہ میں ایک غزل ارسال کردی۔

محمد شاہ کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر،دولت آباد، ایلچ پور وغیرہ میں مدرسے قائم ہوئے۔ جہاں قابل اساتذہ طلباکو درس دیاکرتے، طلبا کو وظائف دیئے جاتے تھے۔

بہمنی سلطنت کا دوسرا علم دوست صاحب علم بادشاہ فیروز ہے جو 1397ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دورحکومت بہمنی سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانہ میں ایک طرف سیاسی تدبیر اور انتظام نظم و نسق کے لحاظ سے ترقی ہوئی اور دوسری طرف تہذیب و تمدن میں نکھار آتاچلاگیا۔ فیروز شاہ' علامہ فضل اللہ کا شاگرد تھا۔ اس نے ایک طرف علوم اسلامی' تفسیر' حدیث' فقہ' اُصول فقہ وغیرہ علوم میں کافی مہارت پیداکی تھی تو دوسری طرف ریاضی'ہندسہ' ہیئت' فلسفہ وغیرہ علوم میں میں عبور حاصل کرلیاتھا۔ خصوصاً ریاضی سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔

فیروز شاہ شاعر بھی تھا اور ادیب بھی، اس کا تخلص فیروزؔ اور عروجی تھا۔ اس کے علمی ذوق اور شوق کے باعث دربار شاہی میں علماء اور اصحابِ علم کا جمگھٹاہوتاتھا اور جب بادشاہ سلطنت کے کاموں سے فارغ ہوتاتھاتوخود ہی علماء کی محفل میں شریک ہوجاتاتھا۔ بادشاہ کے ریاضی کے شوق کے باعث بالاگھاٹ پر رصدگاہ قائم ہونے والی تھی مگرحکیم حسن گیلانی کی بے وقت موت کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

فیروز شاہ ہفتہ میں تین دن خود طلبا کو درس دیاکرتاتھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طلباء اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ فیروز

شاہ دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھا۔اس نے دریائے بھیما کے کنارے ایک شہر فیروزآباد' آباد کرکے اس کو اپنا بائے تخت قراردیا۔یہاںدریاکے کنارے ایک خوبصورت محل اپنے لیے تعمیر کروایاتھادریاسے ایک نہر بھی نکالی گئی تھی۔

فیروز شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی قلمروکے تینوں حصوں یعنی تلگو، کنڑا اور مرہٹی زبان بولنے والوں کو ایک اسٹیج پر جمع کردیا۔ نظم ونسق کے انصرام کے لیے ان تینوں علاقوں کے قابل اشخاص کو حکومت کے عہدے دیے' ہندو رانیوں سے شادیاں بھی کیں۔مقامی رسم و رواج' رہن سہن کے طور طریقے اپنائے۔ایک مخلوط دکنی کلچر کے بانی کی حیثیت سے فیروز شاہ کا نام تاریخ دکن میں نمایاں ہے۔

فیروز شاہ اپنے فرزند کو بادشاہ بنانے کا خواہش مند تھا' مگر اس کا بھائی احمد شاہ 1422 ء میں تخت نشین ہوا اور دس روز کے بعد فیروز کا انتقال ہوگیا۔احمد شاہ نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔احمد شاہ کے عہد میں شیخ آذری ملک الشعراتھے اور انھوں نے ' بہمن نامہ' کی تصنیف شروع کی تھی۔مشہور مورخ فرشتہ کے مطابق بہمن نامہ کا بڑا حصہ یعنی سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کے عہد تک آذری نے مکمل کردیاتھا۔اس کے بعد ملا نظیری، سنامی اور دوسرے شعراء نے اس میں اضافہ کیا۔

احمد شاہ کے بعد اس کا فرزند علا الدین ثانی پھر ہمایوں شاہ اس کے بعد نظام شاہ اور اور نظام شاہ کے بعدمحمد شاہ ثالث بہمنی تخت پر جلوہ گر ہوئے۔اگرچہ ہمایوں شاہ اپنے جوروستم کے باعث بدنام ہے'مگر اس کے زمانے میں علم کی ترقی بھی ہوئی ' شاہ طاہرا ستر آبادی ملامحمد تقی اور نظیری اس کے درباری شعراء تھے۔

نظام شاہ کے مرنے کے بعد جب محمد شاہ بہمنی تاج اور تخت کا مالک بنا تو اس کی کم سنی کے باعث ملک التجار خواجہ محمود گاواںاور خواجہ جہاں ترک مشیر سلطنت بنے اور صدرجہاں شوستری جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے' بادشاہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کیے گئے۔بقول مورخ فرشتہ فیروزشاہ کے بعد بہمنی خاندان میں محمد شاہ ہی ذی علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔

بادشاہ کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد جب خواجہ جہاں نے غداری شروع کی تو محمد شاہ کی والدہ مخدومہ جہاں نے اس فتنہ کو بڑھنے سے پہلے ختم کردینا چاہا'چنانچہ خواجہ جہاں قتل کروادیاگیا۔اب محمود گاواں ہی برسرِ اقتداررہا۔بہمنی وزراء میں سیف الدین غوری جس طرح نیک نام اور زبردست وزیر اعظم ثابت ہواتھا۔اسی طرح خواجہ محمود گاواں ثابت ہوا۔اس کی فراست اور عقلمندی سے ملک کے حدود میں ترقی ہوئی اور چارصوبوں کے بجائے آٹھ صوبے بنائے گئے' تعلیم کی ترقی کے لیے ایک مدرسہ بیدر میںتعمیر کیاگیا' جس کے عمارت آج بھی موجود ہے۔اس مدرسے میں عالمگیر کے عہد تک برابر تعلیم ہوتی رہی' محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطنت کو انتہائی عروج ہوا اور اس کے بعد ہی زوال شروع ہوگیا۔دراصل محمود گاواں کے قتل کے بعدسلطنت کے زوال کا آغاز ہوا۔

محمد شاہ ثالث کے بعد اس کا لڑکا محمود شاہ اور اس کے بعد علا الدین سوم بادشاہ بنے،لیکن ان کی حکومت برائے نام تھی۔علا الدین سوم کے بعد ولی اللہ اور کلیم اللہ بھی بہمنی سلسلہ میں منسلک ہیں بالآخر کلیم اللہ کے مرنے پر 1527ء بہمنی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

جس وقت بہمنی سلطنت قائم ہوئی اس وقت دکن میں دکنی زبان کا رواج ہوچلاتھا' عوام اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے جو شمالی ہند سے آئی تھی۔سلاطین بہمنیہ نے اس زبان کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی اور اس کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔اردو جو ایک بول چال کی زبان تھی اس دور میں اسے علمی اور تخلیقی زبان کا درجہ اس وقت ملا جب صوفیائے کرام نے عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے اس زبان کا انتخاب کیااور دوسری جانب شعراء نے اپنے احساسات وجذبات، مشاہدات و تجربات، افکار و خیالات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے اردو زبان کو منتخب کیااسے اظہار ذات کا ذریعہ بنایا۔بہمنی دور کے تاریخی پس منظر کے بعد آئندہ سطروں میں ہم بہمنی دور میں اردوئے قدیم یعنی دکنی زبان کی صورت حال اور اس کے ادبی سرمایے سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

بہمنی دور کے ادب کو ہم اردو ادب کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔دکنی ادب میں شعر و ادب کی تخلیق کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔بہمنی دور چودھویں صدی کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اور سولہویں صدی کے اولین پچیس سال پر محیط ہے۔بہمنیوں کی ادب پروری کی طویل داستانیں ہیں جن کی ایک معمولی مثال وہ واقعہ ہے جواکثر تاریخوں میں درج ہے کہ اس خاندان کے ایک بادشاہ سلطان محمد شاہ ثانی نے فارسی کے مشہور شاعرخواجہ حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اوروہ دکن کے ارادے سے نکلے اور جہاز میں سوار ہوئے، لیکن بادِ مخالف سے گھبراکر جہاز سے اتر گئے اور معذرت میں ایک غزل لکھ بھیجی جو بہت مشہور ہے۔

بہمنی دور میں دکنی زبان ادبی زبان کے طور پر ابھرنے لگی۔ایک جانب شاہی سرپرستی نے زبان و ادب کے فروغ میں نہایت اہم رول ادا کیا اور دوسری جانب صوفیائے کرام نے اس زبان کو اسلام کی اشاعت اور رشد و ہدایت کی زبان کے طور پر منتخب کیاجس سے اس کی جڑیں مستحکم ہوئیں۔دکنی زبان کے ابتدائی نمونوں میں صوفیائے کرام کے ملفوظات اور رسائل اردو نثر و نظم کی ہیئت میں موجود ہیں۔اس دور کے اہم شعرا اور مصنفین میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فخر الدین نظامی، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، قطب الدین قادری، فیروزؔ،سید عبد اللہ حسینی، مشتاقؔ اور لطفیؔ وغیرہ شامل ہیں۔

9.2.1 حضرت خواجہ بندہ نوازؒ:

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودرازؒ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے۔اس وقت آپ کی عمر اسّی (80) برس تھی۔حضرت خواجہ بندہ نوازؒ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔دلی میں آپ کے معتقدین بڑی تعداد میں تھے۔آپ نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر دکن کا

رخ کیا۔جب 1400ء میں آپ بہمنی سلطنت کے صدر مقام گلبرگہ تشریف لائے تو خود بادشاہِ وقت فیروز شاہ بہمنی نے آپ کا استقبال کیا اور قدردانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ آپ ہمہ وقت عبادت اور درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ قلیل مدت میں آپ کے معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا۔ آپ کے ارشادات سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔چونکہ عوام کی زبان دکنی تھی اس لیے ان کی سہولت کی خاطر آپ درس دکنی میں دیا کرتے تھے۔ محققین نے آپ کی تصانیف کی تعداد 37 بتائی ہے، جن میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود، شکارنامہ، چکی نامہ وغیرہ شامل ہیں، لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت گیسو دراز کے نام سے دکنی زبان میں جو نثری رسائل ملتے ہیں وہ فی الحقیقت حضرت گیسو دراز کی نہیں ہیں۔البتہ دکنی زبان میں ان کے لکھے ہوئے کچھ صوفیانہ گیت ضرور ملتے ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کو بیجاپور کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ حسینیؒ کی تصنیف قرار دیا ہے۔حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے چکی نامہ لکھا۔دکن میں اردو زبان و ادب کے ارتقا میں آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔خواجہ بندہ نواز کا تخلص شہباز تھا۔ان کی شاعری کے کچھ نمونے یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے — او میرے جیو کا برقع لیا ہے
او معشوق بے مثال ہے جے نور نبی نپایا — نورستی رسول کا او میرے جیو میں بھایا
آپ کوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا — اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہوے گی سیس سپورنہ کہرا — واحد اپنے آپ تھا آپیں آپ نجھایا
پر گٹ جلوہ کار نے الف میم ہو آیا — عشقوں جلوہ دیے کر کاف نون بسایا

چکی نامہ بارہ بندوں پر مشتمل نظم ہے۔

دیکھو واجب تن کی چکی — پیہو چاتر ہوکے سکی
سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی — گے مابسم اللہ ہو ہو اللہ
الف اللہ کا دستا — میانی محمد ﷺ ہوکر بستا
میانی محمد ﷺ ہوکر بستا — گے مابسم اللہ ہو، ہو اللہ

حضرت خواجہ بند نوازنے خواتین کی تربیت اور انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے چکی نامہ اور گیت لکھے۔دکنی شاعری میں چکی نامہ ایک اہم نظم ہے، قدیم دکنی معاشرے میں چکی کے گیتوں کا رواج عام تھا۔عورتیں چکی پر پیس کر جوار، گیہوں، باجرہ وغیرہ سے روٹی بنانے کے لیے آٹا تیار کرتی تھیں اور کام کی تھکن کے احساس کو کم کرنے کے لیے گیت گاتی جاتی تھیں۔اولیائے کرام نے خواتین کے اس مشغلے کے پیش نظر ان کے لیے مذہبی احکامات اور تصوف کے

موضوع پر گیت لکھے۔

9.2.2 فخر دین نظامی :

فخر دین نظامی بہمنی دور کے نہایت اہم شاعر ہیں۔ یہ سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں بیدر میں سکونت پذیر تھے۔ فخر دین بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ''کدم راؤ پدم راؤ'' ان ہی کی لکھی ہوئی مثنوی ہے، جسے اردو کی پہلی مثنوی کہا جاتا ہے۔ مثنوی کی داخلی شہادت اور اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی۔

مثنوی کا دستیاب شدہ نسخہ ناقص الاول، ناقص الاوسط و ناقص الآخر ہے۔ یعنی اس تصنیف کے ابتدائی، درمیانی اور آخر کے کچھ صفحات غائب ہیں،اس لیے مثنوی کے نام کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس مثنوی کے دو اہم کرداروں ''کدم راؤ'' اور ''پدم راؤ'' کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے۔

مثنوی کی عام ہیئت کے مطابق ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا قصہ بھی حمد، نعت اور مدح سلطان کے بعد شروع ہوتا ہے۔ قصہ کچھ اس طرح ہے کہ کدم راؤ راجا ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر جو ایک ناگ ہے اور کدم راؤ کی عنایت سے اس کے سر پر پدم بھی موجود ہے۔ ایک دن کدم راؤ کسی واقعے سے غم اور غصے سے افسردہ و ملول اپنے محل میں آتا ہے کسی سے بات نہیں کرتا، خاموشی سے لیٹ جاتا ہے۔ راجا کو اس طرح اداس اور غمگین دیکھ کر رانی اس کے پاس پہنچ کر اس کی اداسی کی وجہ دریافت کرتی ہے۔ رانی کے بہت اصرار کرنے پر راجا کہتا ہے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عورت اگر پری یا اپسرا بھی ہو تو اس کی وفاداری اور پاک بازی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے اسی بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔ رانی کدم راؤ کو بہت سمجھاتی ہے کہ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی ہے ،اسی طرح جیسے پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ کوئی ایک گر بُرا کام کرے تو اسے صرف اور صرف اس کی ذات اور شخصیت کی خامی یا کمزوری سمجھنا چاہیے۔ اسے سب سے جوڑ کر دیکھنا غلط ہے۔ وہ مزید کہتی ہے کہ میں تو ہمیشہ تمہاری وفادار داسی رہوں گی، لیکن رانی کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پدم راؤ بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ کدم راؤ کہتا ہے کہ میں اس دنیا سے بددل ہو گیا ہوں۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔ راجا کے حکم پر باکمال جوگی اکھرناتھ کو تلاش کر کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے۔ اکھرناتھ نے اپنے کمالات دکھائے اور لوہے کو سونا کر دکھایا۔ راجا اکھرناتھ جوگی کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور اس سے یہ فن سکھانے کی فرمائش کرتا ہے۔ کدم راؤ اس سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اب اسے جوگی کے بغیر چین نہیں آتا۔ اکھرناتھ کدم راؤ کو دھنور بید اور امر بید سکھاتا ہے۔

ایک دن منتر کو آزمانے کے لیے راجہ کدم راو اپنی روح ایک مردہ طوطی کے جسم میں داخل کرتاہے۔ اکھرناتھ کے دل میں لالچ پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی روح کدم راؤ کے جسم میں منتقل کر دیتا ہے کدم راؤ طوطی بن کر بھٹکنے لگتا ہے اور اکھرناتھ راجا بن کر راج کرنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ وزیر سے ''فرمائشِ نامعقول'' کرتا ہے۔ پدم راؤ اس فرمائش کو پورا کرنے

سے انکار کر دیتا ہے۔اکھرناتھ غصے میں پدم راؤ پر بہت لعن طعن کرتا ہے۔اُدھر اصل راجا کدم راؤ طوطی بن کر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ایک دن اُڑتے اُڑتے اُسے اپنا محل نظر آتا ہے اور وہ محل میں پدم راؤ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔اس کے قدموں میں سر رکھ کر اپنے کدم راؤ ہونے کا یقین دلاتا ہے۔پہلے پدم راؤ کو یقین نہیں آتا لیکن جب کدم راؤ اس سے راز کی وہ تمام باتیں بتاتا ہے ،جو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھیں تو پدم راؤ کو یقین ہوجاتا ہے کہ یہی اصل کدم راؤ ہے۔ایک رات جب اکھرناتھ گہری نیند میں سو رہا ہوتا ہے تو پدم راؤ چپکے سے اس کے انگوٹھے کو ڈس لیتا ہے ،جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔کدم راؤ منتر پڑھ کر پھر سے اپنی اصل روپ میں واپس آجاتا ہے۔پہلے کی طرح حکومت سنبھال لیتا ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے۔اس طرح کہانی کا خوشگوار اختتام ہوتا ہے۔اس کے کچھ اشعار بطور نمونہ دیکھیے:

مجھے مارنا مار کے گھال دے — ولے آج اکھر مار نیکال دے
بلایا مدھر بدھ کوں رائو پاس — کہیا رائو ہوں پھول، توں پھول باس
نہوئے پھول پیارا کدھیں باس بن — نہ سر گھال لے کوئی باس آس بن
سبی ٹھانو جے سانپ کوڑھا چلے — اپس ٹھانو وہ بھی سو سیدھا چلے
مدھر بدھ توں ہے منجھے پیر ٹھانو — تجھے نانو پردھان منج رائو نانو
بھلا بھی تہیں منجہ برا بھی نہیں — ترے پائے (ہوں) چھوڑ جاسوں کہیں

اس کہانی کے ذریعے فخردین نظامی نے یہ پیغام دیاہے کہ ذات پات، اونچ نیچ کی سوچ غلط ہے۔یہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ ذات والوں میں ہی تمام خوبیاں ہوں اور ادنیٰ ذات والے بد خصلت ہوں۔اکھرناتھ کا تعلق تو اعلیٰ ذات سے تھا، لیکن اس نے اپنی مکاری اور سازش سے راجا کا سارا راج پاٹ چھین لیا۔اسی طرح طبقۂ نسواں سے بدگمان ہونا بھی غلط ہے۔فرد کی کمزوریوں یا نااہلیوں کو اس کے پورے طبقے سے جوڑنا اور پورے طبقے کا نمائندہ قرار دینا زیادتی ہے۔ان تصورات کی تردید وہ اکھرناتھ کے کردار کے ذریعے کرتے ہیں۔اس طرح فخردین نظامی اس مثنوی کے ذریعے اخلاقیات کی ایک ہمہ گیر تعلیم دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس مثنوی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور سماج کے لیے صحت مند تصور نہیں ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ قصے کے لحاظ سے ہندوی روایت سے اخذ کی گئی ہے۔اسی مناسبت سے نظامی نے اس میں سنسکرت و پراکرت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔محاورے اور ضرب الامثال کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، جس سے زبان میں دلکشی پیدا ہوئی ہے۔قصے کے بیان میں روانی ہے۔مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو ادب کی اولین روایت کی نمائندہ ہے۔

9.2.3 میراں جی شمس العشاق:

میراں جی شمس العشاق ،شاہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔جوانی میں حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ

گئے اور بارہ سال تک مدینہ منورہ میں قیام کیا، اس کے بعد بیجاپور آئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی دوام الدین ہے۔ شمس العشاق، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے سلسلہ صوفیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمس العشاق بہمنی دور کے بہت بڑے صوفی شاعر تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے دکنی زبان کا انتخاب کیا۔ آپ کی تصانیف اس طرح سے ہیں؛شہادت التحقیق، مغز مرغوب، خوش نامہ، خوش نغز اور شرح مرغوب القلوب وغیرہ۔

میراں جی کی شاعری کا موضوع تصوف ہے اور وہ شاعری کو عوام کی تلقین اور اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کی تین مثنویاں خوش نامہ، خوش نغز اور شہادت التحقیق اہمیت کی حامل ہیں۔

خوش نامہ: خوش نامہ کا موضوع تصوف ہے۔ یہ میراں جی کی سب سے مشہور تخلیق ہے۔ خوش نامہ کا مرکزی کردارخوش ایک نیک سیرت لڑکی ہے، جو چغتائی خاندان کا چشم و چراغ تھی۔وہ بھولی بھالی، محبت کرنے والی، سب سے نرالی، سب کی پیاری،ہنس مکھ اورسب کی آنکھ کا تارا تھی۔ نیک بھی ایسی کہ دن رات اللہ سے لگاؤ رکھتی۔نہایت ذہین اور سمجھ دار تھی۔ محض سترہ سال ایک ماہ نو دن کی عمر میں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔میراں جی اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہیں ،لیکن وہ خوش کی موت سے اخلاقی نتائج اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آخری دو اشعار دیکھیے جس میں اس نظم کا نام بھی آیاہے اور دعا بھی مانگی گئی ہے۔

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
یہ خوش خوشیاں اللہ کیرا نور اعلیٰ نور
کھنڈا خوش خوش نامہ تمت ہواتمام
خوش سب کوئی دایم قایم جیناخواص عوام

خوش نغز: خوش نغز میں بھی خوش نامہ والی دوشیزہ کا ذکر ہے۔اس مثنوی میں بہتّر اشعار اور نو ابواب ہیں۔ ہر باب کے اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ یہ مثنوی سوال و جواب کی ہیئت میں لکھی گئی ہے، جس میں میراں جی نے تصوف کے مختلف مسائل مثلاً عرفانِ روح، عرفانِ عالم، عرفانِ مراقبہ، عرفانِ ذوقِ نور، بحثِ عقل و عشق، بیانِ کرامات اور موحّد و ملحد وغیرہ کے متعلق خوش کے ہر ایک سوال کا جواب ایک نئے باب میں دیتے ہیں۔خوش نغز کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جو باب ہفتم ”بحث عقل و عشق“ سے لیے گئے ہیں۔

خوش کہی مج کہو میرانجی عشق بڑا یا بودہ　　پیر کہیں میں آکھوں بیاں اسے دھرناسودہ
من کے کان دے کر سن ری بچن نیک انیک　　چنگی عشق بودہ کب سیتیں کیوں سلگائی دیکہ
بودہ پردھان کہے سن راجے تجکوں عشق خطاب　　جے تو کہیانہ سنی میرا کیسو رہی حساب
نہوئے پھول پیارا کدھیں باس بن　　نہ سر گھال لے کوئی باس آس بن

شہادت التحقیق: شہادت التحقیق کا ایک نام شہادت الحقیقت بھی ہے۔ اس میں 1563 اشعار ہیں۔ یہ میراں جی کی

سب سے طویل نظم ہے۔یہ مثنوی چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہے۔اس کے اسلوب میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔شہادت التحقیق میں شریعت و طریقت کے مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیاگیا ہے کہ وہ بڑی سرعت کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

9.2.4 سید شاہ اشرف بیابانی :

اشرف بیابانی کا شمار بہمنی دور کے نامور اور باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش1459ء میں فقر آباد میں ہوئی اور وفات 1528ء میں ہوئی۔ان کے والد کا نام سید شاہ ضیا الدین بیابانی ہے۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور حقائق و معارف کی طرف متوجہ ہوئے۔1489ء میں ان کے والد نے انھیں خلافت عطا کی۔اشرف بیابانی کی تین تصانیف ہیں اور تینوں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ان کے نام لازم المبتدی، واحد باری اور نوسرہار ہیں۔ان میں نو سر ہار سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔

لازم المبتدی: یہ مثنوی 198 اشعار پر مشتمل ہے۔اس مثنوی کو 36مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔یہ نظم مختلف مذہبی مسائل کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے جن کا تعلق روز مرہ کے معمولات زندگی سے ہے۔اس میں عام انسان کو شرعی احکامات سے روشناس کرایا گیا ہے تاکہ عام آدمی فرائضِ مذہبی کو صحیح طریقے سے انجام دے سکے۔اس میں غسل، وضو، نماز، سجدۂ سہو، روزہ، فطرہ و قربانی اور بیانِ غسل و کفنِ میّت وغیرہ کو عام بول چال کی زبان میں سمجھایا گیاہے۔

واحد باری: واحد باری امیر خسرو کی خالق باری کے طرز پر لکھی گئی مثنوی ہے۔اس میں اردو کے فارسی و عربی مترادفات لکھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی، عروض، ردیف و قافیہ اور مختلف اصنافِ سخن سے متعلق باتیں بیان کی گئی ہیں۔

نوسرہار: نوسرہار مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا مرثیہ ہے۔یہ ایک طویل مثنوی ہے، جس کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو ہے۔یہ مثنوی نو (9) ابواب پر مشتمل ہے۔ہر ایک باب ایک انمول ہار کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کا نام نوسرہار رکھا گیا ہے۔اُس زمانے کے دستور کے مطابق ابواب کے عنوان فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔اس مثنوی کا موضوع واقعۂ کربلا ہے۔اس میں واقعۂ کربلا کی برگزیدہ ہستیوں کے لباس، رسم و رواج، ان کے مزاج و کردار کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا گیاہے۔انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں میں جو ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا رنگ دکھائی دیتا ہے اس کا آغاز اشرف بیابانی کی نوسرہار سے ہوتا ہے۔نوسرہار میں اشرف بیابانی نے واقعۂ کربلا اور شہادتِ امام حسین کو مروجہ واقعے سے قدرے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔نوسرہار کا اندازِ بیان اور لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی مجلسوں میں سنائے جانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی زبان بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔اس میں روز مرہ و محاورے نے بیان کو زوداثر بنا دیا ہے۔انھوں نے مثنوی میں جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ رزم کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور شہادت کے بیان میں غم کے جذبات کی شدت محسوس ہوتی ہے۔اشرف نے اس مثنوی میں ” واحد باری“ اور ” لازم المبتدی“ کے برخلاف اس مثنوی کو خاص اہمیت

دی ہے اس میں نہ صرف اپنی شاعری کی خوبیاں ظاہر کی ہیں بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ مثنوی اس کا نام روشن رکھے گی:

سونے کی جیوں کھوٹنی گھڑ ہیرے مانک موتی جڑ
ایک ایک بول مانک مول سیم ترازو سیں تھیں تول
بِندھ پُرائی سونے تار سوچیں ہووا "نوسرہار"
ہر ہر مصرعے باندے لڑ رتن پدارت مانک جڑ
اے نوباباں نوسرہار قیمت اس کی لاکھ ہزار

اشرف کا کہنا ہے کہ ایک خوبصورت اور بیش قیمتی ہار جس طرح سے سونے چاندی کے استعمال سے بنایاجاتاہے اور ہیرے جواہرات سے مزئین کیاجاتاہے اسی طرح اس مثنوی کی تزئین کی گئی ہے،جس کے سبب یہ مثنوی فن کا ایک نادر نمونہ اور فنکار کی صلاحیتوں کا بہترین مظہربن کر شاعر کے نام کو ادبی دنیا میں زندہ جاوید رکھے گی۔

9.2.5 قطب الدین قادری فیروز:

بہمنی دور کے آخری زمانے میں فیروز کو ایک باکمال سخنور کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔اس کی ایک مختصر سی مثنوی "پرت نامہ" اور کچھ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔"پرت نامہ" فیروز نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ محمد ابراہیم مخدوم جی کی مدح میں لکھی ہے۔اس مثنوی کی تصنیف کے وقت مخدوم جی بقید حیات تھے۔بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد فیروز گولکنڈہ چلا آیا، جہاں اسے استادِ سخن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔گولکنڈہ کے شعرا، وجہی، محمد قلی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروز کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کیا ہے۔

ابراہیم مخدوم جی جیونا مئے صرف وحدت صداہونا
بڑاپیر مخدوم جی جگ منے منگیں نعمتاں معتقد اس کنے
کریں منجھ اپر پیارائے پیوجگ کہ تجھ پیار تھے ہوئی سندھیر جگ
پیا جیو تھے تو ہمن ساس ہے تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

9.2.6 سید عبد اللہ حسینی:

بہمنی دور کے ایک اہم مصنف سید عبد اللہ حسینی ہیں۔آپ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے پوتے ہیں۔اپنے دادا کی طرح ارشاد و ہدایت ان کا مشغلہ تھا۔احمد شاہ ثانی بہمنی کے دور میں موجود تھے۔سید عبد اللہ حسینی اپنے دادا کی طرح عوام میں‌مقبول تھے۔انھوں نے اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی تصنیف "نشاط العشق" کا قدیم اردو یعنی دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔

9.2.7 مشتاق :

مشتاق بہمنی دور کا باکمال شاعر اور استاد سخن تھا۔یہ سلطان محمد شاہ بہمنی کے دور میں موجود تھا۔مشتاق نے سید برہان

الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں دکنی زبان میں قصیدہ لکھا تھاجو دکنی کا پہلا قصیدہ ہے۔ان کی غزلیات بھی دستیاب ہوئی ہیں، جن کے مطالعے سے ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہوتا ہے۔نمونۂ کلام :

تجھ دیکھتے دل توگیا ہورجیواُپرہے کل گھڑی
دیکھے تو ہے جیو کے اوپر نئیں دیکھے تو نئیں کل گھڑی
سورج کے گل میں چاند جیوں یوں تجھ گلے ہیکل دسے
قربان اس کے ہات پر جن اے تری ہیکل گھڑی

9.2.8 لطفی:

لطفی مشتاق کا ہم عصر شاعر ہے۔اس نے حضرت شاہ محمد کی مدح لکھی ہے۔انھوں نے قصیدہ اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لطفیؔ نے ایک قصیدہ، خواجہ کرمانی کے مشہور قصیدے کی زمین میں لکھاہے۔ لطفیؔ کی غزل کے چند شعر یہ ہیں:

سرگ تھے نکلیا چندرلال لہو کے بھیتر   سورچھپایاخنجر چندر دکھایا مکھن
سرگ کا طوطی ہریامشک خطائی چڑیا   رات کا عنبر سریا صبح کی پھوٹی کرن

بہمنی دور کے شعرا میں آذری کا بھی ذکر ملتا ہے، جو ایران سے سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں دکن آیا تھا۔کچھ برس یہاں رہا۔بادشاہ نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔واپس ایران جاکر اس نے دکنی زبان میں ”بہمن نامہ“ لکھی، لیکن یہ تصنیف دستیاب نہ ہوسکی۔تاریخ فرشتہ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

بہمنی دور میں اردو چاروں طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی اور واحدمشترک زبان بن جاتی ہے اور اس عظیم سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک ایساسازگار ماحول پیدا ہوجاتاہے کہ آئندہ دور میں ادبی تخلیق کے لیے راستہ صاف ہوجاتاہے۔جو بیج اس دور میں پھوٹ کر پیڑ بنا اس کے پھل اس سلطنتوں نے کھائے جو بہمنی سلطنت کی جانشین تھیں خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں دکنی ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

بہمنی دور میں اردو زبان بول چال کی زبان سے آگے بڑھ کر علم و ادب کی زبان بن چکی تھی۔اس میں مذہبی تصانیف لکھی گئیں۔ابتدائی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کا زیادہ تر رجحان تصوف کی طرف رہا۔علاوہ ازیں ادبی تخلیقات میں غزلیں، قصیدے ، مثنویاں اور مرثیے لکھے گئے۔اس دور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ ہے ،جو اردو کی پہلی مثنوی ہے۔بہمنی دور میں سلاطین نے صوفیائے کرام کی قدردانی کی، شعرا و ادبا کی سرپرستی کی۔ان کی علم دوستی کی وجہ سے اردو زبان و ادب ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔

9.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- بہمنی سلاطین علم دوست اور ادب نواز تھے۔انھوں نے عوام میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض کے مدرسے قائم کیے خصوصاً بیدر کا مدرسہ محمود گاواں۔اہل علم اور شعرا کی قدردانی کی جس کے سبب اہل ہنر بہمنی سلطنت میں دربار سے وابستہ ہوئے۔اس علمی فضا میں زبان و ادب کو پنپنے کا بھر پور موقع ملا۔
- اردو زبان و ادب کے ارتقا کی تاریخ میں بہمنی دور نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی دور میں ہمیں اردو ادب کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔جیسے فخر دین نظامی کی مثنوی کدم رائو پدم رائو جس میں ہندو اساطیر سے ماخوذ قصے کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔
- بہمنی دور کیاہم تصنیف اشرف بیابانی کی مثنوی نوسرہار ہے۔یہ مثنوی واقعہ کربلا کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔اشرف نے اس مثنوی میں جہاں رزم گاہ کی بے مثال منظر کشی کی ہے وہیں انسانی جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔
- اس کے علاوہ اُس دور کے صوفیائے کرام نے بھی اردو زبان کی نشوونما و فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔انھوں نے رشد و ہدایت کے لیے دکنی اردو کو منتخب کیا اور عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے تصنیف و تالیف کاکام بھی قدیم اردو زبان میں کرنے لگے جس سے زبان کی بھی ترویج و اشاعت ہوتی رہی۔
- بہمنی دور کے صوفیائے کرام میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ، میراں جی شمس العشاقؒ، سید شاہ اشرف بیابانیؒ، قطب الدین قادری فیروز، صدرالدینؒ، سید عبداللہ حسینیؒ شامل ہیں۔
- بہمنی دور میں صوفیائے کرام نے درس و ارشادات اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔
- مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ اس دور کے دیگر شعراء میں مشتاق، لطفی اور آذری وغیرہ کے بھی نام ملتے ہیں۔گویا اس دور میں ادب کی بنیاد رکھی گئی، جس سے آنے والے دور کے ادبی ماحول کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

9.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
لسانی	:	زبان سے متعلق
اختلاط	:	میل جول
خمیر	:	سرشت، فطرت، مزاج
معتقد	:	اعتقاد رکھنے والا

وسیع	:	چوڑا ، کشادہ
ناقص الاول	:	جس کتاب کے ابتدائی اوراق موجود نہ ہوں
ناقص الاوسط	:	جس کتاب کے درمیانی اوراق موجود نہ ہوں
ناقص الآخر	:	جس کتاب کے آخر کے اوراق موجود نہ ہوں
مزید	:	اضافہ ، زیادتی
ملول	:	اداس ، رنجیدہ
لعن طعن	:	لعنت ملامت ، برا بھلا
خصلت	:	عادت ، مزاج
برگزیدہ	:	منتخب ، چنا ہوا
اصحاب	:	صاحب کی جمع ، ہم نشیں ، دوست
سکونت	:	مستقل قیام
شدت	:	زور ، کثرت ، سختی
زود	:	جلد، فوراً
معارف	:	علم و فضل ، علوم و فنون
سرعت	:	جلدی ، تیزی
اسطور	:	اساطیر کی جمع ، قصے کہانیاں
تلقین	:	نصیحت ، ہدایت
مراقبہ	:	دھیان گیان،سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کا دھیان کرنا
عرفان	:	پہچان، حق تعالیٰ کی معرفت، خداشناسی
ہیئت	:	وہ علم جس میں اجرامِ فلکی، زمین کی گردش اور کشش وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے
ثمرہ	:	پھل، نتیجہ

9.5 نمونۂ امتحانی سوالات

9.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو کی پہلی مثنوی کون سی ہے ؟

(a) گلشن عشق (b) علی نامہ (c) پھول بن (d) کدم راؤ پدم راؤ

2۔ "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کس کی تصانیف ہیں؟

(a) میراں جی شمس العشاق (b) فخر دین نظامی (c) سید اشرف بیابانی (d) سید عبداللہ حسینی

3۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کس بادشاہ کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے؟

(a) نظام شاہ بہمن (b) فیروز شاہ بہمن (c) محمد شاہ بہمن (d) مجاہد شاہ بہمن

4۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجا کو دھوکہ دینے والے جوگی کا نام کیا ہے؟

(a) کدم راؤ (b) پدم راؤ (c) اکھر ناتھ (d) مہندر ناتھ

5۔ مثنوی نوسرہار کا موضوع کیا ہے؟

(a) واقعہ کربلا (b) داستانِ عشق (c) سلطنت کا زوال (d) مذہبی مسائل

6۔ میراں جی شمس العشاق کے بیٹے کا نام کیا تھا؟

(a) برہان الدین جانم (b) امین الدین اعلیٰ (c) فخر دین نظامی (d) مشتاق

7۔ مثنوی" نو سرہار "کس کی تصنیف ہے؟

(a) سید عبداللہ حسینی (b) مشتاق (c) سید اشرف بیابانی (d) لطفی

8۔ "شہادت التحقیق" کا دوسرا نام کیا ہے؟

(a) شہادت الحقیقت (b) روضتہ الشہدا (c) خوش نامہ (d) خوش لغزش

9۔ مثنوی "پرت نامہ" کا مصنف کون ہے؟

(a) حسینی (b) لطفی (c) فیروز (d) مشتاق

10۔ سید عبد اللہ حسینی اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ میں کیا رشتہ تھا؟

(a) بیٹا اور باپ (b) پوتا اور دادا (c) بھانجا اور نانا (d) بھتیجا اور چاچا

9.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے کرداروں کا جائزہ لیجیے۔

2۔ بہمنی دور کے شاعروں کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

3۔ اشرف بیابانی کی مثنوی نوسرہار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

9.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ بہمنی دور میں اردو زبان کے فروغ میں صوفیائے کرام کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ بہمنی دور میں اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

3۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

9.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مقدمہ تاریخِ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	تاریخ اردو ادب (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	دکن میں اردو	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی
4۔	تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد اول)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
6۔	اردوادب کی تنقیدی تاریخ	پروفیسر احتشام حسین

9.5.1 کے جوابات:

9.5.1 کے جوابات:	1-d	2-a	3-b	4-c	5-a
	6-a	7-c	8-a	9-c	10-b

اکائی 10: عادل شاہی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 عادل شاہی عہد کا سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر

10.2.1 عادل شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا

10.2.2 ابراہیم عادل شاہ ثانی

10.2.3 عبدل

10.2.4 صنعتی

10.2.5 حسن شوقی

10.2.6 علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ

10.2.7 نصرتی

10.2.8 ہاشمی بیجاپوری

10.2.9 مرزا

10.3 اکتسابی نتائج

10.4 کلیدی الفاظ

10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

دکنی شعر و ادب کے ارتقا میں عادل شاہی دور بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔عادل شاہی عہد کے تقریباً تمام سلاطین شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔انہوں نے علما' فضلا' شعرا اور دیگر اہل ہنر کی قدر دانی اور سر پرستی کی۔اس اکائی میں آپ عادل شاہی سلطنت کے قیام اور اس کے سماجی' تاریخی اور تہذیبی پس منظر اور شعر و ادب کے ارتقاپر روشنی ڈالیں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کامطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- عادل شاہی عہد کے سماجی' تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو بیان کر سکیں۔
- عادل شاہی عہد کے شعر و ادب کا جائزہ لے سکیں۔
- عادل شاہی دور کے شعرا عبدل، ابراہیم عادل شاہ اورصنعتی کی ادبی خدمات سے واقف ہو سکیں۔
- عادل شاہی دور کے ملک الشعرا نصرتی کی مثنویوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔

10.2 عادل شاہی عہد کا سماجی' تاریخی اور تہذیبی پس منظر

پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں، جو پانچ نئی اور خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں ،ان میں بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت کو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا،جو سلطنت بہمنیہ کے مشہور وزیر محمود گاواں کا تربیت یافتہ تھا۔اس نے 1490ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔تقریباً دو سو سال تک نو بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔اپنی خود مختاری کے بعدیوسف عادل شاہ جہاں اپنی سلطنت کو وسیع اور مستحکم کرنے میں مصروف رہا وہیں ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے بھی اپنی ریاست کی بنیادیں مستحکم کرنے کی کوشش کی۔یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا مذاق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔ فارسی اور ترکی پر اسے عبور حاصل تھا۔اس کے دور حکومت میںکئی قلعے اور خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔1510ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا۔اس نے تقریباً پچیس سال تک حکمرانی کی۔یہ بھی اپنے والد کی طرح علم دوست' عالموں کا قدر دان اور شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔خود بھی شاعر تھا اور وفائیؔ تخلص کرتا تھا۔اس نے چندا پور کے نام سے ایک شہر اور چمپا محل کے نام سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔اسمٰعیل عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند ابراہیم عادل شاہ اول بیجا پور کے تیسرے بادشاہ کی حیثیت سے 1534میں تخت نشین ہوا۔اگر چہ ابراہیم خود شاعر نہیں تھا لیکن اپنے آباو اجداد کی طرح ذوق علم و ادب سے بہرہ مند تھا۔اس کے عہد کا ایک اہم کارنامہ فارسی کے بجائے دکنی کو دفتری زبان قرار دینا ہے۔اس کے دور میں بیجا پور علم و ادب ' موسیقی اور صناعی کا مرکز

بن گیا تھا۔ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول 1558 ء میں تخت نشین ہوا۔اس کے عہد میں علم و ادب کی بڑی سرپرستی ہوئی۔اس نے خاندانی روایات کی پاسداری کی اور فنون لطیفہ بالخصوص موسیقی کی قدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔علی عادل شاہ اول کے عہد حکومت میں عراق، عرب، ایران اور دوسرے مقامات کے شعرا اور علما بیجا پور آکر بس گئے۔خود بادشاہ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔اس کے محل میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود تھا۔علی عادل شاہ اول نہ صرف علم و فن کا شائق تھا بلکہ اس کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔دارالسلطنت بیجا پور میں کئی باغ لگوائے، نہریں نکالیں اور ایک عالی شان مسجد بنائی۔اس کے عہد میں شاہ برہان الدین جانم نے کئی رسالے نظم اور نثر میں‌قلم بند کیے جن میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں اس کا جانشین ہوا۔اس کا شمار جلیل القدر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔وہ مغل شہنشاہ اکبر اور گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔وہ نہ صرف علما اور شعرا کا سر پرست تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔اس کو ہندوستانی موسیقی میں کمال حاصل تھا۔موسیقی میں اپنی مہارت اور کمال کی وجہ سے جگت گرو کہلاتا تھا۔اس نے کتاب "نورس" اپنی یادگار چھوڑی ہے۔اس کے عہد میں جب گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو زوال ہوا تو اس نے وہاں کے علما اور اصحاب کمال کو بیجا پور آنے کی دعوت دی۔ملا ظہوری(مصنف سہ نثر ظہوری)،حکیم ابو القاسم فرشتہ (مصنف تاریخ فرشتہ)اور ملا رفیع الدین شیرازی(مصنف تذکرۃالملوک)اس کے دربار سے وابستہ تھے۔اس کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ایک نیا شہر آباد کر کے اس کو نو رس پور سے موسوم کیا۔نو رس کے نام سے قلعہ تعمیر کیا۔شاہی مہر پر لفظ نورس کندہ تھا۔درباری شاعر عبدالقادر کو نورسی کا لقب دیا۔اس کے عہد کے اردو شعرا میں عبدلؔ، مقیمیؔ، صنعتیؔ وغیرہ مشہور ہیں۔ابراہیم عادل شاہ نے 1627ء میں وفات پائی۔اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد عادل شاہ بیجا پور کا حکمران ہوا۔یہ نہایت فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔خود شاعر نہ تھا لیکن علم و ادب کا قدر دان اور شعرا کا سر پرست تھا۔محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈہ کے فرماں روا محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی۔ملکہ خدیجہ سلطان اور محمد عادل شاہ کی اردو نوازی کی وجہ سے اردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔تعلیم کی ترقی ہوئی۔تمام شہر میں مدارس کھولے گئے۔طلبہ کو وظائف دیے گئے اورصاحب علم کو فکر معاش سے بے پرواہ کیا گیا۔1656ء میں محمد عادل شاہ کا انتقال ہوا۔

محمد عادل شاہ کے بعد اس کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی نے انیس سال کی عمر میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔اس کو زندگی بھر سرکش امراء کی بغاوتوں ،مرہٹوں اور مغلوں کی یورشوں کا سامنا کرنا پڑااس کے باوجود دکنی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوتارہا۔وہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا اور شاہیؔ تخلص کرتا تھا۔چوں کہ اس کی مادری زبان دکنی تھی اس لیے اسے دکنی سے خاص لگاؤ تھا۔علی عادل شاہ اپنے عہد کا بلند پایہ سخن ور تھا اس لیے "استاد عالم" کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا۔اس کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں میں حسینی محل، علی محل، عرش محل اور حسینی مسجد وغیرہ اہم ہیں۔اس نے صرف پینتس سال کی عمر

میں 1672ء میں انتقال کیا۔اس کے انتقال کے بعد اس کا کم سن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بیجا پور کا آخری حکمران تھا۔اس کے عہد میں امرا کی ناچاقیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں سکندر نے مرہٹوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔شیواجی نے بعض عادل شاہی قلعوں پر قبضہ کر لیا تو سکندر نے بہلول خاں کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔شیواجی کا لشکر حملے کی تاب نہ لا کر منتشر ہو گیا۔آخر کار 1686ء میں‌اورنگ زیب نے بیجا پور کو فتح کر لیااور سکندر عادل شاہ کو گرفتار کرکے قید کردیا۔اس طرح دو سو سالہ عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

عادل شاہی حکمرانوں کو رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھاانہوں نے اپنی سلطنت میں بے شمار سرائیں' خانقاہیں' پل اور کنویں بنوائے۔غربا اور مساکین کے لیے لنگر خانے قائم کیے۔مشائخ اور علماء کو وظائف اور انعامات دیے جاتے تھے۔عام لوگوں کو تیار غذا دی جاتی۔عیدین ' شب برات اور سالگرہ کے موقع پر شہر آراستہ کیا جاتا اور جشن منائے جاتے۔غرض کہ عادل شاہی عہد میں ملک پر امن اور رعایا اتنی خوش حال تھی کہ اس دور میں موسیقی' مصوری' نقاشی' خطاطی 'تعمیرات' صنعت و حرفت' شعر وادب اور دیگر علوم و فنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔

10.2.1 عادل شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا:

عادل شاہی دور دکنی شعر و ادب کے ارتقا کے سلسلے میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو کو مختلف ارتقائی منزلوں سے روشناس کیا۔اور مختلف اصناف شاعری جیسے غزل' مثنوی' قصیدہ' رباعی اور مرثیہ کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی۔لیکن شاعری کا پلہ نثر نگاری کے مقابلہ میں بھاری ہے۔عادل شاہی عہد کے کم و بیش تمام سلاطین علم و ادب اور شعر و سخن کے قدر دان اور سرپرست تھے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی"جگت گرو" اور علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کو دیگر سلاطین کے مقابلہ میں اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ دونوں نے نہ صرف شاعروں' ادیبوں اور عالموں کی دل کھول کر سر پرستی کی بلکہ دونوں موسیقی اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے اور ساتھ ہی خود بھی شعر کہتے تھے۔اس دور کے شعرا و ادبا میں شاہ برہان الدین جانم' ابراہیم عادل شاہ ثانی' حسن شوقی' نصرتی' شاہی ' حضرت امین الدین اعلیٰ اور ہاشمی بیجا پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

10.2.2 ابراہیم عادل شاہ ثانی:

ابراہیم عادل شاہ ثانی ' طہماسپ شاہ کا بیٹا اور علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا۔علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے انتقال کے بعد ابراہیم تخت نشین ہوا۔یہ عادل شاہی خاندان کا چھٹا حکمران تھاجس نے 1580ء سے 1627ء تک حکومت کی۔یہ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ابراہیم کو چوں کہ مستقبل میں تخت و تاج کا وارث بننا تھا اس لیے اس کے چچا علی عادل شاہ نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی تھی۔وہ بچپن ہی سے علم و ادب کا شائق ' متین' بردبار اور سنجیدہ شہزادہ تھا۔بساتین السلاطین اور تاریخ فرشتہ کے مورخین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ نو

عمری میں وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود میں مصروف رہنے کے بجائے تحصیل علم میں مگن رہتا تھا۔اور اس نے قران مجید کی تعلیم کے علاوہ خوش نویسی اور فنون سپاہ گری، خطاطی، مصوری اور نقاشی میں درک پیدا کیا تھا۔علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد دکن کی دانش مند ملکہ، احمد نگر کی مشہور شہزادی اور عادل شاہی حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ چاند بی بی نے ابراہیم عادل شاہ کی تربیت کی ذمے داری قبول کی تھی۔ابراہیم کو فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔اس نے علم موسیقی کی بھی سرپرستی کی۔اس کے دور میں اہل کمال کو حکومت کی جانب سے مالی امداد دی جاتی تھی۔اس کے دربار میں علما و فضلا کی بڑی توقیر ہوتی تھی۔اس کے عہد میں بیجا پور علم و ہنر کا مرکز بن گیا تھا۔اس کے علم و فضل کی وجہ سے لوگ اسے" جگت گرو"کہتے تھے۔اس نے بیجا پور کے مغرب میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام"نورس پور" تھا۔ابراہیم خود ایک اچھا شاعر تھافارسی اور دکنی میں شاعری کرتا تھا۔دکنی میں گیتوں کا ایک مجموعہ"کتاب نورس" ملتا ہے۔اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق گیت لکھے گئے ہیں۔ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا گیا ہے۔"کتاب نورس" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زبان اس عہد کی مروجہ دکنی سے مختلف ہے۔اس میں سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے۔

ایک نار دیکھیا کھڑی سامنے   پونم رات کی مکر چاندنی
چتاری چتر نہ سکے ہوئے مانی   جیوں موج پر موج آوے پانی

برہ چھاٹی تو دیکھ چاٹاک دھاوے گا   سندھیاں کر سنگار اوب کنٹھ لاوے گا
ابراہیم نسو جلگ ایسا پیو کہاں پاوے گا   رات تھوڑی مدن بہوت اٹھ جاوے گا

10.2.3 عبدل:

عبدل بھی اسی عہد کا شاعر ہے۔دکنی کے اکثر شعرا کی طرح دکن کی معاصر تاریخوں میں اس کے حالات زندگی نہیں ملتے۔عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے کا درباری شاعر تھا۔اس کی شعری یادگار "ابراہیم نامہ" ہے جو بقول پروفیسر سیدہ جعفر بیجا پور کا پہلا ادبی نقش ہے۔ابراہیم نامہ کی ابتدا میں شاعر کہتا ہے کہ بادشاہ نے اسے طلب کیا اور حکم دیا کہ ایک ایسی کتاب تیار کرو کہ جس سے شاعری میں ہمیشہ کے لیے تیرا نام رہ جائے۔بادشاہ کی یہ بات سن کر اس نے عرض کیا کہ میں عربی اور فارسی سے واقف نہیں ہوں صرف زبان "ہندوی" سے واقف ہوں۔بادشاہ نے جواب دیا کہ اسی زبان میں لکھی جائے۔اس حکم کی تعمیل میں اس نے مثنوی "ابراہیم نامہ" لکھی گئی۔ابراہیم نامہ کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ دکن کے اولین کارناموں میں سے ایک ہے۔اس کی اہمیت ادبی اور تاریخی ہے۔بیجا پور کے چھٹے فرماں رواابراہیم عادل شاہ کا دور "ابراہیم

نامہ" کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔اس میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی مدح ہے۔اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔نفس مضمون کے بعض عنوانات حسب ذیل ہیں:

تعریف سخاوت بادشاہ، شہر بیجا پور، دربار بادشاہ، نو رس محل، مجلس بادشاہ، شکار، ہیبت لشکر، تعریف فیلان شاہی، تعریف اسپاں، تعریف باغ ، تعریف بہار ، میزبانی، سالگرہ وغیرہ۔عبدل نے تشبیہات و استعارات اور تمثیلی انداز میں اپنا زور طبع دکھایا ہے۔

اڑی رات کوئل گگن بن اوپر　　نکل دیس کا باز سیج صبح پر
پکڑ سورج چنگل سو نکھ کرن رات　　دسیا لال لوہوشفق گگن دھات

عبدل کی توضیحی شاعری سے اس کے زور بیان اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"در تعریف نو رس محل حضرت شاہ" اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔اس خوب صورت اور پر شکوہ محل کی جگہ اب صرف اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں،لیکن اس کے حسن اور اس کی شان و شوکت کی پر اثر تصویر "ابراہیم نامہ "میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔

گگن سات سیڑھی ہو مل جوڑ کر　　نہ لگ محل نو رس کے ایک کھن اوپر
ولے گگن آکر چھپے تس منجار　　رہے طاق بندھیا ہو ہر ٹھارٹھار
جڑت نو رتن مل کندن زرنگار　　سورج چاند مل کر جڑے نو سنار
گگن آرسا کر نو رس محل دھر　　اپس روپ اس میں سو دیکھے نظر
سو جھاں سور ہو مکھ کلس درمیاں　　بھرے ذات کی چھانو ہو دیس جاں
زمیں سیس پرتھال لے کوٹ دھر　　کنگورے برن آن موتی سو بھر
رکھیا جمک درمیاں نو رس محل جان　　اجالا پریا دیس ہو جوت مان

10.2.4 صنعتی:

صنعتی کا نام سید حسن شاہ محی الدین تھا اور اس کے والد مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت تھے۔مرتضیٰ قادری کے متعلق تذکرہ اولیائے دکن میں عبدالجبار ملکا پوری لکھتے ہیں کہ "آپ حضرت شرف الدین صوفی القادری کے صاحب زادے ہیں" ان کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ان کی طبیعت ابتدا ہی سے زہد و تقویٰ کی طرف مائل تھی ایک دن اتفاقاً ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی اور ان پر بھی جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔شاہ وجیہہ الدین علوی کے خلف رشید شاہ عبداللہ گجراتی نے سلوک کی منزلوں میں ان کی دستگیری کی، جن کی وجہ سے ایک قلیل عرصہ میں وہ "کامل" ہوگئے۔انھوں نے گجرات سے بیجا پور کا سفر کیا اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں بیجا پور پہنچے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔صنعتی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہے۔قیاس کیا جاتاہے کہ عادل شاہی دور کے اختتام سے پہلے اس کا انتقال ہو چکا تھا۔محمد

عادل شاہ اور علی عادل شاہ کے دور میں اس کے موجود رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔اس کی دو مثنویاں منظر عام پر آئی ہیں۔"قصہ بے نظیر "اور دوسری مثنوی "گلدستہ"۔نصیر الدین ہاشمی نے قصہ بے نظیر کا نام "قصہ تمیم انصاری "بھی بتایا ہے۔یہ مثنوی بارہ مقامات پر مشتمل ہے اور ہر مقام ایک نئی مہم کی داستان ہے اس مثنوی کا قصہ چوں کہ مذہبی نوعیت کا حامل ہے ،جسے شاعر پاک قصہ کہتا ہے۔

یو قصہ عجب پاک ہے دل پذیر جو پاکاں کیے ہیں جسے بے نظیر

اسی لیے دوسرے مثنوی نگاروں کی طرح مختلف عنوانات کے بجائے صنعتی نے انھیں مقام سے موسوم کیا ہے تاکہ صوفیانہ اصطلاح کا اثر مثنوی میں قائم رہے۔یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے۔اس میں صحابی رسولﷺ تمیم انصاری کی سر گزشت بیان کی گئی ہے کہ کس طرح ایک رات ایک دیو انھیں اٹھا لے گیا۔کس طرح وہ دیووَں ' جنوں اور شیطانوں کے ملک میں پہنچے اور پھر کس طرح پرستان میں قیام کیا تھا۔اس کے بعد بھیانک صحراؤں' جنگلوں' پہاڑوں اور طلسماتی محلوں میں انھیں بڑے حیرت انگیز اور محیر العقل واقعات پیش آئے اور آخر کار تمام مہمات کو سر کرنے کے بعدحضرت تمیم انصاری حضرت خضر کی مدد سے مدینہ منورہ پہنچے اور جب اپنے واقعات بیان کیے تو اکثر لوگوں نے یقین نہیں کیا مگر حضرت علیؓ نے تصدیق فرمائی کہ آن حضرتؐ نے خبر دی تھی کہ تمیم انصاری دنیا کے عجائبات دیکھے گا۔صنعتی نے اپنے شاعرانہ تخیل کی بنیاد پر اس مسلسل داستان میں ندرت ' تحیر اور انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔قصہ میں مذہبی تصورات کی کہیں نفی نہیں ہوئی ہے۔صنعتی نے قصہ کے درمیان مذہبی احکام اور عقائد کی توضیح کرکے انھیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

دوسری مثنوی "گلدستہ" ایک عشقیہ داستان ہے۔ملک مصر کا شہزادہ سیاحت کے لیے اپنے ملک سے روانہ ہوتا ہے۔سفر کے دوران مختلف حادثات پیش آتے ہیں۔بالآخر مصیبتیں اٹھاکر اور پریشانیوں سے دوچار ہوکر وطن کو کامیاب واپس آتا ہے۔صنعتی کی دونوں مثنویوں سے اقتباسات پیش ہیں۔

قصہ بے نظیر یا تمیم انصاری:

حکایت کے راوی کر خوش قلم چلاتا ہے یوں اس بیاں کا رقم
کہ حضرت علی یوں کیے حکم جب تمیم انصاری کہے کھول سبب

جو ایسے میں یک دیو آ سخت تر اوڑیاں داں نے لے مجھ ہوا کے اوپر
کیا میں جو اس کی طرف جب نگاہ دسیا مجہ نین تل جہاں سب سیاہ
جسے تھا سینہ کھن نمن سخت تر سکل تن پتھر دل و جڑنے بہتر
اتھے ہات اوس جھاڑ کینکر کے سار ہن غار سا سیر تھا جوں پہاڑ

گلدستہ کا نمونہ یہ ہے:

سنو اے سخن داں صاحب ہنر — ایتا اوبیاں کھول بولوں مگر
عجب یونزاکت بھریا یو بچن — کہ سن تازہ ترہوویں دل کے چمن
خوشی سوں چلیا شاہزادہ نکل — کہ اس کام آنے کا دل دھر شغل
اتھے ہات اوس جھاڑ کینکر کے سار — کہا حاجباں کوں سلام ان نجھا
وہ فغفور کے بارگاہ بیچ آ — کہا حاجباں کوں سلام ان نجھا
علیکی دیے اس جماعت تمام — پوچھے حال اس کا کیے انتظام
بیاں سو اپس کا کیا ان حضور — سنے بات سارے او حاجب ضرور
آنگے او کہے اس کون آبجا من — نصیحت کا سن تو ہمارا سخن

10.2.5حسن شوقی:

شیخ حسن نام اور تخلص شوقی تھا۔حسن شوقی کا شمار قدیم دکنی کے باکمال غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔اس کی غزلوں کے دیوان کے علاوہ دو مثنویاں"فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ" ملتی ہیں۔حسن شوقی جنگ تالی کوٹ کی فتح کے موقع پر نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا۔اس سلطنت کے خاتمہ کے بعد وہ محمد عادل شاہ کے دور میں بیجا پور چلا آیا۔"میزبانی نامہ" میں اس نے محمد عادل شاہ کی شادی کو موضوع بنایا ہے، جس سے اس کے درباری شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

حسن شوقی ایک مثنوی نگار اور بلند پایہ غزل گو تھا۔"فتح نامہ نظام شاہ "دکنی اردو کی ایک قدیم مثنوی ہے جو چھ سو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔یہ اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔اس میں نظام شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرا اسی کے سر باندھا ہے۔اس مثنوی میں حسین نظام شاہ کے دربار' جنگی مناظر اور میدان کار زار کے ایسے مرقعے پیش کیے ہیں کہ واقعات آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتے ہیں۔

"میزبانی نامہ" میں محمد عادل شاہ کی اس شادی کو موضوع بنایا ہے، جو نواب مظفر خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔اس مثنوی میں حسن شوقی نے جہاں محمد عادل شاہ کی دوسری خوبیاں بیان کی ہیں وہیں اس کی سخن فہمی اور سخن پروری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔"میزبانی نامہ" میں حسن شوقی نے محمد عادل شاہ کے عہد کی بیجاپوری ثقافت کی اچھی مرقع کشی کی ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں شادی بیاہ کی رسومات کس اہتمام اور توجہ کے ساتھ انجام دی جاتی تھیں۔محلات کی سجاوٹ' فرش کی صفائی' حوض' فوارے' عطریات' روشنی کے اہتمام ' لباس و زیورات اور سامان عیش و عشرت کی بڑی متحرک تصویریں اس مثنوی میں پیش کی گئی ہیں۔شادی کی رسومات' شہر گشت' کی تیاری اور پھر اس کی دھوم دھام ' سواریوں کی آن بان' سپاہیوں کا دبدبا' جلوس کی رونق' بادشاہ اور مقربوں کے زرق برق لباس' آتش بازی کے پرنور نظارے' موسیقی

کی دلفریبی' رقاصہ کی ہوش ربا ادائیں'کنیزوں کی خوش پوشاکی' زرو جواہر کی ریل پیل اور عادل شاہی محلات کے پورے ماحول کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔آخر میں دولہا کے لیے دعا پر میزبانی نامہ کو ختم کیا گیا ہے۔اپنے موضوع کے ساتھ حسن شوقی نے اس خوبی کے ساتھ انصاف کیا ہے کہ ان کا فن اس مثنوی میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔شادی کی تقریب پر لکھی ہوئی اس مثنوی کی پوری فضا پر ایک طربیہ اثر چھایا ہوا ہے۔شاعر کا پر جوش لب و لہجہ ' مناسب و موزوں لفظیات' محاکات اور بدلتی ہوئی تصویروں نے میزبانی نامہ کو ایک بھر پور شادی نامہ بنادیا ہے۔ایک گزرے ہوئے زمانہ کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی آئینہ داری نے اس مثنوی کو اہم بنادیا ہے۔

حسن شوقی ایک باکمال مثنوی نگار کے علاوہ بلند پایہ غزل گو بھی تھا۔بہ حیثیت ایک غزل گودکنی اردو کے شاعروں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت و افضلیت حاصل ہے۔اس کی غزلیہ شاعری میں مٹھاس' شگفتگی اور پختگی ملتی ہے۔پروفیسر سیدہ جعفر ''تاریخ ادب اردو 1700ء تک''(جلد دوم) میں رقم طراز ہیں کہ حسن شوقی کا تغزل دکنی غزَ گوئی کی اس روایت کی ابتدا ہے جس کا کمال ولیؔ کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔حسن شوقی کی غزلیں اپنے مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے اسی نقطہ عروج کا آغاز معلوم ہوتی ہیں۔حسن شوقی نے اپنی غزلوں کو دل نشیں استعاروں اور خوب صورت تشبیہوں سے سجایا ہے۔یہ تشبیہات اس ہندوستانی ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں جس میں شاعر کے شعور نے نشو و نما پائی ہے۔''

غزل کے چند شعر پیش ہیں۔

جاناں تجے جو دیکھت جگ چھند بھری کتے ہیں
کوئی حور، پدمنی کوئی، کوئی شہپری کتے ہیں
میں تجہ فراق سیتی رو رو سمندر بھریاں ہوں
کوئی گنگ، کوئی جمنا، کوئی ساوری کتے ہیں
تجہ مکھ کنول کنولے بدل جگ میں سرنگ لالا ہوا
تجھ زلف تھے اُپجے بھنور درجے بھونگ کالا ہوا

10.2.6 علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ:

مملکت بیجا پور کا آٹھواں فرماں رواسلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا حکمران تھا بلکہ قدیم دکنی زبان کا ایک صاحب دیوان شاعر اور سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔اس کی ماں ایک معمولی عورت تھی،لیکن محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو نے جو محمد قطب شاہ کی دختر اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی اس کی پرورش اور تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔یہی وجہ ہے کہ شاہی کو بچپن ہی سے علم و ادب اور شعر و سخن کا ذوق تھا۔اس نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔اس کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ ' قصیدوں،اور مثنویوں کے علاوہ گیت'

دوہرے اور جھولنا ملتے ہیں۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے شاہیؔ دبستان بیجا پور کے اہم متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہی نے محمد قلی قطب شاہ کی طرح ایک سے زائد تخلص استعمال کیے ہیں۔گیت کی رنگین اور شگفتہ صنف میں اس نے موضوع اور فضا کی مناسبت سے مدنؔ روپ تخلص سے بھی کام لیا ہے۔مراثی اور غزل میں کہیں علی عادل شاہ اور مظفر علی شاہ تخلص بھی ملتا ہے۔شاہی کے کلام میں قصائد کے علاوہ مراثی' فردیات' نظمیں' رباعی 'گیت اور مثنویاں سب ہی اصناف سخن موجود ہیں۔شاہیؔ کے کلام میں مقامی تہذیبی روایات اور مقامی ماحول کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔اس نے اپنے تجربات زندگی' مشاہدات اور احساسات کو سادگی اور روانی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔نمونہ کلام پیش ہے۔

قصیدہ :

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل — عقل معلم اپن قصہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے ' عقل ہمہ کار ہے — عقل کا جاسوس ہو مکھ پہ اچھے یو کرن
عقل کسوٹی ہوئی طبع کے کسنے بدل — خوب دساوے جھلک در جگ در عدن
عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بھتر — بوجھ رکھیا ہے صراف قلب کیرا جیو کنچن

غزل :

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو — یاقوت ہور مرجان میں کوہے رتن برتر کہو
یاقوت اور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل — سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

مرثیہ :

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے — جگ منے جوں ہیں ابھالاں ہائے ہائے
نت کریں عادل علی یک دل ستی — شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

10.2.7 نصرتیؔ:

شیخ نصرت نصرتیؔ سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔نصرتی کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔نصرتی علی عادل شاہ شاہیؔ کے بچپن کا ساتھی تھااس لیے بادشاہ کے مزاج میں بھی دخیل تھا۔اس کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ نصرتی کا خاندان دکن آکر آباد ہوگیا تھا شائد اسی لیے مقامی لوگ اس کے خاندان کو باہر کا خاندان کہتے اور اس سے حسد کرتے تھے۔بالآخر اسے شہید کردیا۔

نصرتی کی تین مثنویاں گلشن عشق،علی نامہ اور تاریخ اسکندری کے علاوہ غزلوں ' قصائداور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان ملتا ہے۔مثنوی گلشن عشق نصرتی کی اولین تصنیف ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1068ھ ہے۔اس میں نصرتی نے کنور منوہر اور مد مالتی کی عشقیہ داستان نظم کی ہے۔مثنوی کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جیسے حمد' نعت' منقبت' مدح گیسو

دراز ، مدح بادشاہ وغیرہ۔ان تفصیلات کے بعد اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ہر باب کے شروع میں نصرتی نے ایک شعر لکھا ہے۔عنوانات کے سارے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں اگر ان اشعار کو یکجا کرلیا جائے تومثنوی کے قصے کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔

نصرتی کی دوسری تصنیف ”علی نامہ “ہے۔یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جو1076ھ میں لکھی گئی اس میں ان جنگی مہمات کا ذکر ہے ، جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کو شیواجی مرہٹہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے اور مغلوں کے حملوں کی مدافعت میں پیش آئی تھیں۔اس مثنوی میں تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جنھیں بیان کرنے سے تاریخ بھی قاصر ہے۔اس طرح یہ مثنوی مورخوں کے لیے ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس مثنوی میں نصرتی کے چھ بلند پایہ قصیدے بھی شامل ہیں۔

نصرتی کی تیسری مثنوی ”تاریخ اسکندری“ بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1083ھ ہے۔اس مثنوی میں نصرتی نے عادل شاہی سپہ سالار بہلول خاں اور شیواجی کے درمیان لڑی گئی جنگ کو موضوع بنایا ہے، جس میں شیواجی کو شکست اور بہلول خاں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔مثنوی اور قصیدے کے علاوہ نصرتی غزل اور رباعی میں بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔نمونہ کلام پیش ہے۔

گلشن عشق :

جو سب نس تلک کھائے خون جگر — تو یک بھار لاتا ہوں روشن گہر
رھنا کر مشقت کی اپنی پچھان — شفق کر دکھاتا لہو کی نشان
کتا ہوں مشقت میری کھول میں — گہر کئیں نہ رکھتا ہوں بے ڈول میں
ہر یک سخت الماس کوں کر تلاش — بنایا ہوں لئی بار پھر پھر تراش
ہر یک رنگ پو جڑنے رتن بر محل — کیا ہوں کتے بار اپس لھو کاجل
ہر ایک سطر ہے گرچہ نیلم کی لڑ — معانی کے ہیں لعل یکس یک تے جڑ

علی نامہ:

کتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات — چلی تھی دکن پہ کس دہات سات
کہ جس فوج کوں دیکھتے ہیں سمج — دسے نا کسے انتہا ہور اونچ
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل — نتھا جس میں سردار اصحاب فیل
یک یک ملک کے نام آور جواں — دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں

غزل:

چندر بدن کھیا تو کہی منہہ سنبال بول	سورج مکھی کھیا تو کہی یوں نہ گھال بول
بولیا کہ تج فراق تھے کئی عاشقاں خراب	بولی کہ میرے وصل منے کیا ہے حال بول
بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام	بولی بتاں کے ہت سے ٹوٹے تو حلال بول

10.2.8 ہاشمی بیجا پوری:

سید میراں میاں خاں ہاشمی علی عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا وہ مہدوی مذہب کا پیرو تھا اور سید شاہ ہاشمی کا مرید تھا۔مورخوں کا بیان ہے کہ وہ پیدائشی نا بینا تھا۔بیجاپور کے زوال کے بعد اس نے ارکاٹ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ہاشمی ایک قادرالکلام اور پرگو شاعر تھا۔اس نے غزل، ریختی، قصیدہ اور مرثیے میں طبع آزمائی کی تھی۔ہاشمی کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی"یوسف زلیخا" مثنوی عشقیہ، معراج نامہ، مخمس در نعت و مدح مہدی جونپوری، قصائد اور ہجویہ مثنوی شامل ہیں۔

مثنوی "یوسف زلیخا"ہاشمی کی سب سے ضخیم مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1099ھ ہے۔یہ مثنوی ہاشمی نے اپنے مرشد کی فرمائش پر قلم بند کی ہے۔ہاشمی نے اس میں یوسف زلیخا کے روایتی قصے کو نظم کیا ہے۔مثنوی مختلف فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔فصلوں کے عنوانات اشعار میں ہیں جنہیں یکجا کرنے سے مربوط نظم بن جاتی ہے۔اس مثنوی کا بنیادی وصف اس کی سادگی اور سلاست ہے۔مثنوی یوسف زلیخا کو بیجا پور کی مثنویوں میں یہ امتیازحاصل ہے کہ اس میں اپنے عہد کے سماجی مظاہر کی بڑی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔اس زمانے کے مختلف قسم کے پکوان، مشروبات، رہن سہن کے طریقے، لباس، زیورات اور آداب محفل کو ہاشمی نے اپنی اس مثنوی میں محفوظ کردیا ہے۔

"مثنوی عشقیہ" ہاشمی کی دوسری اہم مثنوی ہے۔اس میں کشمیر کی شہزادی اور ایک معمولی نوجوان کے عشق کی المیہ داستان اور ایک بقال زادے سے شیخ سعدی کی محبت کے قصے کو باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔

"معراج نامہ "میں ہاشمی نے معراج کے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔یہ ایک عوامی انداز کی مثنوی ہے جو محفلوں میں پڑھ کر سنانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کرکے1961ء میں شائع کیا۔ہاشمی کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلوں کے علاوہ مسلسل ریختیاں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔اسے ریختی کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جا سکتا ہے۔اس نے عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے اشعار میں دکنی عورتوں کی آواز اور ان کا لب و لہجہ صاف سنائی دیتا ہے۔

ہاشمی نے دو قصیدے بھی لکھے تھے جو ذوالفقار خاں صوبے دار ارکاٹ کی مدح میں ہیں۔ایک مختصر مثنوی "ابیات

ہندی تصنیف ہاشمی" کے عنوان سے ہے۔ یہ ایک ہجویہ مثنوی ہے جس میں شاہ داول کی مذمت کی گئی ہے اور عورتوں کو نصیحت کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ نمونہ کلام پیش ہے۔

قصیدہ یا غزل اپنی کہیں جب شوق سوں اپنے — کہوں ہر بیت کوں دو دو طلب سوں کاندیتی ہوں
جاتا سوں اے مسافر رہنے کی بھی خبر ہے — آیا اتا کدھر سوں جاتا سو کہو کدھر ہے
سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی — بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
اونوں یاں آؤ کیئں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں — اٹھلتی اور مٹھلتی چپ گھڑی دوچار بیٹھوں گی

10.2.9 مرزا:

تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد دوم) میں پروفیسر سیدہ جعفر رقم طراز ہیں کہ "بساتین السلاطین " میں ابراہیم زبیری نے علی عادل شاہ ثانی کے دربار سے متوسل شعرا کا ذکر کرتے ہوئے مرزا کا بھی نام لیا ہے۔ مرزا نے سوائے مرثیہ نگاری کے کسی دوسری صنف میں دلچسپی نہیں لی۔ اس نے خود کو حمد رب العالمین ' نعت سید المرسلین اور منقبت ائمہ طاہرین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بیجا پور میں اس کے مرثیے زبان زد خاص و عام تھے۔ مرزا حب اہل بیت سے سرشار تھا اور ہر وقت مدح ائمہ طاہرین میں مصروف رہتا تھا۔ تمام عمر کسی امیر یا بادشاہ کی مدح نہیں کی۔ مرزا نے مرثیہ گوئی کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا تھا اور نہ وہ اس سے قرب شاہی یا مالی منفعت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مرزا کی زندگی کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ شب عاشور وہ رات بھر مرثیہ خوانی کرتا رہا صبح کے وقت کسی دشمن نے اسے خنجر سے شہید کر دیا۔ دوسرے دن یوم عاشور تھا عادل شاہ نے حکم دیا کہ شہر کے تمام تعزیے اور علم ابراہیم پور کے دروازے سے جو فتح پور دروازہ کے نام سے موسوم تھا لے جائے جائیں۔ تعزیوں اور علم کے پیچھے مرزا کا جنازہ روانہ ہوا۔ بیجا پور میں مرتضیٰ قادری کی درگاہ کے باہر پیوند خاک ہوا۔

مرزا کے مراثی کی ایک اہم خصوصیت ان کا تسلسل ہے۔ حضرت قاسم کا مرثیہ 1223اشعار پر محیط ہے۔ اس میں مرزا نے حضرت قاسم کی شہادت کی تفصیلات مسلسل نظم کی ہیں۔ ابتدا میں حضرت قاسم کی بہادری کی تعریف کی ہے پھر ان کے بھائی عبداللہ کی شہادت مختصراً بیان کی ہے۔ حضرت قاسم کے بازو پر بندھے تعویذ کا پس منظر' امام حسین سے آخری رخصت' قاسم ابن حسن کی شادی' میدان جنگ کو روانگی' ارزق کے چاروں بیٹوں سے جنگ اور پھر حضرت قاسم کی شہادت بیان کی گئی ہے۔ اس طرح کا سب سے طویل اور مسلسل مرثیہ سب سے پہلے احمد گجراتی اور پھر مرزا کے یہاں نظر آتا ہے۔ ورنہ دکنی ادب میں عام طور سے چھوٹے چھوٹے مرثیے غزل کی ہئیت میں نظم کرنے کی روایت تھی۔ مرزا کے مرثیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اجزائے مرثیہ کے اعتبار سے مرثیے لکھے ہیں، جیسے رخصت' آمد' رجز اور جنگ جیسے اجزائے مرثیہ جو بہت بعد میں شمالی ہند میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

مرزا کے مرثیوں میں شعری سانچوں کا تنوع نظر آتا ہے۔ مرزا نے مختلف بحروں سے کام لیا ہے۔ حضرت حر کو مرثیہ قصیدے کے فارم میں ہے جس میں مثنوی کی طرح قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ مرزا کے طویل مرثیے مربع کے فارم

میں بھی ہیں اور غزل کی ہئیت میں بھی۔مرثیوں سے اقتباسات پیش ہیں۔

آمد :

کیے قاسم کوں رخصت جب چڑے تازی پہ غازی تب ملک دیکھ آہ مارے سب کرو زاری مسلماناں
دیکھو تب قاسم شہہ جاں ترنگ چڑ دل اوپر آوان کیے اس کرن منے جولاں کرو زاری مسلماناں

رجز :

دیکھو جد ہیں منجے ویسے محمد ہور علی ایسے سو جدہ فاطمہ جیسے کرو زاری مسلماناں
پدر میرا دو جگ رہبر حسنؑ ابن علیؑ صفدر یو عمو ہے حسینؑ سرور کرو زاری مسلماناں

جنگ :

غضب میں آ وہ غازی تب سوٗ بھاوے دَل میں تازی تب کیے یوں شاہ بازی تب کرو زاری مسلماناں
اچا پیادیاں سواراں پر سٹے بھاراں کوں بھاراں پر کیے یک ہات ہزاراوں پر کرو زاری مسلماناں

شہادت:

تب اس یک تن پہ ساراں کئی ہر یک جن سے ہتیاراں کئی کیے چو پھر سوں واراں کئی کرو زاری مسلماناں
لگے بے حد زخم تن پر نکس ہو قاسم رہبر پڑے وئیں رَن میں شیر نر کرو زاری مسلماناں
پڑے جب رن میں ہو پر خوں اپس عموئے سرور کوں پکارے تب یو نعرے سوں کرو زاری مسلماناں
حسین اس غم سوں رورو کر سو قاسم کا مبارک سر لیے زانو پہ تب سرور کرو زاری مسلماناں

عادل شاہی دور کے شاعروں نے اگرچہ قصیدہ‘ غزل‘ رباعی اور مرثیہ کی صنف پر بھی توجہ دی ہے ،لیکن بہ حیثیت مجموعی مثنوی کی صنف ہی غالب نظر آتی ہے۔عادل شاہی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی گئی چوں کہ اس دور کی کم و بیش تمام نثری تصانیف صوفیائے کرام کی نگارشات ہیں اس لیے ان پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔نثری تصانیف میں برہان الدین جانم کا نثری رسالہ کلمۃ الحقائق اسی دور میں لکھا گیا۔نثر کی روایت کو آگے بڑھانے میں جانم کے خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل نے بھی اہم خدمت انجام دی۔

10.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- عادل شاہی دور دکن کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔895ھ سے1098ھ تک اس خاندان کے نو حکمرانوں نے مملکت بیجاپور پر نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔عادل شاہی حکمران علم و ادب اور فنون

لطیفہ کے شائق تھے۔انہوں نے علما، فضلا، شعرا ، ادبا اور اہل ہنر کی قدر دانی اور سرپرستی کی۔

- عادل شاہی حکومت میں دکنی زبان اور شعر و ادب کو بے مثال ترقی حاصل ہوئی۔
- حسن شوقی، شاہی، نصرتی اور ہاشمی اس دور کے نمائندہ شعرا ہیں جنہوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔
- شاہی کے علاوہ دیگر شعرا نے مثنوی نگاری میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیاہے،لیکن شاہی نے غزل گوئی اور قصیدہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا ہے۔
- حسن شوقی کی مثنوی میزبانی نامہ، فتح نامہ نظام شاہ، نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ ، ہاشمی کی یوسف زلیخانہ صرف دبستان بیجا پور کی شاہ کار مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں بلکہ اردو مثنوی کی تاریخ میں بھی اہم مقام کی مستحق ہیں۔
- مرزا اس دور کا مشہور مرثیہ گو شاعر ہے۔

10.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
خود مختار	:	آزاد ، با اختیار
ثقافت	:	تہذیب ، کلچر
مستحکم	:	مضبوط
بہرہ مند	:	فائدہ اٹھانے والا
صناعی	:	ہنر مندی، کاریگری
دقیقہ اٹھا نہ رکھنا	:	کسر نہ چھوڑنا
فرماں روا	:	حاکم، بادشاہ
ناچاقیاں	:	ان بن، بگاڑ
باکمال	:	کمال رکھنے والا
رزمیہ	:	جنگی داستان یا نظم
مورخ	:	تاریخ لکھنے والا
ریختی	:	وہ شاعری جو عورتوں کی زبان میں کی جائے
دبستان	:	اسکول

10.5 نمونۂ امتحانی سوالات

10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور تصنیف کو ن سی ہے؟

(a) سب رس (b)ابراہیم نامہ (c)گلدستہ (d) نورس

2۔ نصرتی کی رزمیہ مثنوی کا نام کیا ہے؟

(a) علی نامہ (b)گلشن عشق (c)تاریخ اسکندری (d)ان میں سے کوئی نہیں

3۔ "میزبانی نامہ" کس کی مثنوی ہے؟

(a) صنعتی (b) حسن شوقی (c)نصرتی (d)ہاشمی بیجاپوری

4۔ "گلدستہ" کس کی تصنیف ہے؟

(a) حسن شوقی (b)ہاشمی بیجاپوری (c) صنعتی (d)ابن نشاطی

5۔ مثنوی "یوسف زلیخا" کے مصنف کون ہیں؟

(a) ہاشمی بیجاپوری (b)عبدل (c)مقیمی (d)شاہی

6۔ بیدل کس کے زمانے میں درباری شاعر تھا؟

(a) ابراہیم عادل شاہ ثانی (b)یوسف عادل شاہ (c)علی عادل شاہ اول (d)محمد عادل شاہ

7۔ شیخ نصرتی کا اصل نام کیا تھا؟

(a) شیخ نصرت (b)شیخ نصرتی (c)محمد نصرت (d)محمد نصرتی

8۔ بیجا پور کا مشہور مرثیہ گو شاعر کون ہے؟

(a) مرزا (b)بیدل (c)ہاشمی (d)شاہی

9۔ مثنوی "یوسف زلیخا" کی سنہ تصنیف کیا ہے؟

(a)1026ھ (b)1065ھ (c) 1099ھ (d) 1095ھ

10۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a) ابراہیم عادل شاہ ثانی (b)یوسف عادل شاہ (c)علی عادل شاہ اول (d)محمد عادل شاہ

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ عادل شاہی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بارے میں لکھیے۔

2۔ عادل شاہی دور کی کسی ایک مثنوی کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ہاشمی بیجاپوری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

4۔ سب رس پر ایک نوٹ لکھیے۔

5۔ مرزا کی مرثیہ نگاری کے بارے میں لکھیے۔

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نصرتی کی ادبی خدمات تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ عادل شاہی دور کی مثنویوں کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ذیل کے کسی دو شاعروں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1۔حسن شوقی 2۔شاہی 3۔مرزا 4۔ہاشمی

10.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
3۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
4۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد دوم، سوم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی کی تین مثنویاں	پروفیسر محمد علی اثر

10.5.1 کے جوابات:

1۔d	2۔a	3۔b	4۔c	5۔a
6۔a	7۔c	8۔a	9۔c	10۔b

اکائی 11: قطب شاہی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 قطب شاہی دور کا سماجی اور تمدنی پس منظر
11.2.1 قطب شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا
11.2.2 محمد قلی قطب شاہ
11.2.3 اسد اللہ وجہی
11.2.4 عبداللہ قطب شاہ
11.2.5 جنیدی
11.2.6 غواصی
11.2.7 ابن نشاطی
11.3 اکتسابی نتائج
11.4 کلیدی الفاظ
11.5 نمونۂ امتحانی سوالات
11.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

اردو ادب کی تاریخ میں قطب شاہی دور کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔اس سلطنت کے تمام حکمران علم و ادب کے دل دادہ اور شاعروں اور فن کاروں کے قدر دان تھے۔بیشتر سلاطین جیسے جمشید قلی، محمد قلی، محمد قطب شاہ ، عبداللہ

قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد کو دکنی ادب کی تاریخ کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔محمد قلی قطب شاہ ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر تھا۔اس کے دور کے اہم شعرا میں وجہیؔ غواصیؔ اور ابن نشاطیؔ کے نام اہم ہیں۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- قطب شاہی دور کے سماجی اور تمدنی پس منظر کا جائزہ لے سکیں۔
- اس دور کے اہم شعرا اور نثر نگاروں کی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔
- اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی شاعری سے واقف ہو سکیں۔
- ملک الشعرا ملا وجہی کی شاعری اور نثر کا مطالعہ کر سکیں۔
- جنیدی، غواصی اور ابن نشاطی کی مثنویوں کا جائزہ لے سکیں۔

11.2 قطب شاہی دور کا سماجی اور تمدنی پس منظر

بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد دکن میں جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں سلطنت گولکنڈہ کو اس کے محل وقوع، خوش گوار آب و ہوا، سیاسی استحکام ، معدنی دولت، تہذیب و شائستگی، فنون لطیفہ کے فروغ اور علم و ہنر کی سر پرستی کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل ہے۔قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان محمد قلی کے آباو اجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔اس خاندان کے بعض افراد ترکستان سے ایران اور پھر ہندوستان منتقل ہو گئے تھے۔سلطان محمد قلی بہمنی خاندان کے فرماں روا محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں بیدر آیا اور دربار شاہی میں ملازمت اختیار کرلی۔سلطان قلی نے اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت بڑی ترقی کی۔1496ء میں اس کو تلنگانہ کا گورنر بنایا گیا۔اپنی گورنری کے زمانے میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے تلنگانہ کے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کی۔جب بہمنی سلطنت کو زوال ہوا تو اس نے1518ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔سلطان قلی کو بڑھاپے میں اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کروایا اور جمشید قطب شاہ کے نام سے (1543ء۔1550ء)تخت نشین ہوا۔جمشید کی موت پر سلطان قلی کا چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب شاہ (1550ء)تخت نشین ہوا۔ابراہیم کے عہد میں گولکنڈہ کو بڑا استحکام حاصل ہوا۔اس نے نظم و نسق میں مفید اصلاحیں کیں۔اس کے دور میں دکنی کلچر کا خمیر اٹھا اور ایک گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ابراہیم نے ہندوستان اورایران کی تہذیبوں کے امتزاج سے ایک ایسے نئے کلچر کی تعمیرو تشکیل کی جو مقامی عناصر اور عجمی تصورات کا خوب صورت امتزاج تھا۔ابراہیم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ چوں کہ ایک تلگو ریاست وجیا نگر میں بسر ہوا تھا اس لیے اس کے مزاج میں

مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔یہی وجہ ہے کہ ابراہیم قلی قطب کے عہد میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔

ابراہیم قلی کو فارسی اور اردوکے ساتھ ساتھ تلگو زبان سے بھی دلچسپی تھی۔تلگو شاعروں میں وہ بالعموم "ملک برام" کے نام سے مشہور تھا۔اس نے اپنے عہد حکومت میں علم و ہنر اور شعر و ادب کی ترقی اور فروغ سے دلچسپی لی اور گولکنڈے میں ایک ایسا ماحول پیدا کیاجو بعد میں بھی علم و ادب کی ترقی کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ابراہیم کے عہد میں بادشاہ کی علم دوستی کا چرچا سن کر احمد نگر، گجرات اور بیدر سے بہت سے شعرا اور اہل علم و حرفہ نے گولکنڈہ کا رخ کیا اور یہیں کے ہو رہے تھے۔قطب شاہی دور کے اولین شعرا فیروزؔ، محمودؔ اور ملا خیالیؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم کے انتقال کے بعد محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں تخت نشین ہوا۔اس کا دور حکومت گولکنڈے کا عہدزریں ہے۔وہ خود ایک صاحب دیوان اور بلند پایہ شاعر تھا۔اس نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی اور ریختی وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا تھا۔محمد قلی کو فن تعمیر، شاعری، موسیقی، نقاشی، خطاطی اور مصوری سے غیر معمولی شغف تھا۔اس نے جب شہر حیدرآباد بسایا تو تعمیر کاری، تزئین و آرائش اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اسے ایک بے مثل شہر بنایا۔شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کی قدر افزائی اور سر پرستی کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، جس کی وجہ سے اس وقت کے مشہور علما، شعرا اور ادیب اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔گجرات کے مشہور شاعر شیخ احمد گجراتی اسی کے دور میں گولکنڈہ آئے تھے۔اسداللہ وجہیؔ اسی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔

محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور دامادسلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔وہ بڑا علم دوست حکمران تھا محمد قلی کے دیوان پر اس کا منظوم دیباچہ اس کے کلام کا واحد نمونہ ہے۔محمد قطب شاہ ایک خدا پرست اور دین دار بادشاہ تھا اس لیے اس کے دور میں مذہبی امور کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔اسی نے حیدرآباد کی تاریخی مسجد "مکہ مسجد" کی بنیاد رکھی۔اسے کتابیں جمع کرنے اور ان پر اپنی رائے تحریر کرنے یا دستخط ثبت کرنے کا شوق تھا۔اس نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا فرزندعبداللہ قطب شاہ 1626ء میں گولکنڈہ کا حکمران بنا۔اس کا عہد حکومت (1626ء تا1672ء)سب سے طویل تھا۔اس کے عہد میں گولکنڈے کی تہذیبی سر گرمیوں کا دوبارہ احیا ہوا جو شعرا اور فن کارسلطان محمد قطب شاہ کے دور میں گوشہ نشین ہو گئے تھے وہ پھر منظر عام پر آگئے۔عبداللہ قطب شاہ کے مزاج اور کردار میں اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ سے بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔غواصی نے لکھا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہونے سے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا محمد قلی دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا داماد ابوالحسن تانا شاہ 1672ء میں گولکنڈہ کا آخری تاجدار بنا۔تانا شاہ کا دور اگرچہ گولکنڈہ کے زوال کا دور ہے ،لیکن شعر و ادب کی ترقی کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔بادشاہ خود

بھی شعر کہتا تھا اور اپنے دور کے شاعروں اور ادیبوں کا سر پرست تھا۔فائزؔ، طبعی اور عابد شاہ حسینی اسی دور کے شاعر و ادیب ہیں۔بالآخر سقوط گولکنڈہ نے اردو ادب کے ایک زریں دور اور ایک دبستان کا خاتمہ کر دیا۔

11.2.1 قطب شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا:

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروزؔ، محمودؔ اور خیالیؔ کے نام ملتے ہیں۔یہ تینوں شعرا ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔قطب الدین فیروزؔ در اصل بیدر کا باشندہ تھا اور بعد میں گولکنڈہ چلا آیا تھا۔فیروز کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔مگر اس کی شاعری کی عظمت اور استادی کا اعتراف گولکنڈے کے شعرا وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے کیا ہے۔اس کی تصانیف میں ایک مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔فیروزؔ کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ بعد کے زمانہ میں ولیؔ کی دہلی میں۔

فیروزؔ کی طرح سید محمودؔ اور ملا خیالیؔ بھی قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔وجہیؔ، محمد قلی اور ابن نشاطیؔ نے انھیں عظیم المرتبت شاعر اور استاد سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔محمودؔ کے کلام کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' (جلداول) میں محمودؔ کی چند غزلیں اور بعض غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں۔ملا خیالیؔ کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہوئی ہے۔

11.2.2 محمد قلی قطب شاہ:

گولکنڈے کا پانچواں حکمران محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں تخت نشین ہوا۔اس نے شہر حیدرآباد بسایااور اس شہر میں بسنے والے مختلف طبقوں کے درمیان خلوص اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترویج کی۔محمد قلی قطب شاہ کو ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔اس کا دور حکومت مجموعی طور پر امن و امان میں گزرا۔اس کے دور میں ایران کے مشہور عالم اور مدبر میر مومن حیدرآباد میں تھے، جنھیں اس نے اپنا مشیر مقرر کیا تھاسلطنت کے بیشتر کارو بار کی نگرانی میر مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی وجہ ہے کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی الجھنوں سے آزاد رہ کر بڑی حد تک عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔

محمد قلی قطب شاہ دکنی اردوکا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔موجودہ معلومات کی روشنی میں محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے ،جس کو اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔اس کے دیوان میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، نظمیں، رباعیاں تقریباً سبھی اصناف سخن موجود ہیں،لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔

محمد قلی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی ٔبیان ہے۔اس نے اپنے جذبات ، احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی ، روانی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔محمد قلی کی شاعری گویا اس کی زندگی کا آئینہ ہے ،جس میں اس

کے واقعاتِ حیات کی متحرک تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔وہ ایک کثیرالمحبوب شاعر تھا۔مورخوں کا بیان ہے کہ بیسیوں ملکوں کی حسینائیں اس کے محل میں جمع تھیں۔محمد قلی نے انہیں مختلف نام بھی دیے تھے اور ان میں سے بعض محبوب حسیناؤں کا ذکر تفصیل سے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔محمد قلی کے کلام میں درد و غم اور ہجر و فراق کی کیفیات کی ترجمانی نہیں ملتی۔اس اعتبار سے وہ اردو کا ایک منفرد شاعر ہے ،جس کے کلام میں ہر جگہ آسودگی اور وصال کی کیفیات کی تصویریں ملتی ہیں۔

محمد قلی کی شاعری اپنے عہد کے تہذیبی عناصر کی بھر پور ترجمانی کرتی ہے۔اس نے اپنے دور کے لباس' زیورات' طرز معاشرت اور ثقافت سے متعلق جو معلومات اپنے اشعار میں پیش کی ہیں وہ ہماری تہذیب کے بیش بہا خزانے ہیں جنھیں اشعار کی صورت میں محمد قلی نے ہمیشہ کے لیے تاریخ و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے محفوظ کردیا ہے۔اس نے اپنی شاعری میں اپنے محلوں کا ذکر بھی کیا ہے اپنے ہاتھی گھوڑے پر بھی نظمیں کہی ہیں۔شادی بیاہ کے رسوم و رواج 'عیدوں' تہواروں' موسموں کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔یہ ساری تقاریب خواہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا موسمی تہواروں کی 'محمد قلی کے لیے عیش و عشرت کے ایک تازہ عنوان کی حیثیت رکھتی تھیں اور وہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ نبیؐ اور علیؓ کے صدقے سے دن رات عیش کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔

محمد قلی کا کلام اس کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا بھی مظہر ہے۔اس نے دکن کے ذرے ذرے سے محبت کی۔اس سر زمین کے موسموں' پہاڑوں اور دریاؤں اور یہاں کے شب و روز سے اسے والہانہ وابستگی تھی۔ہندوستانی معاشرت' ہندوستانی طرز زندگی 'یہاں کے رسم و رواج اور ثقافتی میلانات محمد قلی کے طرز فکر میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ جگہ جگہ یہ عناصر اپنا پرتو دکھاتے ہیں۔کلام سے کچھ نمونے پیش ہیں۔

مناجات:

مناجات میرا تو سن یا سمیع　　منجے خوش توں رک رات دن یا یا سمیع
میرے دوستا ں کوں تو نت دے جنت　　میرے دشمناں کوں اگن یا سمیع
میرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

عید میلاد النبی:

درود لک اس نبی پر جو نرنجن رب کے پیارے ہیں
جو فیروزی مہاڑیاں نو جنن کے تیئں سنگارے ہیں
انن دن مولود آئے خوش خبر قدسی جو پائے خوش
پھرا مولود گنائے خوش جنت آٹو سنوارے ہیں

بسنت:

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا　　تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں　　کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

مرگ سال:

مرگ سال آئیا پھر تھے مرگ نینی سنگاراں کر
جڑت مانگ بہوٹیاں لعل موتیاں لیک دھاراں کر

غزل :

پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند　　دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

ہمیں ہیں بے ہنر ،گر ہوئے نظر یار　　ہنر داراں میں دِیسیں گے ہنر دار
دیا استاد منج تعلیم کچھ ہور　　ہمن کچھ دیکھ کر باندھے ہیں زنار
درد جانے حکیم خوب دانا　　ہمارا درد کیا بوجھیں گے اغیار

مرثیہ:

محرم مھینے میں آیا اماماں کا سو غم پھر کر　　زمیں ہور آسماں میانے بھریا سر تھے الم پھر کر

رباعی:

تج روپ بنا میری نظر میں سو نہ آوے　　تج کوچے میں بن منج کوں گزر کرنے نہ آوے
تج دور میں نیند سب کوں خوش آوے ولے　　منج نین منے نیند سو یک پل نہ سماوے

11.2.3 اسداللہ وجہی:

اسداللہ وجہی قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بلند پایہ عالم اور فلسفی بھی تھا۔اس کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔غالباً وہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے عہد(1550ء۔1580ء) میں پیدا ہوا اور پھر اس نے مزید تین قطب شاہی سلاطین محمد قلی قطب شاہ (1580ء۔1611ء)،محمد قطب شاہ (1611ء۔1626ء)اور عبداللہ قطب شاہ(1626ء۔1674ء)کا زمانہ بھی دیکھا۔وجہیؔ نے مثنوی قطب مشتری،تاج الحقائق،سب رس اور فارسی دیوان کے علاوہ چند غزلیں اور مرثیے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اسے بے حد عزیز رکھتا تھا اس نے وجہیؔ کو اپنے دربار کا" ملک الشعرا" مقرر کیا تھا۔اس دور میں وجہیؔ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔وہ بادشاہ وقت کا دست راست بن گیا تھا۔اسی دور میں اس نے اپنی شاہ کار مثنوی " قطب مشتری" (1018ھ م1609ء)لکھی۔یہ وجہیؔ کی طبع زاد مثنوی ہے۔اس مثنوی کو وجہیؔ نے صرف بارہ دن میں مکمل کیا۔اس کا موضوع قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق ہے۔مثنوی کا آغاز حمد' مناجات اور نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔اس کے بعد مدح بادشاہ ہے پھر وجہیؔ نے " در شرح گوید" کے تحت شاعری سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں ، جس سے اس کے تنقیدی تصورات کی عکاسی ہوتی ہے۔اس مثنوی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کم و بیش تمام کرداروں کے نام محمد قلی قطب شاہ کے خاندانی نام "قطب " کی مناسبت سے ستاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں،جیسے مشتری' عطارد' زہرہ' مریخ وغیرہ۔وجہیؔ کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔اس مثنوی میں وجہیؔ نے انسانی جذبات کی تصویر کشی ' کردار نگاری اور منظر نگاری کے دل کش مرقع پیش کیے ہیں۔قطب مشتری میں مثنوی کے درمیان وجہیؔ نے رباعیاں اور غزلیں بھی کہی ہیں اور یہ رباعیاں اور غزلیں متن کے جزو کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وجہیؔ صرف ایک با کمال شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کا ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھا۔وجہیؔ کی نثری تصنیف" سب رس "ہے۔اس کتاب کو وجہیؔ نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر1045ھ م1635ء میں لکھا تھا۔اس کتاب کی وجہ سے وجہیؔ کو شہرت اور عظمت حاصل ہوئی۔"سب رس" کو نہ صرف دکنی زبان میں بلکہ سارے اردو ادب میں پہلا ادبی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔حالاں کہ" سب رس "سے پہلے دکنی زبان میں نثری رسالے ملتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ادبی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔"سب رس "وہ پہلی نثری کتاب ہے جو عشقیہ قصے پر مبنی ہے اور ادبی معیارات پر پوری اترتی ہے۔"سب رس "کا قصہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف "قصہ حسن و دل" سے ماخوذ ہے۔وجہیؔ نے اپنی بے پناہ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک تخلیقی تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔اس کا اسلوب مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔قصے کے دلچسپ عناصر' اس کی ادبی اور تخلیقی نثر' وجہیؔ کا زور بیان اور اس کی انشا پردازی کے سبب یہ کتاب اردو نثر کے لا زوال نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

"سب رس" ایک تمثیلی قصہ ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات اور انسانی صلاحیتوں اور قوتوں جیسے عشق' عقل' حسن' غمزہ' عشوہ' ناز' ناموس' ہمت' دل' نظر'خیال' وہم' صبر' وفا وغیرہ کو کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔یہ قصہ دو سطحوں پر آگے بڑھتا ہے۔ایک سطح ظاہری کہانی کا انداز لیے ہوئے ہے اور دوسری سطح علم باطنی سے متعلق ہے۔

"سب رس" کا قصہ ظاہری سطح پر آب حیات کی تلاش اور حسن و عشق کا بیان ہے۔مغرب میں سیستان نام کے ایک شہر میں بادشاہ عقل کی حکومت تھی۔اس بادشاہ کا ایک بیٹا تھا ،جس کا نام دل تھاجو لیاقت' ہنر مندی' بہادری' عقل مندی اور حسن و جمال میں بے مثال تھا۔بادشاہ عقل نے اپنے شہزادہ دل کو شہر تن کی حکومت عطا کی تھی۔شہزادہ دل کو آب حیات کی تلاش تھی۔اس کا دوست نظراپنے دوست کی خاطر آب حیات کی تلاش میں نکلتا ہے۔بالآخر اسے پتہ چلتا ہے

کہ آب حیات شہزادی حسن کے شہر دیدار کے باغ رخسار کے چشمۂ دہن میں ہے۔نظر کسی نہ کسی طرح شہزادی حسن تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی حسن ایک ہیرے پر کندہ تصویر پر فدا ہے۔اتفاق سے وہ تصویر شہزادہ دل کی ہوتی ہے۔جب شہزادی حسن کو نظر سے شہزادہ دل کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ نظر سے درخواست کرتی ہے کہ کسی بھی طرح وہ شہزادہ دل کو شہر دیدار لے آئے۔

یہاں سے قصہ آب حیات کی تلاش کے بجائے حسن و عشق کے بیان تک محدود ہو جاتا ہے۔نظر مملکت تن پہنچ کر شہزادہ کو نہ صرف آب حیات کی خوش خبری سناتا ہے بلکہ شہزادی حسن کی تعریف کچھ اس طرح کرتا ہے کہ دل شہزادی حسن کو دیکھے بغیر ہی اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور شہزادی حسن سے ملنے شہر دیدارچلنے تیار ہو جاتا ہے۔جب بادشاہ عشق کو اطلاع ملتی ہے تو وہ شہزادہ دل کو گرفتارکرنے کے لیے لشکر بھیجتا ہے۔شہزادہ دل گرفتار ہوکر شہزادی حسن کے پاس لایا جاتا ہے اور بادشاہ عشق کے حکم سے قید کردیا جاتا ہے۔شہزادہ دل اور شہزادی حسن دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔رقیب کی بیٹی غیر کی سازش کی وجہ سے حسن اور دل میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور رقیب شہزادہ کو اپنے قید خانے ہجراں میں قید کردیتا ہے، لیکن جب حسن کو حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شہزادہ دل بے قصور ہے تب وہ بہت پچھتاتی ہے۔ادھر عقل کے وزیر قامت کے ذریعے شہنشاہ عشق اور بادشاہ عقل میں صلح ہو جاتی ہے۔حسن کی درخواست پر بادشاہ عشق اپنی فوج بھیج کر شہزادہ دل کو رقیب کی قید سے نجات دلاتا ہے اور حسن اور دل کی شادی ہوجاتی ہے۔

ظاہری طور پر تو یہ حسن و عشق کا بیان ہے ،لیکن داخلی سطح پر وجہیؔ نے تصوف کے اسرار و رموز کو قصے کے طور پر بیان کیا ہے۔یعنی قصے کے ذریعے حسن حقیقی تک پہنچنے اور اس کا دیدار حاصل کرنے کے دوران پیش آنے والے واقعات اور کیفیات کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔وجہیؔ نے قصے کے بیان کے ساتھ ساتھ پند و نصیحت کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔کلام سے اقتباسات پیش ہیں۔

قطب مشتری:

شہنشہ مجالس کیے ایک رات — وزیران کے فرزند تے سب سنگات
ہر یک خوب صورت ، ہر ایک خوش لقا — سو ہر ایک دلکش ہر ایک دلربا
مہابت کے کاماں میں جم جم ہے جیو — شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیو

نگر میں جو آیا قطب شاہ نول — گگن بجنے چوندھر خوشیاں کے طبل
شہر میں سو عید آج لوگاں کیے — گھرے گھر انند کاج لوگاں کیے

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس — بھلا ہے جو اک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیرے بات میں — پڑیا جائے کیوں جز لے کر ہات میں

جسے بات کے ربط کا فام نیئں اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نیئں

اگر فام ہے شعر کا تجکوں چھند چنے لفظ لیا ہور معنی بلند

نکو بول مضمون تو ہور کا کہ کالا ہے دو جگ میں منہ چور کا
جتا چوری کر چور اپے ساؤ ہوئے دغا باز اچکے کوں مانے نہ کوئے
چرا کر چراتا نہ کی چور کوئی یو باتاں سمجھتے سو ہیں ہور کوئی

11.2.4 عبداللہ قطب شاہ:

عبداللہ قطب شاہ گولکنڈہ کا ساتواں تاجدار تھا۔وہ محمد قطب شاہ اور حیات بخشی بیگم کا فرزند اور محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ تھا۔عبداللہ قطب شاہ 1023ھ میں پیدا ہوا اور1083ھ میں اس کا انتقال ہوا۔گولکنڈہ میں مدفون ہے۔عبداللہ قطب شاہ بھی اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح ایک قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر تھا۔اس نے شاہ عبدلاؔ' عبداللہ' قطب شاہ عبداللہ اور عبداللہ سلطان تخلص استعمال کیے ہیں۔

شاہ عبداللہ نبیؐ کے صدقے تیرے عشق میں یوں ہوا مشہور جگ میں جیوں ہے مشہور آفتاب
نبیؐ صدقے عبداللہ سلطان سوں ملا رکھّ منج نت میرے ربنا
نبی ؐ صدقے عبداللہ اوتار شہہ ہے خدا کن جو امید مانگیا سو پایا
صدقے نبی ؐ کے شکر کرے شاہ عبدلا تج سا چڑھیا دیکھ ور شاہوار ہات

عبداللہ قطب شاہ کا دور امن و امان کا دور تھا۔ادبی اعتبار سے یہ گولکنڈے کا سنہرا دور تھا۔عبداللہ کے دربار میں ایسے نامور شعرا تھے جن کے ادبی کارناموں پر اردو ادب ناز کرسکتا ہے۔اس نے محمد قلی قطب شاہ کے روایات کی پیروی کی اور انھیں حیات نو عطا کی۔اسے اپنے نانا کی طرح موسیقی' ادب اور فنون لطیفہ سے طبعی مناسبت تھی۔عبداللہ قطب شاہ کے دور میں شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی قدردانی وسر پرستی کی وجہ سے قطب شاہی دربار پھر سے شعر و نغمہ کی دلفریب صداؤں سے گونج اٹھاتھا۔عبداللہ قطب شاہ کی علم دوستی اور جوہر شناسی نے ایران و توران اور شام و روم کے باکمالوں کو قطب شاہی پایہ تخت آکر قسمت آزمانے اور علم و ادب کی خدمت کرنے کا موقع عطا کیا۔فارسی کی مشہور لغت ''برہان قاطع'' اسی دور کی یادگار ہے۔حضرت ابن خاتون نے ''کتاب الارشاد'' اور'' جامع عباسی''پر حواشی لکھے۔ملا جمال الدین نے ''کتاب المصباح'' کو ملا علی ابن طیفور نے''عیون اخبارِرضا'' کو فارسی میں منتقل کیااور مولانا حسین آملی نے ''نہج البلاغہ'' کی شرح لکھی۔

عبداللہ قطب شاہ محمد قلی کی طرح باغ و بہار شخصیت کا مالک شاعر تھااسی لیے شوخی' رنگینی و شادابی' پیرایہ اظہار کا بانکپن اور سحر طرازی اس کی شاعری کانمایاں وصف ہے۔عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا کی طرح فن موسیقی کا بھی دلدادہ

تھا۔اس کے اشعار صوری حسن کا بہترین نمونہ ہیں۔اس نے الفاظ کی جھنکار اور ان کی بندش سے اپنے کلام میں ایک ہلکی سی موسیقیت پیدا کی ہے۔ترنم ریزی اور غنائیت سے اس کے اشعار معمور ہیں۔بقول پروفیسر سیدہ جعفر " عبداللہ قطب شاہ نے نہ صرف عملی زندگی میں اپنے نانا کی روایات کو نئی زندگی بخشی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کلام محمد قلی کی شعری روایات کا بھی پرستار تھا۔جس طرح محمد قلی کے کلام کے دو عناصر یعنی مذہب پرستی اور عیش کوشی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں .اسی طرح ان عناصر کا پرتو عبداللہ قطب شاہ کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔"

11.2.5 جنیدی:

احمد جنیدی کے حالات زندگی بھی دوسرے شعرا کی طرح پردہ تاریکی میں ہیں۔اس کے نام کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔"اردوئے قدیم" میں شمس اللہ قادری احمد جنیدی کا نام شیخ احمد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں"شیخ احمد نام' سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں اس نے "ماہ پیکر" کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔"نصیر الدین ہاشمی نے شاعر کا نام صرف احمد لکھا ہے اور لکھتے ہیں کہ اس نے شاعری ترک کرکے برہان پور میں اقامت اختیار کی تھی۔ڈاکٹر زور ' شمس اللہ قادری پر تنقید کرتے ہوئے "اردو شہ پارے" میں لکھتے ہیں کہ "چوں کے ان کی نظر سے مثنوی "ماہ پیکر" کا کوئی نسخہ نہیں گزرا اسی لیے جنیدی کا نام شیخ احمد بتایا ہے۔"ڈاکٹر زور نے مثنوی "ماہ پیکر" کے شاعر کا نام اکبر جنیدی دکھنی بتایا ہے۔" پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ "کسی قدیم تصنیف میں احمد جنیدی کے حالات زندگی محفوظ نہیں اس کی مثنوی واحد ماخذ ہے ، جس سے اس کے نام اور بعض واقعات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔یہ امر غور طلب ہے کہ مثنوی"ماہ پیکر" میں شاعر نے اپنا نام کہیں شیخ احمد تحریر نہیں کیا ہے۔بلکہ ہر جگہ وہ خود کو احمد جنیدی ہی کہتا ہے۔

کہ احمد جنیدی پہ کر یوں کرم　　رھوے نانوں زباں پر محمد جرم
کہ احمد جنیدی توں دک یو بچار　　دیکھا چاند کوں کاڑ برقعہ سے بھار
کہ احمد جنیدی یو غم خانہ چھوڑ　　کہ اک ماہ پیکر کا غم سات بول

مثنوی " ماہ پیکر" 1064ھ مطابق1653ء میں لکھی گئی۔جیسا کہ خود احمد جنیدی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

نبیؐ کی سو ہجرت کا یو تھا قرار　　چہار سال تین بیس بھی یک ہزار

مثنوی کی سبب تالیف بتاتے ہوئے احمد جنیدی کہتا ہے کہ ایک دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کے پیکر اور ماہ کا قصہ ہم کو سنا۔یعنی نظم کر۔وہ دونوں پاکباز عاشق و معشوق تھے۔میں نے عذر کیا اور اپنے دوستوں کو جواب دیا کہ مدت دراز سے شاعری کا مشغلہ میں نے ترک کردیا ہے اور ایک عرصہ ہوا شعر گوئی سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔اس واقعہ کے کئی دن بعد یکایک مجھے ایک رات الہام ہوا کہ تو "جواہر کی در جگ" کھولنے عذر مت کر' تو اپنے دل کے دریا میں غوطہ لگا کر غواصی کر اور در شہوار لے آ۔میں فکر مند ہو گیا تو میرے پیر نے ہمت بندھائی اور میں نے مثنوی مکمل کی۔بقول عبدالقادر سروری " ماہ پیکر" ایک نایاب مثنوی ہے۔ساری دنیا میں اس مثنوی کے صرف دو نسخے

دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ دونوں نسخے کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔پروفیسر سیدہ جعفر نے اس مثنوی کو مرتب کرکے شائع کیا ہے۔

اس مثنوی کی ادبی، لسانی، تاریخی اور ثقافتی اہمیت مسلمہ ہے۔ماہ پیکر مثنوی کی ہیروئین کا نام نہیں بلکہ پیکر اس قصہ کا ہیرو اور ماہ اس کی محبوبہ ہے۔اس مثنوی میں ان کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔احمد جنیدی نے قطب شاہی عہد کی معاشرت کی کامیاب عکاسی کی ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے قطب شاہی تہذیب کے خد و خال پر روشنی پڑتی ہے۔مثنوی کے آخر میں ماہ اور پیکر کی شادی کی ان رسومات کی تصویر کشی کی گئی ہے ،جو قطب شاہی عہد میں مروج تھیں۔احمد جنیدی کو منظر کشی اور محاکات نگاری میں کمال حاصل تھا۔اس دور کی طرز معاشرت ، خواتین کے سنگھار، عطریات، خوشبو دار اشیا اور سامان آرائش کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔احمد جنیدی نے شادی کی جن رسومات کی تصویر کشی کی ہے وہ آج بھی جنوبی ہند میں رائج ہیں۔تقریباً ساڑھے تین سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔بقول پروفیسر سیدہ جعفر"ماہ پیکر " عہد گزشتہ کے تہذیبی مظاہر کی ایک اہم دستا ویز ہے۔شاعر کے وسیع مشاہدے اور اس کے ثقافتی شعور نے اس مثنوی میں ایک مٹی ہوئی تہذیب کے نقوش کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے۔اگر ہم قطب شاہی تمدن کی ایک جھلک دیکھنا چاہیں تو اس عہد گزشتہ کے تمدنی عناصر اور ثقافتی میلانات کا پرتو ہمیں احمد جنیدی کی ماہ پیکر میں نظر آسکتا ہے۔شادی کی تقاریب کی محفلوں کو کس طرح آراستہ کیا جاتا تھا اور مہمانوں کے استقبال کے آداب کیا تھے اس کا اندازہ اس مثنوی سے ہو سکتا ہے۔فرش کی آرائش اور محفل رقص و موسیقی کے دل کش مرقعے اس مثنوی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔مثنوی سے اقتباس پیش ہے۔

جلے عود بتیاں بر ملی باس سوں		دھویں سوں نہ طاقت اتھا سانس کوں
کہ جلوے کے کارن نہلانے کوں سر		کرن لاگے چکسا سو ہم یک دیگر
عنبر ہور ہلد زعفراں بھاکلا		گلاب ہور مشک سارا اس میں میلا

11.2.6غواصی:

غواصیؔ قطب شاہی عہد کا ایک عظیم المرتبت اور قادر الکلام شاعر تھا۔غواصیؔ کا نام شیخ عبدالطیف ، لقب غواصی، کنیت ابو محمد اور تخلص غواصی تھا۔اس کی تاریخ پیدائش اور حالات زندگی بڑی حد تک پردۂ تاریکی میں ہیں۔اس کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے صرف اس قدرپتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اس نے شاعری کا آغاز کیا۔اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کا دور غواصیؔ کی شاعری کا زریں دور ہے۔

غواصیؔ کی ابتدائی زندگی مفلوک الحالی میں گزری۔ملک الشعرا کا اعزاز ملنے سے قبل وہ ایک معمولی ملازم تھا۔اور

پہرے داری کی خدمت پر مامور تھا۔یہ ملازمت غواصی جیسے حساس شاعر کے لیے تکلیف دہ تھی۔اس لیے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے ایک قصیدے میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے ایک گاؤں بخشا جائے اور پہرے کی خدمت سے معاف فرمایا جائے۔عبداللہ قطب شاہ جو نہ صرف شاعروں' ادیبوں اور اہل کمال کا قدر دان تھا اس نے نہ صرف غواصیؔ کی خاطر خواہ سر پرستی کی بلکہ اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایااور قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے اس کو بیجا پور روانہ کیااور ''فصاحت آثار''کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔

غواصیؔ کی تین مثنویوں مینا ستونتی' سیف الملوک او ر بدیع الجمال اور طوطی نامہ کے علاوہ غزلوں' قصیدوں' رباعیوں اورمرثیوں پر مشتمل دیوان منظر عام پر آچکا ہے۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصیؔ دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔اظہار بیان کی سادگی غواصیؔ کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

مثنوی نگاری میں غواصیؔ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔''مینا ست ونتی'' غواصیؔ کی پہلی مثنوی ہے،جس کاقصہ حمیدیؔ کے فارسی ''عصمت نامہ '' پر مبنی ہے۔اس مثنوی کا مرکزی تصور عورت کی عظمت و عفت اور اخلاقی اقدار سے متعلق ہے۔ اس میں بالا کنور نامی ایک راجہ کی حسین بیٹی ''چندا'' کے ایک شادی شدہ چرواہے ''لورک'' پر فریفتہ ہونے اور اس کے ساتھ فرار ہونے کی داستان بیان کی گئی ہے۔لورک کی بیوی کا نام ''مینا'' ہے جو ایک ہندوستانی با عصمت ' شوہر پرست اور وفا شعارعورت ہے۔بالا کنور اپنی بیٹی کا بدلہ لینے کی غرض سے ''مینا'' کو اپنے محل کی زینت بنانا چاہتا ہے۔اس کام کے لیے ایک چالاک دلالہ مقرر کی جاتی ہے جو مینا کو برائی کا راستہ اپنانے کے لیے اکساتی ہے ،لیکن مینا دلالہ کے جال میں گرفتار نہیں ہوتی۔غواصیؔ نے اس مثنوی میں اپنے عہد کی نسوانی زبان' عورتوں کے طرز تکلم' روزمرہ' محاوروں 'ضرب الامثال اور عورتوں کے انداز فکر کی اچھی عکاسی کی ہے۔

مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال''کا قصہ داستان الف لیلہ کے فارسی نثری ترجمے پر مبنی ہے۔اس میں مصر کے شہزادے سیف الملوک اور جنوں کی شہزادی بدیع الجمال کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔یہ مثنوی صرف غواصیؔ کی ہی نہیں بلکہ دکنی اردو کی شاہ کار مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔اس مثنوی میں غواصیؔ نے جذبات نگاری' سراپا نگاری' رزم نگاری اور منظر نگاری کے خوب صورت نمونے پیش کیے ہیں۔یہ مثنوی عہد سلطان محمد قطب شاہ کے آخری زمانے1035ھ م1626ء کی تصنیف ہے جسے غواصیؔ نے صرف ایک ماہ کے عرصے میں مکمل کیا تھا۔

مثنوی طوطی نامہ1049ء کی تصنیف ہے جس کا قصہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکا سب تتی'' (طوطے کی کہی ہوئی 70کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔شکا سب تتی کو مولانا ضیاء الدین نخشبی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔انہوں نے ستر کہانیوں میں سے 52 کہانیوں‌کا انتخاب کیا۔غواصیؔ کے طوطی نامہ کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہی ہے۔غواصیؔ نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں سے صرف 45 کہانیوں‌کو اپنی مثنوی کے لیے منتخب کیا۔''طوطی نامہ'' کا قصہ اگر چہ کہ غواصیؔ کا

طبع زاد نہیں ہے ،لیکن قصہ کی جزئیات ' انسانی نفسیات کی مرقع کشی اور مناظر فطرت کے بیان میں غواصیؔ نے اپنے شاعرانہ کمال کا اس طرح مظاہرہ کیا ہے کہ یہ تصنیف غواصیؔ کی طبع زاد مثنوی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔کلام سے اقتباسات پیش ہیں۔مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال:

کیا شعر تازہ بڑے چھند سوں   ہر اک بند بسلائیا بند سوں
جو لفظاں ملایا رنگیلی نچھل   پرویا جواہر کی چھیلی نچھل
خیالوں کے فوجاں کو دوڑائیا   ہزاراں نئے تشبہاں لائیا
بنایا نوے مضموناں ہور بھی   دیا طبع کو زور پر زور بھی

مثنوی طوطی نامہ:

سنیا ہوں جو تھا کوئی اِک لشکری   اسے ایک عورت تھی جیوں شہ پری
مکھ اس نار کا چودواں چاند تھا   دل او لشکری اس نے اسوں لئی باند تھا
ادک گن میں بے مثل ناری تھی او   وفادار ہور ست میں ساری تھی او
ولے او سپاہی زمانے پو جا   اچھے اس کی رک دیک میں جابجا
دیوانہ ہو گھر میں تے نکلے نہ بھار   گذرنے لگی مفلسی بے شمار

قصیدہ:

دو کون کا جو ہے خالق خدائے عزو جل   کیوں اس کے ناؤں ہر دم نہ جاوں میں بل بل
کہ لا مکان و قلم اوجِ عرش ہور کرسی   فلک ستارے چندر سو ر برق ہو ر بدل
تمام اس کی خدائی اپر گوہی دیں   کہ بغیر نئیں دُسرا کئی آخر و اول

غزل:

عاشق کوں اس ہوا میں مد رنگ لال ہونا   معشوق خوب عالی صاحب جمال ہونا
منج نین کے چمن میں لئی نازکی سوں ڈُلنے   نازاں کے پھول کی وہ نازوک ڈال ہونا

11.2.7 ابن نشاطی:

قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ایک نام ابن نشاطیؔ کا بھی ہے، جس کی مثنوی "پھول بن" دکنی اردو کی منتخب مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی تھا۔اس کے مفصل حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔پھول بن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اچھی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔مثنوی میں بعض ایسے اشارے موجود ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کو فن بلاغت اور علم معانی و بدیع سے خاص شغف تھااور فارسی پر عبور رکھتا

تھا۔وہ بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھا،لیکن اس کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا۔مثنوی ''پھول بن''سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں 1066ھ میں صرف تین ماہ میں لکھی گئی۔اس مثنوی کی زبان سلیس و سادہ ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے شاعر کی قادر الکلامی اور کمال فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔مثنوی فارسی تصنیف ''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے، لیکن ابن نشاطیؔ نے اصل قصے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے کئی ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک ایسے شعر سے کیا ہے ،جس میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔اگر تمام ابواب کے عنوانی اشعار کو یکجا کردیں تو پوری مثنوی کا لب لباب سامنے آجاتا ہے۔''پھول بن'' میں جملہ 1744اشعار ہیں۔ابن نشاطیؔ کہتا ہے کہ اس نے'' پھول بن ''میں انتالیس صنائع 'چھیاسٹھ موقعوں پر استعمال کیے ہیں اور اپنی قادرالکلامی اور استادانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔مثنوی میں ابن نشاطیؔ نے جذبات نگاری' کردار نگاری اور منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

''پھول بن '' اپنی روانی و بے ساختگی ' زبان و بیان کی صفائی'طرز ادا کی دل کشی اور فنی رچاؤ کے اعتبار سے دکنی ادب کا ایک قابل قدرکارنامہ ہے۔''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' میں گوپی چند نارنگ نے ابن نشاطیؔ کی'' پھول بن ''کے ادبی محاسن کو بہت سراہا ہے اور ابن نشاطیؔ کو ایک ''شعلہ بیان شاعر'' اور''الفاظ کا ساحر''قرار دیا ہے۔گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ ''پھول بن''میں مکالموں کی برجستگی' زور طبیعت' شاعرانہ لطافت' انداز بیان کی خوبیاں اور زبان و بیان کا لوچ دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔''مثنوی سے اقتباس پیش ہے۔

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا | نہ تھا پروا اسے کچھ مال و دھن کا
بڑا تھا بھوت سب سوداگراں میں | اتھا مشہور سالم بندراں میں
ہو کر مشہور تھا سوداگری سوں | کتے تھے کارواں سالار اس کوں

پڑے تھے اس کنے مہراں کے انبار | ڈھگاراں سوں تھے روپیے ہور دینار
اتھی اس ٹھار پر زاہد کوں بیٹی | فرشتہ خوی تس عابد کوں بیٹی
چتر چنچل سرک کنتل سہانی | نہ اس کوں کوئی تھا صورت میں ثانی
بھنواں کے کیوں کہوں محراب تھے کر | وہ کاں ہے نور محراباں کے اوپر
چندر آدھا کہوں میں کیوں پشانی | چندر آدھا نہیں ویسا نورانی
نین کوں نرگساں کہتا ہے نا ساز | چمن کے نرگساں میں کاں ہے وہ ناز
کہوں رخسار کوں کیوں اس کے لالا | ہر یک لالے کے درمیانی ہے کالا
میں سرتے پاؤں لگ اس موہنی کا | کہ تھا تیوں کیا صفت کرنے سکوں گا

قطب شاہی عہد کے دیگر شاعروں میں احمد گجراتی' عبداللہ قطب شاہ ' فائز ' طبعی اور جنیدی کے نام بھی اہمیت رکھتے ہیں۔احمد گجراتی نے اپنی دو مثنویاں یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔اسی طرح فائز کی رضوان شاہ و روح افزا' طبعی کی بہرام و گل اندام قطب شاہی دورآخر کی منتخب اور نمائندہ مثنویاں ہیں۔

11.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھاجس نے 1518میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔اس کے بعد مزید سات سلاطین نے سر زمین گولکنڈہ پر 169سال تک حکو مت کی۔
- قطب شاہی سلاطین نہ صرف علم دوست اور شعرا اور ادبا کے سر پرست و قدر دان تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شعر کہتے تھے خصوصاً محمد قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ دکنی اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔
- محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔
- محمد قلی کے علاوہ اس دور کے دوسرے عظیم شعرا میں اسداللہ وجہیؔ غواصیؔ جنیدیؔ اور ابن نشاطیؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔
- وجہی نے قطب مشتری اورمینا ستونتی جیسی لا زوال مثنویاں لکھیں۔
- وجہی اس دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کا نثر نگار بھی تھا۔اس کی تصنیف"سب رس" اردو نثر کی تاریخ میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔
- غواصی کی مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ' جنیدی کی ماہ پیکر اور ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن اس دورکی اہم مثنویاں ہیں۔
- بہ حیثیت مجموعی قطب شاہی دور کو مثنویوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔مثنوی کے بعد اس دور میں غزل کی صنف کو فروغ ہواساتھ ساتھ مرثیہ' قصیدہ اور رباعی پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔

11.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مستحکم	:	مضبوط
خود مختاری	:	بااختیار ہونا ' آزادی
حرفہ	:	پیشہ ' ہنر'کاری گری
عہدزریں	:	سنہرا دور

رقیب	:	دشمن
ہجراں	:	جدائی
مجاز	:	حقیقت کے بر عکس
طبع زاد	:	اپنی ایجاد
اسرار و رموز	:	پوشیدہ راز
مفلوک الحالی	:	تباہ حالی ، خستہ حالی
جزئیات	:	جزو کی جمع ، حصے ، چھوٹے چھوٹے امور
مرقع کشی	:	تصویر کشی
لب لباب	:	خلاصہ ، نچوڑ
ادبی محاسن	:	ادبی خوبیاں

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a) عبداللہ قلی (b)جمشید قلی (c)ابراہیم قلی (d) سلطان محمد قلی

2۔ وجہیؔ نے کتنے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟

(a) تین (b)پانچ (c)سات (d)آٹھ

3۔ ’’سب رس‘‘ کب لکھی گئی؟

(a)1630 (b)1635 (c)1640 (d)1645

4۔ مینا ستونتی کس کی مثنوی ہے؟

(a) نصرتی (b)ابن نشاطی (c)غواصی (d)وجہی

5۔ ’’ماہ پیکر‘‘ کس کی تصنیف ہے؟

(a) جنیدی (b)عبداللہ قطب شاہ (c)ابن نشاطی (d)غواصی

6۔ ملا وجہیؔ نے ’’سب رس‘‘ کس کی فرمائش پر لکھی؟

(a) عبداللہ قطب شاہ (b) جمشید قلی (c) ابراہیم قلی (d) سلطان محمد قلی

7۔ ’’قطب مشتری‘‘ کس کی تصنیف ہے؟

(a) جنیدی (b)ولی دکنی (c) ملاوجہی (d)محمد قلی قطب شاہ

8۔ ”پھول بن“ کس کی مثنوی ہے؟

(a) ابن نشاطی (b)ملا وجہی (c)نصرتی (d)حسن شوقی

9۔ غواصیؔ کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

(a) سیف الملوک وبدیع الجمال (b)طوطی نامہ (c)میناستونتی (d)ان میں سے کوئی نہیں

10۔ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران کا کیا نام تھا؟

(a)سلطان قلی قطب شاہ (b)محمد قلی قطب شاہ (c)عبداللہ قلی قطب شاہ (d)ابراہیم قلی قطب شاہ

11.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ قطب شاہی دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیجیے۔

2۔ محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ جنیدی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

4۔ ابن نشاطیؔ کے بارے آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔

5۔ کسی دو پر نوٹ لکھیے۔

I۔سب رس II۔سیف الملوک و بدیع الجمال III۔مینا ستونتی IV۔پھول بن

11.5.3 طویل جوابات کے حامل سولات:

1۔ قطب شاہی دور کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2۔ غواصی کے ادبی کارنامے بیان کیجیے۔

3۔ وجہی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

11.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ دکنی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر محی الدین قادری زور

2۔ تاریخ ادب اردو1700ء تک (جلدسوم، چہارم) — پروفیسر سیدہ جعفرو پروفیسر گیان چند جین

3۔ دکنی نثر کا انتخاب — پروفیسر سیدہ جعفر

4۔ دبستان گولکنڈہ، ادب اور کلچر — پروفیسر محمد علی اثر

5۔ اردو کی اہم مثنویاں — ڈاکٹر احمد علی شکیل

11.5.1کے جوابات: d۔1 a۔2 b۔3 c۔4 a۔5

a۔6 c۔7 a۔8 c۔9 b۔10

اکائی :12 ولی اور سراج کا عہد

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 ولی اور ان کے اور نگ آبادی معاصرین
12.2.1 ولی کے دیگر دکنی معاصرین
12.2.2 ولی کے گجراتی معاصرین
12.3 اکتسابی نتائج
12.4 کلیدی الفاظ
12.5 نمونۂ امتحانی سوالات
12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے بہمنی ' عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکنی شعرو ادب کے فروغ کا مطالعہ کیا۔اس اکائی میں ہم ان سلطنتوں کے زوال کے بعد دکنی شاعری کی صورت حال کا جائزہ لیں گے۔

اورنگ زیب نے 1685ء میں بیجاپور اور 1686 ء میں گولکنڈہ فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ بیجا پور اور گولکنڈہ کے شاہی درباروں میں دکنی شعرا کی بڑی قدرو منزلت تھی،لیکن ان سلطنتوں کے زوال کی وجہ سے ان کی قدر دانی بھی کم ہوگئی۔

اور نگ زیب نے 1062میں اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا تھا جس کی وجہ سے اس شہر کی رونق بڑھنے لگی۔ مغلیہ سلطنت کا مستقر ہونے کی وجہ سے یہ شہر شمالی ہند کے علما و فضلا کا مرکز بن گیا۔وہاں شعر و شاعری کا چرچا بڑھنے

لگا۔اورنگ زیب کی وفات 1706 ء کے وقت تقریباً پورا دکن مغلیہ سلطنت میں شامل تھا۔دکن کے مختلف حصوں میں مغل شہنشاہ کے مقرر کیے ہوئے صوبیدار صوبے کا نظم و نسق چلاتے تھے۔اورنگ زیب کے جانشینوں کی نا اہلی اور عیش پرستی کی وجہ سے ملک کا نظم و نسق بگڑ گیا اور سلطنت کے مختلف صوبے آزاد اور خود مختار ہونے لگے۔اس انتشار اور بد نظمی کے پیش نظر نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے 1136 ھ / 1723 ء میں دکن میں آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کے خاتمے سے لے کر دکن میں آصف جاہی سلطنت کے قیام کا درمیانی عہد دکنی ادب کا مغل دور کہلاتا ہے۔اس دور کا سب سے بڑاشاعرولیؔ اورنگ آبادی ہے۔

آصف جاہ اول سے لے کر آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے ابتدائی دور تک اورنگ آباد مملکت آصفیہ کا پایہ تخت رہا۔نواب میر نظام علی خاں نے 1768 ء میں اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا۔یہ دور دکنی زبان و ادب کا آصف جاہی دور ہے۔اس دور کے سب سے بڑے اور نمایاں اُردو شاعر سراج اورنگ آبادی ہیں۔دکن کا مغل دور اور ابتدائی آصف جاہی دور ایک طرح سے ولی اور سراج کا دور ہے۔اس دور میں دکن اور گجرات میں متعدد شعرا بالترتیب دکنی اُردو اور گجری اُردو میں داد سخن دے رہے تھے۔آئندہ اوراق میں ہم ان میں سے چند اہم شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ولی اور سراج کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- ولی و سراج کے اورنگ آبادی معاصرین اور ان کی تصانیف پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ولی و سراج کے دیگر دکنی معاصرین اور ان کی شعری خدمات کی تحسین کر سکیں۔
- ولی و سراج کے گجراتی معاصرین اور ان کی ادبی خدمات پر بحث کر سکیں۔

12.2 ولی اور ان کے اورنگ آبادی معاصرین

ولی اورنگ آبادی : ولی اورنگ آبادی کو اردو شاعری میں صنف غزل کے معمار کی حیثیت حاصل ہے ،لیکن ان کے حالات زندگی کی تفصیلات کا پتہ نہیں‌چلتا۔تذکرہ شعرائے دکن کے مصنف عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے ولی کا سال ولادت 1079 ھ متعین کیا تھا جسے عام طور پر قبول کر لیا گیا۔ان کا نام ولی محمد تھا۔ولی کے وطن کے بارے میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر زور ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ مانتے ہیں جبکہ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی اور قاضی اختر جو ناگڈھی ولی کو گجراتی الاصل قرار دیتے ہیں۔اس اختلافی بحث میں درج ذیل نکات قابل غور ہیں۔

گجراتی شعرا مثلاً امین گجراتی (مصنف مثنوی یوسف زلیخا)اور افضل (مصنف مثنوی شمس و قمر)وغیرہ اپنی زبان کو

صاف طور پر ''گوجری'' کہتے ہیں جبکہ ولی نے اپنی زبان کو دکنی کہا ہے۔

دکھنی زباں میں شعر سب لو گاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولا کو ئی یک شعر خوشتر ایں نمط

ولی کے ہاں دکنی زبان کے مخصوص ''چ'' تاکیدی اور ''نکّو''کا استعمال ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گجراتی نہیں تھے۔

پتیارا نئیں ترے کہنے کا جب حیران کرنا کی
جو من میں تئیں چ ملنے کا تو پھر تکرار کرنا کی

عالم کوں تیغ ناز سوں بے جاں نکوکرو
غمزے سوں اپنے غارت ایماں نکو کرو

اپنی زباں کو دکنی کہنے کے علاوہ ولی نے خود اپنے آپ کو بھی دکن کا باشندہ ظاہر کیا ہے اس کے بعد بھی انھیں گجراتی کہنا تحقیقی اندھیرہے۔

ولیؔ ایران و توراں میں ہے مشہور اگر چہ شاعر ملک دکن ہے
یہ مکھ کی شمع سو ں روشن ہے ہفت اقلیم کی محفل ولی پر وانگی کرتا تری ملک دکھن بھیتر

ولیؔ کی کلیات میں ایک قطعہ '' در فراق گجرات '' اور شہر سورت کی تعریف میں ایک مثنوی پائی جاتی ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ گجرات کے باشند ے تھے۔غالب نے بھی کلکتے کی تعریف میںایک قطعہ لکھا ہے، لیکن اس سے وہ بنگالی نہیں ہو جاتے۔

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ولی نے بیس بر س کی عمر میں حصول علم کی خاطر خاندان اور وطن کو خیر باد کہا اور احمد آباد پہنچے۔یہاں وہ شاہ وجیہ الدین علوی کے قائم کردہ مدرسے میں داخل ہوئے۔ولی کو سفر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔

وہ حج بیت اللہ اور روضتہ النبیؐ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ولی کا سال وفات بھی متنازعہ ہے۔دیوان ولی کے ایک قلمی نسخے میں درج قطعہ تاریخ کی بنیاد پر مولوی عبدالحق نے ولی کا سال وفات 1119ھ میں متعین کیا۔(مجلہ الموسی، یاد گار ولیؔ ص 63) لیکن ڈاکٹر جمیل کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ولیؔ نے 1133 ھ کے بعد اور 1138ھ سے قبل وفات پائی۔(جمیل جالبی تاریخ ادب اردو' جلد اول 535-538)

ولی ایک خوش فکر شیریں گفتار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی کلیات میں غزلیات کے علاوہ مخمسات' رباعیات' مستزاد ' ترجیع بند' مرثیہ' قصائد ' مثنویات اور قطعہ شامل ہے۔ولیؔ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔انھوں نے دکنی غزل کی

روایات کی پابندی کرتے ہوئے غزل کی روایت میں توسیع کی۔ولیؔ کی غزل وار دات قلب ' تجربات اور مشاہدات کی ترجمان ہے۔طبعاً وہ جمال پرست واقع ہوئے تھے۔انھوں نے حسن کی مختلف کیفیتوں اور مختلف اداؤں کو دیکھا اور محسوس کیا اور اپنی غزل میں ان کی عکاسی کی۔ن کی غزل محبوب کے حسن و جمال ' نازوانداز اور دلر بائی کا آئینہ اور ان کا فن حسن کے بیان کا وسیلہ ہے۔

ترا مکھ حسن کا دریا و مو جاں چین پیشانی اُپر ابرو کی کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دستا
پڑیا ہے لعل میں پر تو سجن تجھ مکھ کی لالی کا بیاں ہے مہ سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا
دیکھ تیرے سو یو کھبا لے بال رشک سوں جل گئے ہیں کالے بال

ولیؔ کی شاعری کا دوسرا امتیازی پہلو ان کا ہندوستانی تخیل ہے، جس نے ان کے شعری افکار میں ایک عجیب مٹھاس اور دلکشی پیدا کی ہے۔ان کی غزل کی فضامیں ہندوستانی دھرتی کی مہک اور مقامی تہذیب و تمدن کی رنگینی بسی ہوئی ہے۔

کوچۂ یار عین کا سی ہے جوگی دل وہاں کا باسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال ہندوئے ہر دوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی تل نزِک اس کے جیوں سناسی ہے

ولیؔ نے دکنی شاعری کے جن صحت مند رجحانات کو اپنی شاعری میں بر قرار رکھا ان میں محبوب کا واضح تصور بھی ہے ان کا محبو ب کوئی فرضی یا خیالی مخلوق نہیں بلکہ وہ مادی وجود رکھتا ہے اور پوری نسوانیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں محبو ب کا ذکر صیغہ تا نیث میں کیا ہے۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھا تی جا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف اے مان بھری چنچل ٹک بھا ئو بتاتی جا
اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں ٹک پائوں کے جھا نجھر کی جھنکا ر سناتی جا

ولیؔ ایک عہد ساز شاعر تھے۔ان کا سب سے بڑا کا ر نامہ یہ ہے کہ انہوں‌نے دکنی ادب کی تین سو سالہ روایت کو جس کے سوتے خشک ہورہے تھے' ایک طرف تو شمالی ہند کی معیاری بولی ریختہ سے ہم کنار کیا اور دوسری طرف اپنی جدت طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارسی غزل کے موضوعات و مضامین اور فارسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے بے دریغ استفادہ کیا۔اس طرح انہوں نے اُردو غزل میں نئے امکانات پیدا کیے۔

ولیؔ نے 1112ھ (1700ء)میں دہلی کا سفر کیا۔اس وقت شمالی ہند کے شعرا صرف فارسی میں داد سخن دیتے تھے۔ اردو کو وہ بازاری زبان سمجھتے تھے۔ولیؔ نے دہلی میں اُردو غزل کی شمع روشن کی۔ان کے اثر سے شمالی ہند کے شعرا نے اردو میں غزل گوئی کا سلسلہ شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو غزل سارے شمالی ہند میں مقبول ہوگئی۔

سراج اورنگ آبادی : ان کا اصل نام سید سراج الدین اور تخلص سراج تھا۔ان کے والد کا نام سید درویش تھا۔ سراج 1128 ھ کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔(بحوالہ پروفیسر سید عبدالقادر سروری' کلیات سراج ' مقدمہ ص 40-39) بارہ سال کی عمر تک سراج کی تعلیم و تر بیت ان کے بزرگوں کی نگرانی میں ہوئی۔بارہ سال کی عمر میں ان کی طبیعت پر دیوانگی کا عالم طاری ہوا۔وہ سات بر س تک جذ ب اور بے خودی کی حالت میں رہے ۔ سات سال کے بعد ان کو افاقہ ہوا۔صحتیابی کے بعد سراج نے شاہ عبدالرحمن چشتی (1161ھ) سے بیعت کی۔

سراج اپنے عزیز دوست اور براد ر طریقت شاہ عبدالرسول چشتی کی فرمائش پر اردو میں شعر کہنے لگے۔شاہ عبدالرسول ان کے کلام کے شائق تھے۔انھوں نے ان کی غزلیات اور متفرق اشعار کو جمع کرکے دیوان کی شکل دی۔دیوان کی تکمیل کے بعد سراج نے اپنے مرشد شاہ عبدالرحمن چشتی کے حکم پر غزل گوئی تر ک کی لیکن مثنویات لکھتے رہے۔ولیؔ کے بعد سراج دکن میں مغلیہ دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔1117ھ میں جب سراج کی عمر پچاس سال تھی 'ان کا انتقال ہوا۔سراج کی تصانیف میں فارسی کلام ، کلیات اردو 'منتخب دیوا نہا اور مثنوی بوستان خیال شامل ہیں۔

سراج عشق کے شاعر ہیں۔عشق ان کے فن اور تخلیق کا سر چشمۂ فکر کا مرکزی نقطہ اور زندگی کا دائرہ ہے۔وہ سر تا پا رہینِ عشق تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہستی'عشق و محبت کے سوا کچھ اور نہیں۔جس دل میں عشق کی روشنی جاگتی ہے اس پر کائنات کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

سراج کی شاعری کا دوسرا اہم مو ضوع تصوف ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا مخصوص صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ان کے اشعار صوفیانہ تجربات کی ترجمانی ' نغمگی و تر نم اور وجد آفریں کیف و سرور کا بہترین نمونہ ہیں:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہانہ پری رہی　　نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سوبے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس بر ہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

سراج نے چھوٹی بڑی کل گیارہ مثنویاں لکھیں۔ان میں "بوستان خیال" نہایت اہم ہے۔سراج نے یہ مثنوی 1160 ہجری میں لکھی۔"بوستان خیال " اس کا تاریخی نام ہے جو اس مثنوی کے سنہ تصنیف اور تعداد اشعا ر (1160) کو ظاہر کرتا ہے۔انہوں نے یہ مثنوی صرف دو دن میں لکھی۔سادگی 'سلاست' روانی اور ربط کلام کے اعتبار سے بوستان خیال اُردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔

داؤد اورنگ آبادی: داؤد اورنگ آبادی ایک صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے اہم ہیں۔ان کا اصل نام مرزا داؤد بیگ تھا۔ان کے والد کانام مرزا سلیمان تھا۔دائود کی ولادت اورنگ آباد میں ہوئی۔انھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا لیکن انھوں نے علما وفضلا کی صحبتوں میں رہ کر لیا قت پیدا کی۔

داؤد کا انتقال 1168ھ میں ہوا۔ دائود غزل گو شاعر تھے۔ انہوں نے ولیؔ کا اثر قبول کیا۔ ولیؔ کو وہ اپنا معنوی استاد اور اپنے آپ کو ولیؔ کا جانشین سمجھتے تھے۔

ولیؔ کے تتبع میں دائود نے بھی محبوب کے حسن کی رعنائیوں کو اپنی غزل کامرکزی موضوع بنایا۔ ان کی غزل محبوب کے حسن و جمال کی تفسیر ہے۔ معشوق کے لب و رخسار کا تذکرہ اگر چہ روایتی ہے لیکن حسن کی مختلف کیفیات کو محسوس کرنے اور انھیں الفاظ کی گرفت میں لانے کا انداز دائود کا اپنا ہے۔

جس نے وہ گلبدن نہیں دیکھا　　اس نے سیر چمن نہیں دیکھا
غنچہ کیا پاوے تری گفتار کوں　　سرو کیا پہنچے تری رفتار کوں
جب وہ مہ رخسار یکا یک نظر آیا　　اس ماہ کی طلعت سوں سُرج دل میں درآیا
دیکھ داؤد ہے غزل تیری　　مصحف حسنِ یار کی تفسیر

عاجز اورنگ آبادی: اصل نام عارف الدین خاں اور عاجز تخلص تھا۔ عاجز اصلاً ایرانی تھے۔ ان کے والد اورنگ زیب کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے۔ عاجز ابھی کم عمر ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ نواب لشکر خاں بہادر نصرت جنگ صوبہ دار اورنگ آباد کی سرپرستی میں عاجز نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور انھیں کی سفارش پر آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کے دربار میں باریاب ہوئے اور خطاب و منصب سے سرفراز کیے گئے۔ 1178ء میں ناندیڑ (مہاراشٹرا) میں عاجز کا انتقال ہوا وہیں آسودہ خاک ہوئے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں ایک ایک دیوان مرتب کیا تھا۔

عاجز کی شاعری کا امتیازی وصف سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی اور ضائع و بدائع کا استعمال ہے۔ انہوں نے مشکل قافیہ وردیف اور مشکل بحروں میں غزلیں لکھ کر اپنی جو لانی اور مشاقی کا مظاہر کیا ہے۔ ان کے اشعار میں خیال کی تازگی ' تشبیہات کی ندرت اور شگفتہ بیانی کا احساس ہوتا ہے۔

خیال اس شوخ کا کب مجھ دل بے تاب میں ٹھیرے　　کہاں بجلی کا سایہ چشمہ سیماب میں ٹھیرے
بلبلو آج ہے صیاد کے آنے کی خبر　　ہم میں نئیں طاقت پرواز خدا خیر کرے
چمن میں چل کے سجن بے حساب ساغر کھینچ　　بہار رنگ گلستاں کے سر سے چادر کھینچ

دیوان غزلیات کے علاوہ عاجز سے ایک مثنوی لال و گوہر بھی یاگار ہے۔ درحقیقت اس مثنوی کو ان کے دیوان سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مثنوی لال و گوہر پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں عاجز نے بنگالے کے شہزادے لال اور پریوں کی شہزادی گوہر کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔

شاہ قاسم اورنگ آبادی: ولیؔ کے خورد ہم عصروں میں شاہ قاسم ایک اہم صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کا اصل نام شاہ قاسم علی تھا' قاسم تخلص کرتے تھے۔ عاجز اورنگ آبادی کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔

شاہ قاسم کا سنہ ولادت اور سنہ وفات نامعلوم ہے۔ان کے والد کانام شیخ عبداللہ انصاری تھا۔وہ ایک درویش طبع انسان تھے۔شاہ قاسم برہان پور میں پیدا ہوئے لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد اورنگ آباد آگئے اور یہیں انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔

شاہ قاسم کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جنوب کے مختلف شہروں کی سیر کی تھی۔وہ حیدرآباد بھی آئے تھے۔شاہ قاسم ایک حسن پرست' عاشق مزاج اور رند مشرب انسان تھے۔انھوں نے ایک قلندر کی طرح زندگی گزاری۔

ہم قلندر و ضع بے پروا فقیر رند مشرب عاشق بے باک ہیں

شاہ قاسم کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔وہ اس فن میں کسی کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتے تھے۔

رہے گا تا قیامت شاہ قاسم ترا یہ گرم بازار سخن سبز
شاہ قاسم دکن سیں تا دلی کون دیوے ترا جواب سخن

سید شاہ غلام قادر سامیؔ : سامیؔ ولی کے کم عمر معاصرین میں سے تھے۔سامی کے والد نظام الملک آصف جاہ اول کے مصاحب تھے۔سامی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔سامی کو تحصیل علم کا شوق تھا۔وہ علما کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے۔

سامیؔ کو نو جوانی کی عمر سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔تھوڑے دنوں کی مشق سے قادر الکلام شاعر بن گئے۔ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔سامیؔ نے1196 ھ میں وفات پائی۔اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔سامیؔ صاحب دیوان شاعر تھے لیکن دیوان اب نہیں ملتا۔انھوں نے 1175ھ میںایک مثنوی" سرو وشمشاد لکھی۔اس میں سرو اور شمشاد کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ڈاکٹر زور لکھتے ہیں

" اگرچہ سامی کی زبان گو لکنڈہ و بیجا پور کے مثنوی نگاروں کے مقابلے میں صاف ہے'
تا ہم دکنی زبان کا اثر جگہ جگہ نمایاں ہے۔حالانکہ سامیؔ کے دادا دہلی سے آئے تھے
لیکن وہ اور نگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں کا روز مرہ سیکھا۔"

(ڈاکٹر زور' تذکرہ مخطوطات ' جلد اول ص 73)

سید عبدالولی عزلتؔ : عزلتؔ اٹھا رویں صدی کے ممتاز شاعر تھے۔ وہ 1104ھ میں پیداہوئے۔ان کے والد شاہ سعداللہ جید عالم تھے۔عزلت نے معقول اور منقول کی تعلیم انھیں سے حاصل کی۔عزلت کو سیاحت کا شوق تھا۔انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کی جن میں دہلی' اورنگ آباد ' حیدرآباد اور مرشد آباد (بنگال) شامل ہیں۔آخر عمر میں و ہ حیدرآباد آئے جہاں نواب صلابت جنگ نے ان کی بڑی آئو بھگت کی۔1189ھ میں عزلت کا انتقال ہوا۔دائرہ میر مومن (حیدرآباد) میں پیوند خاک ہوئے۔

عزلت جامع الکما لات واقع ہوئے تھے۔انھیں کئی علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی۔ان کی تصانیف میں دیوان فارسی' دیوان اُردو' مثنوی راگ مالا' ساقی نامہ' بارہ ماسی اور بیاض شعرا شامل ہیں۔تذکرہ شعرائے دکن کے مصنف عبدالجبار خاں صوفی ملکا پوری لکھتے ہیں کہ امیر خسرو طوطیِ ہند تھے تو عزلت کو طوطیِ دکن کہنا چاہیے۔(ملکا پوری' تذکرہ شعرا ئے دکن جلد دوم ص 812) عزلت کی غزلیہ شاعری کا نمونہ درج ذیل ہے۔

گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنے سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے

اندھیری رات میں کس کو کوئی پہنچانتا ہے گا سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں

برنگ شمع میری استخواں سے چشم تر نکلیں مرے مر قد پہ ہو کر شعلہ رویاں سیم بر نکلیں

مثنوی'' راگ مالا'' عزلتؔ کی شاہکار مثنوی ہے۔اس میں انھوں نے ہندوستانی راگوں اور اس کی ذیلی قسموں کی وضاحت کی ہے۔یہ 1176 اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا سنہ تصنیف 1179ھ ہے۔ساقی نامہ بھی عزلت کی ایک اہم تصنیف ہے۔

12.2.1 ولی کے دیگر دکنی معاصرین:

شاہ معظم : شاہ معظم ولی کے بزرگ معاصر تھے۔وہ بیجا پور کے باشندے تھے۔ان کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ان کے کلام کی داخلی شہادتوں سے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عادل شاہی خاندان کے آخری حکمراں سکندر عادل شاہ (1067ھ تا 1083 ھ) کا عہد دیکھا اور شہنشاہ اورنگ زیب کا بھی۔

شاہ معظم کا پورا نام محمد حسینی قادری تھا۔ وہ چشتیہ سلسلے میں شاہ قادر لنگا کوتال کے مرید تھے۔ معظم ایک کثیر التصانیف شاعر تھے۔ان کی تصانیف میں غزلیات کا ایک دیوان مثنوی مفتاح الاسرار' مثنوی شجرۃ الاتقیا' مثنوی گلزار چشت' معراج نامہ' ساقی نامہ' قصیدہ گفتار عقل و عشق وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ معظم نے دکنی نثر میں ایک مختصر نثری رسالہ'' شرح شکار نامہ'' بھی لکھا تھا جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فارسی شکار نامہ کی شرح ہے۔معظم کی غزلیات' صوفیانہ خیالات اور عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔انھوں نے اپنی ہر غزل میں اپنے پیرو مرشد قادر لنگا کو تال کا ذکر والہانہ انداز میں کیا ہے۔

معظم کو وِرد کرنے سو قادر نام خوش لگتا بزرگی اسم اعظم کی لکھا قرآن میں لیکن

یوں کوئی گر کرے تو اس کو کتے فقیر قادر اُپر معظم کرتا ہے سر تصدق

قاضی محمودبحری : شاہ معظم کی طرح بحری بھی ولیؔ کے بزرگ معاصر تھے۔ان کانام سید محمود اور تخلص بحری تھا۔ بحری گوگی کے باشندے تھے جو سگر یا نصرت آباد(علاقہ کرناٹک) کے مضافات میں واقع ہے۔ان کے والد بحرالدین گوگی کے قاضی تھے۔

قاضی محمود بحری شیخ محمد باقر عرف منجن بحری کے مرید تھے۔اس کے علاوہ انھیں اپنے والد سے بھی بیعت و خلافت حاصل تھی۔1095ھ میں بحری گوگی سے بیجاپور گئے جہاں سکندر عادل شاہ (1083ھ تا 1097ھ) نے ان کی بڑی قدرو منزلت کی۔اورنگ زیب نے بیجاپور فتح کر لیا تو بحری نے حیدرآباد کا رخ کیا۔اس سفر کے دوران ڈاکوئوں نے ان کا سارا مال وا سباب لوٹ لیا جس میں ان کا کلام بھی شامل تھا جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔حیدرآباد میں بحری نے دو سال گزارے تھے کہ مغل فوجیں یہاں بھی حملہ آور ہوئیں۔1100 ھ میں بحری اپنے پیرو مرشد کے آستانے میں گوشہ گیر ہوگئے۔1130 ھ 1717 ء میں ان کا انتقال ہوا۔مزار گوگی(کرناٹک) میں واقع ہے۔

دکنی میں بحری کی تین اہم تصانیف ہیں: (1) مثنوی من لگن (2) بنگاب نامہ (3) دیوان غزلیات۔مثنوی من لگن ایک صوفیانہ مثنوی ہے بحری نے یہ مثنوی 1112ء میں تصنیف کی۔اس کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو سے زائد ہے۔اس میں سلوک و معرفت کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔مثنوی کی زبان نہایت ادق ہے کیونکہ اس میں سنسکرت الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔

"بنگاب نامہ" بھی بحری کی معرکتہ الا ٓراتصنیف ہے۔بنگاب نامہ میں بارہ بند ہیں جنھیں "جام" کا عنوان دیا گیا ہے۔ہر جام میں بارہ اشعار ہیں۔

بحری کا دیوان ایک سو تیرہ غزلیات پر مشتمل ہے۔غزلیات میں وہ ایک رند اور عاشق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔غزلیات کا زیادہ تر حصہ عشق مجازی کی ترجمانی کرتاہے۔بحری کو دکن سے بہت محبت تھی۔انھوں نے اپنی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات کی ترسیل بڑے خوب صورت انداز میں کی ہے۔

اب دل پہ یہی ہے جو دکن چھوڑ نہ جانا　　جُوتے یو دکھن ، کھن کے رتن چھوڑ نہ جانا
بحری کو دکن یوں ہے کہ جو ں نل کو دمن ہے　　پس نل کو ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

سید شاہ حسین ذوقی: ان کا اصل نام سید شاہ حسین ، تخلص ذوقی اور خطاب" بحرالعرفان" تھا جو ان کے مرشد نے عطا کیا تھا۔ذوقی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ان کی پانچ مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔وصال العاشقین ، غوث نامہ ، وفات نامہ رسول اور نزہت العاشقین۔ان کے متعدد مرثیے اور غزلیں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ان کی ایک اور تصنیف "صدوسی مسائل" کا ذکر بھی ملتا ہے۔

وصال العاشقین ذوقی کی سب سے اہم مثنوی ہے۔اس کا دوسرا نام حسن و دل ہے۔اس میں ذوقی نے وہی داستان نظم کی ہے جسے وجہی نے سب رس کے نام سے دکنی نثر میں لکھا تھا۔اس کا سنہ تصنیف 1109ھ ہے۔ذوقی کی ایک اور مثنوی "غوث نامہ" بھی 1109ھ کی تصنیف ہے۔اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں۔ذوقی کی ایک اور مثنوی نزہت العاشقین ہے جس کا دوسرا نام منصور نامہ ہے۔اس میں منصور بن حلاج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

سید محمد فراقی بیجا پوری: ان کا اصل نام سید محمد اور فراقی تخلص تھا۔ان کے والد کا نام سید کریم محمد حسینی تھا۔فراقی 1097ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوئے۔فراقی حافظ قرآن ہونے کے ساتھ معقول و منقول کے عالم، مفسر اور محدث تھے۔انہوں نے 1144ھ میں وفات پائی۔تصانیف میں ایک ضخیم مثنوی مراۃ الحشر کے علاوہ غزلیات اور نعتیں بھی ان سے یادگار ہیں۔مثنوی مراۃ الحشر تین ہزار پچپن اشعار پر مشتمل ہے۔فراقی نے یہ مثنوی 1133ھ میں تصنیف کی۔اس میں حمد و نعت کے بعد عالم نزاع، احوال قبر، علامات قیامت، دابتہ الارض کے ظہور، یاجوج و ماجوج اور دجال کے خروج، حضرت عیسیٰ کے نزول، حشر و نشر، میزان، پل صراط و غیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

فراقی نے غزلیں بھی لکھیں، ان کی غزلوں میں عاشقانہ اور ناصحانہ دونوں رنگ صاف نظر آتے ہیں۔

لذت جو کوئی پایا اہے تجھ عشق کی تلوار کا　　یک وار بیٹھے نیچ لگ مشتاق دسرے وار کا دل

گال ہے خال ہے الک ہے پلک　　بچارہ کدھر کدھر ہونا

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم　　کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھا تا آستیں آئے

فراقی نے ولی اور فقیر اللہ آزاد کے ساتھ سورت، احمد آباد اور دلی تک کا سفر کیا تھا۔

وجدی کرنولی: ولی و سراج کے عہد کے ایک اہم شاعر وجدی کرنولی ہیں۔وجدی کا نام شیخ وجیہ الدین تھا۔وجدی کی مثنوی "مخزن عشق" سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا وطن دھارور (مہاراشٹرا) تھا۔

وجدی پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔وہ دھارور سے ترک وطن کر کے کرنول گئے اور نواب اسماعیل خاں پنی کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ان کے پیر طریقت کانام سید فخرالدین شامی تھا۔وجدی کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا۔ ان کی تین تصانیف دریافت ہوئی ہیں جو مثنویات کی شکل میں ہیں۔ان کے نام درج ذیل ہیں:

(1) مخزن عشق (باغ جانفزا)، (2) پنچھی باچھا (پنچھی نامہ)، (3) تحفہ عاشقاں (گل و ہر مز)۔ان مثنویات کے علاوہ ان کے ایک دیوان کا بھی ذکر ملتاہے جو اب نا پید ہے۔البتہ ان کی کچھ غزلیات ملتی ہیں۔

مثنوی مخزن عشق وجدی کی اولین تصنیف ہے۔یہ مثنوی وجدی نے 1145ھ میں مکمل کی۔اس مثنوی میں وجدی نے ایران کے بادشاہ منوچہر کیو مرثی کے وزیر بیدار دل اور چین کے بادشاہ فغفور کی دختر پری رخ کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔

وجدی کی دوسری تصنیف "پنچھی باچھا" ہے۔یہ فارسی کے مشہور صوفی شاعر شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا دکنی ترجمہ ہے۔وجدی نے اصل مثنوی کالفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے کہیں طوالت اور کہیں اختصار سے کام لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔وجدی کی تیسری مثنوی" تحفہ عاشقاں" ہے۔یہ بھی شیخ فریدالدین عطار ہی کی فارسی مثنوی گل وہر مز کاترجمہ ہے۔

ولی ویلوری: ولی ویلوری ولیؔ اورنگ آبادی کے معاصر تھے۔ولیؔ ویلوری کا اصل نام میر ولی فیاض تھا۔وہ ویلور (ٹاملناڈو) کے باشندے تھے۔ابتدامیں انھوں نے سات گڑھ (شمالی ارکارٹ۔ٹامل ناڈو)کے امیر حراست خاں کی ملازمت اختیار کی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انھیں یہ ملازمت چھوڑنی پڑی۔اس کے بعد وہ کڑپہ (آندھراپردیش) کے صوبیدار نواب عبدالمجید خاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔نواب نے انھیں سدھوٹ میں ملازمت دی۔

سدھوٹ میں ولی نے طویل مدت تک قیام کیا۔اس کے بعد وہ ویلور واپس آگئے اور اپنی زندگی کا آخری حصہ وہیں گزارا۔ولی ویلوری نے ارکاٹ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ولیؔ ویلوری کا سنہ وفات نامعلوم ہے۔ولی ویلوری نے 1162ھ میں مثنوی روضتہ العقبیٰ تصنیف کی۔لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ ان کا انتقال 1162ھ کے بعد ہوا۔ولی ویلوری کی درج ذیل تصانیف کا ذکر ملتاہے۔

1۔روضتہ الشہدا 2۔روضتہ الانوار 3۔روضتہ العقبیٰ 4۔دعائے فاطمہ 5۔مثنوی رتن پدم

ان پانچ مثنویوں کے علاوہ ولی کی تین اور تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔

1۔مثنوی وفات نامہ نبیؐ 2۔مثنوی اگر و ملاگیر 3۔تنبیہ نامہ۔

روضتہ الشہدا ولی ویلوری کی سب سے مشہور مثنوی ہے جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ایک عرصے تک اسے ولی اورنگ آبادی سے منسوب کیا جاتارہا لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔یہ دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضتہ الشہدا کا منظوم دکنی ترجمہ ہے۔چونکہ اس میں دس ابواب ہیں اس لیے اس کا نام دہ مجلس بھی ہے۔اس میں کربلا سے ما قبل اور کربلا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔روضتہ الشہدا کا سنہ تصنیف 1137ھ ہے۔

ضعیفیؔ: شیخ دائود نام ضعیفیؔ تخلص قطب شاہی سلطنت کے عہد زوال کے شاعر تھے۔ان کی پرورش قطب شاہی دور کے آخرمیں ہوئی تھی۔ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک متبحر عالم دین تھے اور انھیں عربی و فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ضعیفی کو حضرت گیسو دراز سے بڑی گہری عقیدت تھی۔انہوں نے اپنی مثنویوں میں حضرت گیسو دراز کی تعریف کی ہے۔ضعیفی ایک کثیر التصانیف مذہبی شاعر تھے۔ان کی درج ذیل مثنویوں کا پتہ چلا ہے:

(1) ہدایت ہندی،(2) نصیحت مدن،(3) عشق صادق،(4) مثنوی تصرف،(5) رسالہ اذکار،(6) حرمت علیم،(7) قصہ کفن چور،(8) وفات نامہ،(9) رسالہ اذکار (منظوم)

ہدایت ہندی ایک فقہی مثنوی ہے جس میں احکام شریعت کی وضاحت کی گئی ہے۔ضعیفیؔ نے یہ مثنوی 1100ھ 1688ء میں تصنیف کی۔ضعیفی کی یہ مثنوی زائد از تین ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

نصیحت مدن تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں احادیث نبویؐ کی روشنی میں اخلاق و نصیحت کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔مثنوی عشق صادق ایک ایسی عورت کی داستان ہے جسے رسول اکرمؐ سے سچی عقیدت تھی۔اس میں ضعیفی نے

دکن کی خواتین کی زبان استعمال کی ہے۔اس طرح اس مثنوی میں خواتینِ دکن کی بول چال کی زبان اور ان کے محاورے محفوظ ہو گئے ہیں

مثنوی قصہ کفن چور' میں ایک چور کی روداد بیان کی گئی ہے جو مردوں کے کفن چرایا کرتا تھا۔لیکن آخر میں وہ تو بہ کر کے سید ھار استہ اختیار کرتا ہے۔ان مثنویوں کے علاوہ ضعیفیؔ کی متعدد غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔

عشرتی: عشرتی ولیؔ اورنگ آبادی کے بزرگ معاصر تھے۔عشرتی کا اصل نام سید محمد تھا۔ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات نامعلوم ہیں۔زوال بیجاپور کے بعد عشرتی اورنگ زیب کی ملازمت میں داخل ہوئے۔عشرتی کا مزار شاہ راجو حسینی کے گنبد(مصری گنج۔حیدرآباد) کے پہلو میں واقع ہے۔

عشرتی کی تین تصانیف کا پتہ چلا ہے۔(1) قصہ پد ماوت،(2) چت لگن ،(3) دیپک پتنگ۔قصہ پدماوت فارسی میں ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1110ھ ہے۔عشرتی نے اس میں ملک محمد جائسی کی پد ماوت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔چت لگن دکنی زبان میں لکھی گئی ایک مثنوی ہے جس میں عشرتی نے ایک قدیم طرز کی داستان بیان کی ہے۔مثنوی دیپک پتنگ عشرتی کی شاہکار مثنوی ہے۔اس میں انھوں نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔لیکن یہ پدماوت کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے بلکہ عشرتی نے پدماوت کے فارسی ترجمے مثنوی شمع و پروانہ (مصنفہ عاقل خاں رازی) کو پیش نظر رکھا ہے۔ڈاکٹر زور نے مثنوی دیپک پتنگ کا سنہ تصنیف 1114ھ بیان متعین کیا ہے

والہ موسوی : والہ موسوی ولی اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے۔ان کا پورا نامیر سید محمد اور تخلص والہؔ تھا۔وہ ملا سید محمد باقر موسوی خراسانی کے فرزند تھے۔ان کے سنہ پیدائش کا علم نہیں۔مقام پیدائش خراسان ہے۔والہ نے مروجہ علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔والد کے انتقال کے بعد وہ دہلی آئے۔نظام الملک آصفجاہ اول نے انھیں اپنا مصاحب مقرر کیا۔وہ ان کے ساتھ حیدرآباد آئے اور دکن ہی کے ہو رہے۔والہ موسوی ارکاٹ کے نواب محمد علی والا جاہ کے ہم زلف تھے۔اس رشتے سے وہ حیدرآباد سے ارکاٹ گئے اور ترچنا پلی میں مقیم ہو گئے۔وہیں 1184ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

والہ ایک زبردست عالم ' سخنور' انشا پرداز اور نقاد تھے۔فارسی میں وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔فارسی کے علاوہ والہ نے دکنی زبان میں بھی شاعری کی۔دکنی کی اہم مثنوی " طالب و موہنی " والہ کی تصنیف ہے۔ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ مثنوی 1150ھ کے قریبی زمانے میں حیدرآباد میں لکھی گئی۔(ڈاکٹر زور ' طالب و موہنی (مطبوعہ) مقدمہ ص 17) اس میں طالب نامی ایک نوجوان مسلمان مسافر اور ایک ہندو مہاجن کی دختر موہنی کے عشق کی المیہ داستان بیان کی گئی ہے۔

12.2.2 ولی کے گجراتی معاصرین:

ولیؔ اور سراجؔ کے عہد میں علاقہ گجرات میں بھی متعدد اُردو شعرا دادِ سخن دے رہے تھے۔ان میں بعض ولیؔ سے عمر میں بہت بڑے تھے' بعض ہم عمر تھے اور بعض ولیؔ کے شاگرد تھے۔ذیل میں ان میں سے چند اہم شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

شیخ محمد امین گجراتی : امین کا پورا نام شیخ محمد امین تھا۔وہ گو دھرا (گجرات) کا باشند ہ تھا۔امین کے حالات زندگی کی تفصیلات نا معلوم ہیں۔اس نے چار مثنویاں لکھیں جن کے نام یہ ہیں۔(1) یوسف زلیخا (2) تولد نامہ (3) معراج نامہ (4) وفات نامہ

ان مثنویوں کے علاوہ اس کا ایک قصیدہ بھی ملتا ہے۔امین کی اصل شہرت مثنوی یو سف زلیخا کی بدولت ہے۔اس نے یہ مثنوی مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں 1109ھ (1297ء)میں مکمل کی۔قدیم زمانے میں گجرات کے شعرا اردو کو گجری کہتے تھے۔امین بھی اپنی زبان گجری کہتا ہے۔

سنو مطلب اہے اب یوں امین کا لکھے گجری منیں یوسف زلیخا

سیدمحمد اشرف : ان کا نام سید محمد اشرف اور تخلص اشرف تھا۔متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔اشرف احمد آباد کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عالم کے خاندان میں مرید تھے۔شعر و سخن میں اشرف ولیؔ کے شاگرد تھے۔وہ ایک پر گو شاعر تھے۔غزل کے علاوہ انہوں نے مثنوی اور مرثیہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔اشرف کو اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔انھیں استاد فن مانا جاتا تھا۔اشرف کا ایک دیوان غزلیات' ایک مثنوی موسوم بہ جنگ نامہ حیدراور تیرہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جو نہایت پر اثر ہیں۔

اشرف کا اصل میدان غزل ہے۔ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔اشرف کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت جذبات کی فراوانی اور بیان کی سادگی ہے۔ان کا محبوب کوئی ماورائی ہستی نہیں بلکہ ارضی مخلوق ہے۔اس کی خصوصیات وہی ہیں جو عام انسانوں میں ملتی ہیں۔اشرف جب اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہیں تو اس کے ایک ایک لفظ سے اس کے محبت کے جذبات اور دلی کیفیات اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہیں۔نمونۂ کلام:

اے ہوش ربا سندر مجھ پاس ٹک آتی جا رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتی جا
دیدار ستی اپنے محروم نہ رکھ مجھ کوں آنچل کوں اٹھا مکھ سوں' ٹک درس دکھاتی جا

ہاشم علی : ان کانام ہاشم علی تھا اور وہ اپنے پورے نام کو بہ طور تخلص استعمال کر تے تھے۔ہاشم علی کا وطن گجرات تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ہاشم علی گجرات کے اہم مر ثیہ گو شاعر تھے۔ان کے معاصرین میں روحی' مرزا دکنی اور قادر مر ثیہ گوئی میں مشہور ہوئے۔ہاشم علی ان شاعروں کو اس طرح یاد کرتا ہے۔

ہزار حیف نیئں شاعران دکن سوروحی و مرزا و قادر نہیں

ہاشم علی نے اپنے مرثیوں کا مجموعہ' دیوان حسینی' کے نام سے مرتب کیا۔اس دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشم علی نے مرثیے کے سوا کسی دوسری صنف سخن میں طبع آزمائی نہیں کی۔

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خوان راہ کا جز مدح و منقبت اس نے لکھا نہیں

دیوان حسینی میں مرثیوں کی تعداد تین سو ہے جو ردیف وار مرتب کیے گئے ہیں۔ہاشم علی کہتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد شاعری نہیں گریہ و زاری ہے۔یہ مراثی زیادہ تر مربع اور مخمس کی ہیئت میں ہیں اور شاذ غزل کی ہیئت میں بھی۔

غلامی : غلامی کا نام غلام حیدر یا غلام مرتضیٰ تھا۔ان کا وطن گجرات تھا۔یہ ہاشم علی کے ہم عصر تھے۔غلامی بنیادی طور پر مرثیہ گو تھے، لیکن انھوں نے چند کبت بھی لکھے ہیں۔ان کے لکھے ہوے سترہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ڈاکٹر زور کے مطابق:

> " اپنے ہم عصروں ہاشم علی اور رضا اور دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں حقیقت نگاری کے لحاظ سے وہ بہت اچھا شاعر تھا۔اس کے خیالات بھی اعلیٰ تھے۔کربلا کے دل شکن واقعات کو اس نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کو حقیقی تاریخی واقعات سمجھنے لگتا ہے۔"

ہاشم علی اور غلامی کے علاوہ رضا گجراتی بھی اس دور کا ایک اہم مرثیہ گو شاعر تھا جس کے چند مرثیے ملتے ہیں۔

12.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی فتح دکن سے آصف جاہی سلطنت کے قیام کے ابتدائی دور تک کا زمانہ دکنی ادب کا مغل دور کہلاتا ہے۔اس دور میں دو اہم شعرا سرزمین اورنگ آباد سے اٹھے ایک ولیؔ اور دوسرے سراج۔
- دکنی شعر وادب کا یہ دور ایک طرح سے ولیؔ اور سراجؔ کا عہد تھا۔
- ولیؔ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔بعض مصنفین نے انھیں گجرات کا باشندہ بتایا ہے لیکن ان کے دیوان کی داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔
- اردو شاعری کی تاریخ میں ولیؔ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے اردو غزل کا رشتہ فارسی غزل سے جوڑا اور روایتی دکنی غزل کو ایک نئی سمت عطا کی۔
- ولیؔ نے 1700ء میں دہلی کا سفر کیا۔ولی کے سفر دہلی کے دوررس نتائج بر آمد ہوئے۔ولیؔ کی تقلید میں شمالی ہند کے شعرا نے اردو میں باقاعدہ غزل گوئی کا آغاز کیا۔
- ولیؔ کے جانشین کے طور پر سراج کا نام روشن ہوا۔وہ 1128ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔وہ نہایت زود گو شاعر تھے۔ان کی غزل میں عشق کی حرارت اور صوفیانہ خیالات کی سرمستی پائی جاتی ہے۔
- وہ شاہ عبد الرحمن چشتی کے مرید تھے۔مرشد کے کہنے پر انھوں نے شاعری ترک کردی۔سراج کی کلیات میں غزلوں کے علاوہ مثنویات،رباعیاں، قصائد وغیرہ شامل ہیں۔

- ایک مثنوی" بوستان خیال" بھی سراج کی اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنی روداد عشق بیان کی ہے۔
- ولیؔ اور سراج کے عہد میں متعدد شعرا و دکن کے مختلف علاقوں اور گجرات میں‌داد سخن دے رہے تھے۔ولی اور سراج کے اورنگ آبادی۔معاصرین میں داؤدؔ غزل گو شاعر تھے جن سے غزلیات کا ایک دیوان یاد گار ہے۔
- عاجزؔ بھی اورنگ آباد کے اہم شاعر تھے۔انھوں نے فارسی اور اردو میں ایک ایک دیوان مرتب کیا۔علاوہ ازیں لال وگوہر کے نام سے ایک داستانی مثنوی لکھی۔اسی دور میں شاہ قاسم بھی تھے جن کا دیوان غزلیات شائع ہوچکا ہے۔
- سامیؔ ،ولیؔ کے کم عمر معاصر تھے۔ان کا دیوان غزلیات ناپید ہے لیکن مثنوی ''سرو شمشاد'' موجود ہے۔ان کے علاوہ عزلت بھی عہد ولی و سراج کے اہم اورنگ آبادی شعرا ہیں۔
- ولی اور سراج کے دیگر دکنی معاصرین میں شاہ معظم حسینی نے غزلیات کے دیوان کے علاوہ متعدد صوفیانہ مثنویاں لکھیں جیسے شجرہ الا تقیا، گلزار چشت،معراج نامہ،ساقی نامہ وغیرہ۔
- اسی زمانے کے ایک مشہور صوفی شاعر قاضی محمد بحری ہیں۔ان کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی'' من لگن'' نہایت مشہور اور مقبول ہے۔
- سید شاہ حسین ذوقیؔ بھی صوفی شاعر تھے۔انھوں نے سب رس کی داستان کو وصال العاشقین کے نام سے مثنوی کی شکل میں لکھا۔دیگر مثنویوں میں غوث نامہ،وفات نامہ رسول اور نزہت العاشقین شامل ہیں۔
- فراقی بیجاپوری ولیؔ کے کم عمر معاصر تھے۔ان کی چند غزلیات اور ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" دستیاب ہوئی ہے جس میں قیامت کے احوال بیان کیے ہیں۔
- وجدی اصلاً دھارور(مہاراشٹرا) کے باشندے تھے لیکن کرنول میں بودوباش اختیار کی تھی۔ان سے تین مثنویاں، مخزن عشق،پنچھی باچھا اور تحفۂ عاشقاں یاد گار ہیں۔
- ولی ویلوری بھی اس دور کے اہم دکنی شاعر تھے، جنھوں نے ملا کاشفی کی مثنوی روضتہ الشہدا کا دکنی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ان کی آٹھ مثنویوں کا ذکر ملتا ہے۔ملاداؤد ضعیفی نے فقہی مسائل اور اخلاق وتصوف پر مثنویاں لکھیں۔
- عشرتی بھی اس دور کے اہم شاعر تھے جنھوں نے تین مثنویاں قصہ پدماوت،چت لگن اور دیپک پتنگ لکھیں۔
- ولی اور سراج کے عہد میں علاقہ گجرات میں بھی اردو شاعری کے چرچے تھے۔ولیؔ کے گجراتی معاصرین میں شیخ محمد امین گجراتی نہایت اہم ہیں جن کی چار مثنویاں ملتی ہیں۔ان میں مثنوی یوسف زلیخا اہم ہے۔
- ہاشم علی گجرات کا سب بڑا مرثیہ گو شاعر تھا۔اس کے مرثیوں کا مجموعہ دیوان حسینی ہے۔ہاشم علی کے علاوہ غلامی اور رضا گجراتی بھی اس دور کے اہم مرثیہ گو شعرا تھے۔

12.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
پتیارا	:	اعتماد،اعتبار
غمزہ	:	آنکھ اور بھوں سے معشوق کا اشارہ کرنا
سرچشمہ	:	پانی کا سوتا
انبساط	:	خوشی،کھلنا
چین پیشانی	:	پیشانی کی شکن
کھبالے بال	:	گھنگریالے بال
جودھا	:	پہلو ان،بہادر
بان	:	تیر
آزاد مشرب	:	آزاد خیال
الہام	:	دل پر خدا کی طرف سے کوئی بات ظاہر ہو جانا

12.5 نمونۂ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولیؔ دکنی کا اصل نام کیا تھا؟

(a) محمد ولی (b) علی محمد (c) محمد علی (d) ولی محمد

2۔ مثنوی "بوستان خیال" کس کی تصنیف ہے؟

(a) سراج اورنگ آبادی (b) ولی دکنی (c) داؤد اورنگ آبادی (d) عاجز اورنگ آبادی

3۔ عاجز اورنگ بادیؔ کی مثنویوں کے نام کیا ہے؟

(a) سرو وشمشاد (b) لال وگوہر (c) معراج نامہ (d) ساقی نامہ

4۔ " راگ مالا" کس کی تصنیف ہے؟

(a) داؤد (b) عاجز (c) عزلت (d) شاہ معظم

5۔ ولیؔ نے کس سنہ میں دہلی کا سفر کیا؟

(a) 1700 (b) 1710 (c) 1720 (d) 1725

6۔ سراج اورنگ آبادی کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) سید درویش (b)سید سراج (c)سید معراج (d)سید شاہ عبد الرسول

7۔ مثنوی "من لگن" کس کی تصنیف ہے؟

(a) سید شاہ حسین (b)وجدی کرنولی (c) محمود بحری (d)شاہ معظم

8۔ ذیل کی کون سی تصنیف وجدی کرنولی کی نہیں ہے؟

(a) دعائے فاطمہ (b)مخزن عشق (c) پنچھی نامہ (d)تحفہ عاشقاں

9۔ ذیل میں کون ساشاعر ولی دکنی کا معاصر نہیں ہے؟

(a) سراج اورنگ آبادی (b)نصرتی (c)سید محمد اشرف (d)ہاشم علی

10۔ "درفراق گجرات" کے عنوان سے قطعہ کس نے لکھا ہے؟

(a)جنیدی (b)سراج (c)عاجز (d)ولی دکنی

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سراج اورنگ آبادی پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔

2۔ ولی کے گجراتی معاصرین کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

3۔ شاہ معظم کی شعری تصانیف کا ذکر کیجیے۔

4۔ بحریؔ کے حالات بیان کیجیے؟

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولیؔ کے حالات زندگی اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ ولیؔ کے اورنگ آبادی معاصرین کا تعارف کرائیے۔

3۔ ولیؔ کی غزل گوئی پر ایک مضمون لکھیے۔

12.6 تجویز کردہ اکتسابی

1۔ دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

2۔ تاریخ ادب اردو جلد اول — ڈاکٹر جمیل جالبی

3۔ تاریخ ادب اردو، جلد اول و دوم — پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین

12.5.1 کے جوابات: 1۔d 2۔a 3۔b 4۔c 5۔a

6۔a 7۔c 8۔a 9۔b 10۔d

بلاکVI : اردو کے اہم ادارے اور تحریکات

اکائی 13: فورٹ ولیم کالج

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

13.3 کالج کا نصاب

13.4 ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی اردو خدمات

13.5 کالج کے اہم مترجمین اور ان کی خدمات

13.5.1 میرامن دہلوی

13.5.2 سید حیدر بخش حیدری

13.5.3 میر شیر علی افسوس

13.5.4 مرزاعلی لطف

13.5.5 میر بہادر علی حسینی

13.5.6 مظہر علی خاں ولا

13.5.7 میر کاظم علی جوان

13.5.8 نہال چند لاہوری

13.6 کالج کے دیگر مصنفین

13.7 کالج کا زوال

13.8 اکتسابی نتائج

13.9 کلیدی الفاظ

13.10 نمونۂ امتحانی سوالات

13.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

کالج کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسی عمارت کا خاکہ ابھرتا ہے ،جس میں طالب علموں کی صلاحیت کو نکھارنے کے لیے اساتذہ یا مدرس اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔کالج عام طور پر سماجی اقدار، تہذیب وثقافت کو نصاب کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنے کا کام کرتا ہے، لیکن ہم یہاں جس کالج کے بارے میں پڑھنے جا رہے ہیں وہ طالب علموں کے لیے نہیں کھولا گیا بلکہ اس کالج کا بنیادی مقصد انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبان (اردو)سکھانا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ وہ بہت موئثر انداز سے ہندوستان میں ان کی مقبوضہ ریاستوں میں حکومت کرسکیں۔ چنانچہ 10/جولائی1800ء کو کلکتہ کے فورٹ ولیم نامی قلعے میں ایک کالج قائم کیا گیا ،جسے فورٹ ولیم کالج کا نام دیا گیا۔یہ کالج لارڈ ویلزلی کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کی اجازت سے قائم کیا گیا۔اس کالج میں بہت سے علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔یہ اردو نثر کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقصد پر روشنی ڈال سکیں۔
- فورٹ ولیم کالج کے اہم ملازمین اور ان کی خدمات کے بارے میں لکھ سکیں۔
- اردو نثر کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈال سکیں۔

13.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

فورٹ ولیم کالج کی ابتدا جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستان کی تاریخ کا پر آشوب دور تھا۔صوبائی بغاوتیں شہنشاہیت کو نقصان پہنچارہی تھیں اور غیر ملکی طاقتیں اس دور کے سیاسی انتشار سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے سر گرم عمل تھیں۔بنگال' پلاسی کی جنگ1757ء کے نتیجے میں فرنگی تسلط میں آگیا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی جو صرف تجارتی مقصد سے قائم کی گئی تھی اب سیاست کے میدان میں بھی قدم جمانے لگی تھی۔بکسر کی لڑائی کے بعد انگریز تسلط نہ صرف مشرقی اضلاع پر

مستحکم ہوا بلکہ مغربی اور جنوبی ہند تک پہنچ چکا تھا۔اس تسلط کو بر قرار رکھنے ' مزید سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور حکومت کے کاروبار چلانے کے لیے انگریز افسروں کا دیسی زبانوں سے واقف ہو نا ضروری تھا۔فارسی کا عروج ختم ہو چکا تھا۔اردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ملک کے اکثر و بیشتر حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔عوام میں اردو کا چرچا ہونے لگا تو کمپنی بہادر کے حکام نے بھی اردو سیکھنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں 1800 ء میں قائم کیا۔اس کالج کا مقصد اردو کی بقا یا ترویج واشاعت نہ تھا بلکہ کمپنی کے انگریز ملازمین کو اردو سکھانے کا انتظام کرنا تھا۔اس وقت ملک کی ابھرتی ہوئی زبان اردو ہی تھی جو ہندوستان کے طول وعرض میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ اس میں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہورہا تھا۔چنانچہ ارباب مقتدراس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے لیے مجبور تھے۔فورٹ ولیم کالج کا قیام چوں کہ سرکاری طور پر منظم کاوش تھی اس لیے اس کا اردو نثر کی ترقی ورفتار پر خوش گوار اثر پڑا۔

13.3 کالج کا نصاب

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں' اسی لیے سادہ اور سلیس زبان میں تیار کی گئیں۔اردو قواعد کی کتابیں اور لغات بھی تیار کی گئیں۔اردو میں جو نثری کتابیں تھیں وہ مشکل زبان میں تھیں اور تمام تر مذہبی تھیں۔تاریخ اور دوسرے علمی موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں تھیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی کاموں کے لیے ایک مدت تک فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

یہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب کا ایک پہلو ہے جسے اردو والوں نے ایسی تشہیر بخشی کہ فورٹ ولیم کا نام آتے ہی ذہن میں صرف اردو زبان کے تعلق سے ایک کالج کا نقشہ آتا ہے، جس میں مشرقی شعبے کے تحت عربی فارسی اور اردو کا درس دیا جاتا ہوگا۔لیکن حقیت میں اس کالج میں جغرافیہ،کیمیا اور دوسری یوروپی زبانیں (لاطینی، انگریزی،کلاسیکی یونانی) بھی سکھائی جاتی تھیں۔چونکہ ہندوستان میں بھیجے گئے افسران کم عمر ہوتے تھے اس لیے انہیں اپنے زبان و ادب اور تہذیب سے واقف کرنے کے لیے اساتذہ مقرر کیے گئے تھے۔ساتھ ہی سائنس میں علم نباتات (Botany)، علم کیمیا(Chemistry)اور علم نجوم (Astronomy)کی بھی تعلیم کا نظم و نسق بھی اپنی مثال آپ تھا۔اس وقت تک اردو میں کلاسیکی داستانوں کے علاوہ صرف شاعری کا ہی چرچا تھا۔اردو میں دوسرے علوم (تاریخ اور جغرافیہ) کی کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ترجمہ و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔جس میں تمام ملک سے افراد کو منتخب کرکے کلکتہ میں جمع کیا گیا اور ان سے نثر میں کتابیں تالیف کرائی جانے لگیں۔

اس کے علاوہ عیسائی مذہب کی تعلیمات کو بھی کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔کالج میں مسیحی عبادت پر زور دیا جاتا تھا۔اس طرح یہ کالج ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے لیے نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوا بلکہ عیسائی

نظریات اور مذہبی تبلیغ کو فروغ دینے میں بھی کالج کے عیسائی ملازمین نے اہم کردار ادا کیا۔

13.4 ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی اردو خدمات

گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ (John Barth wick Gilchrist) تھا۔وہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔1783ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ہندوستان میں دہلی اور لکھنؤ میں رہ کر انہوں نے اردو اور فارسی سیکھی اور کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان بنانا زیادہ مفید ہوگا۔بعد میں ان کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے 1832ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے گل کرسٹ نووارد انگریز عہد یداروں کو فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔جب 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوا تو ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں کالج میں ہندوستانی(اردو) کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔گل کرسٹ1804ء تک کالج کی خدمات انجام دیتے رہے۔خرابی صحت کی وجہ سے پنشن لے کر اپنے وطن لوٹ گئے۔1818ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان میں اور ینٹل انسٹیٹیوٹ قائم کیا تو وہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اس ادارے کے بر خاست ہونے تک کام کرتے رہے۔1814ء میں 88 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کی مدت کل بیس برس کی ہے جس میں پچاس یا ساٹھ کتابیں منظر عام پر آئی لیکن مجموعی طور پر شہرت انہیں کتابوں کو ملی جو جان گل کرسٹ کے کالج سے وابستہ رہتے ہوئے لکھی گئیں۔انہوں نے صرف چار سال تک ہی فورٹ ولیم کالج میں خدمات انجام دیں لیکن ان چار سالوں میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں تمام ہندوستان سے قابل اور لائق ماہرین زبان کو جمع کیا اور ان سے تصنیف و تالیف کا کام اس طرح لیا کہ مختلف مو ضوعات پر اردومیں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔اس کے علاوہ اردو سیکھنے کے لیے بنیادی کتابوں کا جتنا ذخیرہ انہوں نے فراہم کیا وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ان کی اہم تصانیف یہ ہیں:

1۔ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری:یہ لغت انگریزی لغات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

2۔ ہندوستانی گرامر:یہ اردو صرف و نحو سے متعلق کتاب ہے اور فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے متعدد بار شائع بھی ہوئی۔میر بہادر علی حسینی نے اس کا خلاصہ بھی مرتب کیا۔

3۔ مشرقی زبان دان:اس کو اور ینٹل لنگوسٹ بھی کہتے ہیں۔اس میں اردو زبان کا مقدمہ اور تعارف ہے، ساتھ ہی اردو انگریزی کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے۔

4۔ فارسی افعال کا نظریہ جدید:اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔یہ افعال کے پہلوؤں پر بحث کرتی ہے اور اس میں انگریزی اور اردو میں مختلف افعال کے مترادفات بھی شامل ہیں۔

5۔ رہنمائے اردو:انگریز افسروں کو کم سے کم وقت میں اردو سے واقفیت حاصل کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی۔اس کا پہلا ایڈیشن 1802ء میں کلکتہ سے اور دوسرا ایڈیشن لندن سے 1808ء میں شائع ہوا۔

6۔ مشرقی قصے:اس کتاب میں حکایات لقمان اور دوسری زبانوں کی حکایتوں اور کہانیوں کے ترجمے شامل ہیں۔اس کتاب کی تالیف میں گل کرسٹ نے کالج کے دوسرے اہل قلم سے بھی مدد لی تھی۔

7۔ بیاض ہندی : فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے کارناموں کا انتخاب وغیرہ۔

8۔ اتالیق ہندی:اردو سیکھنے اور پڑھنے لکھنے میں مزید آسانی کے لیے کالج کے اہم قلم کاروں سے مضامین لکھوائے گئے۔اس کے علاوہ فارسی کے کچھ آسان مضامین کا ترجمہ بھی کرایا گیااور کتاب کی ابتدا میں فارسی صرف و نحو اور اس کے ابتدائی مسائل پر بحث کی گئی۔

9۔ عملی خاکے:اردو الفاظ کو تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کے اصول کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

10۔ ہندی الفاظ کی قرأت:اس میں ہندی الفاظ کی قرأت اور تلفظ کے اصول سے متعلق مدلل بحث کی گئی ہے۔کچھ لوگوں نے اسے علمی خاکوں کی ترمیم شدہ شکل بھی کہا ہے۔

11۔ ہندی عربی آئینہ:یہ ایک رسالہ ہے جس میں عربی کے ایسے نقشے شامل ہیں جو اردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔یعنی اردو اور عربی میں مشترک الفاظ کوان کی شکلوں کے مطابق سمجھایا گیا ہے۔

12۔ انگریزی ہندوستانی بول چال:یہ رسالہ 1820ء میں لندن سے شائع ہوا۔اس رسالے کو ترتیب دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس کی مدد سے انگریز اردو بول چال سیکھ سکیں اور روزمرہ کے کاموں میں مقامی لوگوں سے بات چیت کرنے میں انہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد کپتان ٹامس روبک اردو کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ان کا تعلق فوج سے تھا۔انہوں نے کالج کے اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا اور کئی کتابیں شائع کیں۔انھوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔" لغت جہاز رانی " کے نام سے لغت لکھی اس کے ساتھ ایک مختصر اردو قواعد بھی شامل کی۔ان کی دوسری کتاب " ترجمان ہند وستان " ہے۔اس میں بھی قواعد زبان کی تشریح کی گئی ہے۔ان اردو کتابوں کے علاوہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ بھی لکھی۔کپتان جوزف ٹیلر اردو کے پروفیسر تھے انھوں نے بھی ایک مبسوط اردو انگریزی لغت لکھی۔

13.5 کالج کے اہم مترجمین اور ان کی خدمات

13.5.1 میر امن دہلویؔ:

میر امن کا نام میر امان تھا۔دہلی کے رہنے والے تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔ان کے آباء و اجداد ہمایوں کے دور سے مغلیہ سلطنت میں خدمات انجام دے رہے تھے۔دربار سے وابستہ رہتے ہوئے انہوں نے وظائف اور جاگیریں حاصل

کیں،لیکن جب دہلی میں تباہی آئی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے میں اوروں کے ساتھ ان کا گھر بھی تاراج ہو گیا، سورج مل جاٹ نے ان کی جاگیر پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے عظیم آباد کا رخ کیا جہاں ایک مدت گزارنے کے بعد99-1798ء میں کلکتہ پہنچے جہاں نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق بنے۔اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت تھی۔1801ء میں بہادر علی حسینی کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہوئے۔

میر امن کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات نہیں ملتی۔ان کے بارے میں جوکچھ بھی معلومات دریافت ہوئی ہیں۔ اس کا ماخذ'باغ وبہار' کا دیباچہ ہے۔کچھ تذکرہ نویسوں نے ان کا نام امان بتایا ہے اور امّن تخلص بتایا ہے، جو کہ اب قابل قبول نہیں ہے۔میرامن پانچ سال تک کالج سے وابستہ رہنے کے بعد میں ضعیفی کے سبب4جون/ 1806ء میں کالج کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔

میر امن نے فورٹ ولیم کالج میں دو کتابیں لکھیں لیکن "باغ وبہار" کے حصے میں جو شہرت آئی،اس کی برابری "گنج خوبی" نہ کر سکی۔"گنج خوبی" میر امن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب"اخلاق محسنی" کا اردو ترجمہ ہے جو انہوں نے 1802ء میں مکمل کی۔رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ اس کتاب پر میرا من کو چار سو روپیے انعام بھی ملا تھا۔چونکہ فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی کوششوں سے جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان میں سب سے زیادہ شہرت 'باغ و بہار' کے حصے میں آئی لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تاکہ اس کی وجہ تشہیر دریافت کی جا سکے۔

'باغ و بہار'کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا سلیس اور سادہ اسلوب ہے۔اس کی نثر میں تازگی،توانائی اور دلکشی ہے۔عبارت میں وہ سادگی اور روانی ہے کہ پڑھتے ہوئے کسی طرح کی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔میر امن کو زبان دہلی پر قدرت حاصل تھی لہٰذا جزئیات نگاری اور واقعہ نگاری کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ان کے اسلوب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل میر عطا حسین خاں تحسین اسی داستان کو "نوطرز مرصع" کے نام سے رنگین عبارت میں ترجمہ کر چکے تھے۔کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل قصہ فارسی میںتھا جس کی تصنیف کا سہرا طوطی ہند امیر خسرو کے سر تھا۔ایک بار ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے دوران یہ قصہ سنایااور جب غسل صحت تمام ہو چکا تو آپ نے دعا دی کہ جو کوئی بھی اس قصہ کو سنے گا وہ بیماری سے نجات پائے گا۔

فارسی میں اس قصے کی مقبولیت کے سبب تحسین نے اسے 'بیچ عبارت رنگین زبان ہندی'میں لکھا۔نوطرز مرصع کے ذیل میں یہ مذکورہوا کہ اس کو لکھتے ہوئے تحسین کے سامنے غالباً کوئی نسخہ نہیں تھا بلکہ انہوں نے کشتی میں ایک عزیز کے منہ سے داستان سنی،اسی کو اپنی قلم سے قرطاس پر رقم کر دیا۔لیکن عرف عام میں اس قصے کی مقبولیت کا وہی حال تھا جو فضلی کی کربل کتھا سے قبل ملا حسین واعظ کاشفی کی 'روضۃالشہدا' کا تھا۔وہاں لوگ اس کو سن کر آہ نالہ نہ کر پاتے تھے اور

یہاں اس داستان کی عبارت رنگین ہونے سے مکمل طور پر لطف نہیں لے پاتے تھے۔فورٹ ولیم کالج میں نوآموز انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے ضروری تھا کہ عبارت صاف اور سادہ ہو۔لہٰذا گلگرسٹ نے اس کام کی ذمہ داری میر امن کے سپرد کی کہ اس کتاب کو بہ زبان دہلی ترجمہ کریں۔

میر امن کی داستان میں جدت سے انکار نہیں کیا جا سکتا،لیکن چونکہ یہ داستان طبع زاد نہیں تھی اور اسے لکھنے کے لیے میر عطا حسین خاں تحسین کی نوطرز مرصع کو سامنے رکھا لہٰذا کہانی کے پلاٹ میں ہونے والی خامی یا خوبی کے لیے میر امن کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے لیکن جہاں جہاں معاشرے کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے قلم نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔وہ دلی کے روڑے تھے اور یہاں کی زبان کا عرق ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا لہٰذا کسی بھی مقام پر روزمرہ کی شیرینی اور محاروں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ "باغ و بہار" کے ذریعے میر امن نے جغرافیائی حد بندیوں کو توڑ کر مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن اور ذائقوں کو ہندوستانی دسترخوان پر لاکر رکھ دیا ہے۔جزئیات نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔وہ جب کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے تمام انواع و اقسام کو ایک سانس میں گناتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں انھوں نے دو کتابیں" باغ و بہار " اور " گنج خوبی " لکھیں۔میر امن نے قصہ چہار درویش کو " باغ وبہار " کے نام سے لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر لی۔اردو میں میرامن سے پہلے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے قصہ چہار دویش کو " نوطرز مرصع" کے نام سے لکھا تھا۔ تحسین کا یہ قصہ بہت مشکل زبان میں ہے اور اس کی عبارت مقفیٰ مسجع ہے۔میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے علاوہ قصہ چہار درویش کو بہت سے لوگوں نے لکھا ،لیکن " باغ وبہار " جس ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے اورقصہ چہار درویش کو جتنی شہرت اور مقبولیت اس کتاب سے حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوسکی۔میرامن کی باغ و بہار نے نہ صرف اردو میں شہرت حاصل کی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔

میرامن کی دوسری کتاب" گنج خوبی " ہے ،جو دراصل ملا حسین کا شفی کی مشہور فارسی کتاب " اخلاق محسنی " کا اردو ترجمہ ہے۔اس میں اخلاقی حکایتوں کو پیش کرکے نصیحت آموز نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران دو کتابوں کا ترجمہ کیاجن میں ایک باغ وبہار اور دوسری گنج خوبی ہے۔ان میں اوّل الذکر کی مقبولیت سے انکار نہیں کی جا سکتا ،لیکن گنج خوبی ان کا بالکل غیر معروف کارنامہ ہے جو گل کرسٹ کے ایماپرنوآموزطالب علموں کے لیے ترجمہ کرائی گئی۔اس کتاب کا اصل ماخذ ملاحسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "اخلاق محسنی" ہے اور گنج خوبی اس کا آزاد ترجمہ ہے۔یہ اخلاقیات کی بہت معتبر کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ 1802ء میں باغ و بہار کو مکمل کر کے اس کا ترجمہ شروع کیا۔وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے میر امن خود لکھتے ہیں:

"سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے "باغ و بہار" کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کے نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں۔اس واسطے اس کا نام "گنج خوبی" رکھا۔"

میر امن ایک اچھے نثر نگار کے ساتھ بہترین مترجم بھی تھے لہٰذا گنج خوبی اپنے موضوع کے باعث لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو لیکن اس کا بھی ترجمہ کرتے ہوئے میر امن نے جدت سے کام لیا ہے اور لفظی ترجمہ نگاری کے بجائے آزاد ترجمہ کو ترجیح دی ہے۔اخلاق محسنی میں پند و نصائح اور اخلاقی موضوعات کے باعث سنجیدگی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے پھر بھی جہاں مناسب معلوم ہوا، روزمرہ کے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور یہی وہ خوبی ہے، جس نے ان کے ترجمے کو کامیاب بنایا ہے۔

13.5.2سید حیدر بخش حیدری:

اگر فورٹ ولیم کالج میں کتب کی تعداد کے اعتبار سے کسی مصنف کی عظمت کا اندازہ لگایا جائے تو حیدر بخش حیدری کا نام سر فہرست ہوگا۔انہیں نثر اور شاعری دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ان کا آبائی وطن نجف اشرف تھا لیکن اجداد معاش کی تلاش میں دہلی آئے اور یہیں کے ہو کر رہے۔جب معاشی پریشانیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو روزگار کی تلاش میں کلکتہ کا رخ کیا اور "قصہ مہر وماہ" گلکرسٹ کی خدمت میں لکھ کر پیش کیا اورجب 1801ء میں منشیوں کا تقرر ہوا تو ان میں ایک نام حیدر بخش حیدری کا بھی تھا۔۔فورٹ ولیم کالج میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اور کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔1823 ء میں بنارس میں ان کا انتقال ہوا۔حیدر بخش حیدری کی درج ذیل تصانیف ہیں۔

1۔ " قصہ مہر و ماہ" : یہ حیدری کی پہلی تصنیف ہے۔
2۔ قصہ لیلیٰ مجنوں: یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔
3۔ طوطا کہا نی : یہ سنسکرت زبان کی " شکاسب تتی" پر مبنی ہے۔شکاسب تتی کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں
4۔ آرائش محفل : یہ قصہ حاتم طائی پر مبنی ہے۔یہ قصہ بھی فارسی سے ترجمہ کیا گیا۔
5۔ ہفت پیکر : حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی "ہفت پیکر" سے متاثر ہوکر اسی طرز پر اردو مثنوی " ہفت پیکر " ہی کے نام سے لکھی۔
6۔ تاریخ نادری : نادر شاہ کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔یہ تاریخ فارسی میں لکھی گئی تھی جس کا حیدری نے اردو میں ترجمہ کیا۔

7۔ گل مغفرت : روضتہ الشہد اکا ترجمہ ہے۔

8۔ گلزار دانش : شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی کتاب " بہاردانش " کا ترجمہ ہے۔

9۔ گلشن ہند: اردو شعر اکاتذکرہ کے علاوہ " گلدستہ حیدری " میں مضامین ' دیبا چے اور نظمیں ملتی ہیں۔اسی نام سے ایک تذکرہ مرزا علی لطف نے بھی لکھا,لیکن حیدری نے اپنے تذکرے کو اس لائق نہیں سمجھا اور اس پر نظر ثانی نہیں کی۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف "قصہ مہر وماہ"(1799ء) ہے جس میں خاور شاہ کے بیٹے اور شہزادی ماہ کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔یہ قصہ اسی نام کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔اس کی بنیاد پر حیدری کو نوکری تو مل گئی لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔دوسری کتاب "قصہ لیلیٰ مجنوں" ہے ,جو 1801ء میں مکمل ہوئی۔اس قصے کو شاہ عالم کے عہد میں یٰسین شاہجہاں آبادی نے ہندی میں اس کو نظم کیا تھا اور پھر گلکرسٹ کی فرمائش پر حیدری نے اسے نثری جامہ پہنایا۔توتا کہانی کی طباعت 1802ء میں شروع ہوئی لیکن کالج کے پرنسپل کے حکم سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔آخر کار 1804ء میں یہ مکمل طور پر شائع ہو کر سامنے آئی۔یہ کتاب بھی محمد قادری کے "طوطی نامہ" کا اردو ترجمہ ہے، لیکن "طوطی نامہ "بھی سنسکرت کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جسے سب سے پہلے مولانا ضیاء الدین بخشی نے 1330ء میں فارسی میں منتقل کیا۔اگر چہ طوطی نامہ کی زبان مشکل اور بوجھل ہے پھر بھی حیدری نے اس کا ترجمہ کرتے وقت سہل اور سلیس نثر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے،جس کی وجہ سے یہ کتاب خوب مقبول ہوئی۔گیان چند جین نے لکھا ہے کہ اس وقت تک اردو میں نثر کی کتابیں معدودے چند تھیں,ان میں سیدھی سلیس اور بامحاورہ کتابوں کا بھی قحط تھا۔

حیدری کی دوسری مشہور کتاب "آرائش محفل" 1803ء میں شائع ہوئی۔اس میں حاتم طائی کے متعلق قصوں کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے۔اس قصے کی اصل فارسی ہے جسے گلکرسٹ کے کہنے پر ترجمہ کیا گیا۔حیدری نے اس قصے میں متعدد دفعہ تبدیلی کر کے قصے کو طور دیا ہے اور اس اعتبار سے ترجمہ سے زیادہ ان کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔یہ باغ وبہار کے بعد سب سے مقبول داستان تھی۔حیدری کے یہاں طلسم اور ساحری کے وہ کرشمے ہیں جو "طلسم ہوش ربا"جیسی ضخیم داستانوں میں پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ "ہفت پیکر"نام سے ایک مثنوی تصنیف کی،جو کہ حضرت نظامی گنجویؒ کی مشہور مثنوی "ہفت پیکر" کی طرز پر لکھی گئی۔یہ کتاب 1805ء میں شائع ہوئی، لیکن اس کی اشاعت مشکوک ہے۔

ملاحسین واعظ کاشفی کی "روضتہ الشہدا" کی شہرت یوں تو سب سے پہلے فضلی کے ترجمے سے ہوئی،لیکن اس کے ترجمے کا سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا۔فورٹ ولیم کالج میں حیدربخش حیدری نے "گلشن شہیداں" کے نام سے اردو میں منتقل کیا اور پھر"گل مغفرت" کے نام سے شہدائے کربلا کے حالات پر مشتمل ایک انتخاب کیا۔انہوں نے اپنے ایک رفیق سید حسین جونپوری کی فرمائش پر اس کا انتخاب کر کے کلکتہ سے1812ء میں شائع کرایا۔فضلی کی طرح حیدری نے جوں کا توں لفظی

ترجمہ نہ کر کے آزاد ترجمہ کیا اور بہت سے اضافے کر دیے کہ یہ ترجمہ کے بجائے ان کی تالیف معلوم ہوتا ہے۔فضلی کی "دہ مجلس" کی طرز پر اسے "دہ مجلس حیدری" بھی کہا جاتا ہے۔اس میں شہادت کے درد انگیز واقعات کو رقت آمیز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ برٹ ریاں نامی ایک فرانسیسی نے اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کر کے 1845ء میں پیرس سے شائع کرایا۔

حیدری کی ایک اور کتاب"گلزار دانش " مشہور فارسی کتاب "بہار دانش" کا ترجمہ ہے ،جس کے خالق شیخ عنایت اللہ تھے۔یہ ایک نیم تاریخی قصہ ہے اور سنہ تالیف اس کا 1651ء ہے، لیکن اردوترجمے کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتیں کہ اب اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔فورٹ ولیم کالج میں "گلشن ہند" کے نام سے دو تذکرے لکھے گئے۔ایک مرزا علی لطف نے لکھا جسے خوب شہرت ملی۔دوسرا تذکرہ جو حیدری کا "گلشن ہند" ہے جو اب تک نہ شائع ہوا ہے اور نہ کسی نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔شاید حیدری نے اپنے کارنامے کو اس قابل نہیں سمجھا، ورنہ ان کی نثر کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے گلکرسٹ کے سامنے یہ نسخہ پیش کیا ہوتاتو وہ اس کی قدر کیوں کرنہ کرتے۔یہ تذکرہ1801ء کے آس پاس لکھا گیا۔حیدری نے 1801 ء میں اپنے مضامین کا مجموعہ "گلدستۂ حیدری" کے نام سے مرتب کیا،جس میں مضامین،دیباچے اور شاعری کو شامل کیا ہے۔اس میں مجموعۂ حکایات، مجموعہ مراثی،قصہ مہر و ماہ کا دیباچہ،قصہ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ کے علاوہ شعرائے اردو کا تذکرہ بھی اس میں شامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں میر امن کے بعد سب سے معتبر نام حیدربخش حیدری کا ہے،تاہم ان کی نثرکسی بھی سطح پر میر امن سے کم نہیں ہے۔دونوں اپنے اپنے میدان کے بہترین انشا نگار ہے۔میر امن کی نثر میں صرف دہلی کی بولی اور محاورے ملتے ہیں لیکن حیدری کے یہاں سادہ اور صاف زبان ملتی ہے۔میر امن کے یہاں ہندی الفاظ کی کثرت ہے لیکن حیدری کے یہاں عربی،فارسی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ان کی ابتدائی تحریروں پر فارسی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے، لیکن "آرائش محفل" تک آتے آتے ان کی نثر سادی اور عبارت سلیس ہو جاتی ہے۔ان کے یہاں سنجیدگی،قواعد کی پابندی ہونے کے بعد بھی نثر گنجلک نہیں۔میر امن کے ہم عصر ہونے کے باوجود ان کی نثر آج کی نثر سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔

13.5.3 میر شیر علی افسوس:

حیدر بخش حیدری کی طرح میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی مشہور و معروف مصنفین میں سے ہیں۔افسوس کے دادا محمد شاہ کے عہد میں عراق سے ہندوستان آئے اور نواب عمدۃ الملک کے ملازم ہوئے۔افسوس دہلی میں1735 ء میں پیدا ہوئے۔نواب عمدۃ الملک کے انتقال کے بعد افسوس کے والد پٹنہ گئے اور بعد میں اودھ پہنچ کر وہاں کی سرکار میں ملازمت کی اس کے بعد حیدرآباد آگئے اور یہیں انتقال کیا۔میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج میں تقرر ہونے سے قبل ہی دلی، پٹنہ اور لکھنؤ کی محفلوں میں خوب نام پیدا کر چکے تھے۔انھوں نے میرؔ سوداؔ مصحفیؔ جراتؔ اور انشاؔ کازمانہ

دیکھا تھا اور ان کے ساتھ مشاعروں میں بھی شریک تھے۔جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت پیش آئی تو ایک نواب کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔1805 ء میں وفات پائی۔

فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی فرمائش پر انھوں نے فارسی کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا۔

1۔ باغ اردو : گلستان سعدی کا ترجمہ ہے۔

2۔ آرائش محفل : منشی سجان نے ہندوستان کی معتبر اور مستند تاریخ خلاصتہ التواریخ کے نام سے فارسی میں لکھی تھی اسی تاریخ کو افسوس نے اردو میں منتقل کیا۔

میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی منشیوں میں سب سے ممتاز عہدے پر فائز تھے۔شہرت کے اعتبار سے میر امن اس کالج کا سب سے بڑا نام تھا جن کی تنخواہ چالیس روپے ماہانہ تھی لیکن افسوس کو سو روپئے ماہانہ ملتے تھے۔شیر علی افسوس کالج میں اپنے ترجمہ ''گلستان سعدی'' کی وجہ سے معروف و مقبول ہیں۔ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے گلکرسٹ نے یہ ترجمہ انہیں دیا تھا۔افسوس نے ''گلستان سعد ی''کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ان کا ترجمہ اپنے زمانے میں اردو کا بہترین نمونہ ہے۔''گلستاں''میں جابجا بر محل اشعار کثرت سے ملتے ہیں ،لیکن ان کا اردو ترجمہ کرنے پر ان کا حسن باقی نہیں رہتا۔ان میں سے بہت سے ایسے مصرعے ہیں جو خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے ہیں،ان کا ترجمہ کرنا ان کی اہمیت کو مجروح کرنا تھا لہٰذا افسوس نے انہیں جوں کا توں لکھ دیا ہے۔ان کی زبان میں سلاست اور صفائی ہے اور عربی فارسی الفاظ کے استعمال میں یہ حیدری سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔افسوس نے''گلستاں'' کی حکایتوں کا ترجمہ کر کے ''باغ اردو'' کے نام سے شائع کیا۔اس ترجمے کا آغاز 1800ء میں ہوا اور1802ء میں مکمل ہوا۔1803ء میں ہندوستانی مصنفین کی کتب پر انعام کی سفارش ہوئی اور ''باغ اردو'' پر چار سو روپئے کا انعام ملا۔

''آرائش محفل'' کا ذکر اس سے قبل حیدربخش حیدری کے حوالے سے آ چکا ہے۔فورٹ ولیم کالج میں اس نام سے دو کتابیں لکھی گئیں۔دوسری کتاب شیر علی افسوس کی ''آرائش محفل''(1805ء) ہے جو ہندوستان کی ایک معتبر و مستند تاریخ ''خلاصۃ التواریخ'' کا اردو ترجمہ ہے۔اصل کتاب کے مصنف ''منشی سجان رائے'' پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔آرائش محفل میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کا مفصل حال اور زمانہ قدیم سے لے کر اسلام تک کی جامع اور وسیع تاریخ بیان کی گئی ہے،نیز ہندوستان کے موسم تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کا بیان بھی کیا ہے۔

افسوس ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔انہیں عربی،فارسی،ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں پر بھی کمال حاصل تھا۔ ''آرائش محفل'' کی زبان بالکل سلیس اور صاف ہے اور مروجہ کتابوں کی طرح اس میں مبالغہ آرائی بھی نہیں ہے۔افسوس نے زبان اردو میں اسے اس طرح لکھا ہے کہ جملوں میں دلکشی کے علاوہ انداز بیان بھی دلکش ہو گیا ہے۔وہ دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ کو اردو میں اس طرح کھپا دیتے ہیں کہ اس پر تالیف کا گمان ہونے لگتا ہے۔صنائع لفظی اور معنوی نے بھی

ان کی نثر کی شیرینی میں اضافہ ہوتاہے۔ہندوستانی پھولوں کا ذکر کرتے ہیں تو میر حسن کی مثنوی سامنے آ جاتی ہے۔یہاں نثر مقفع ہے لیکن روانی اور بے تکلفی میں فرق نہیں۔

13.5.4 مرزا علی لطف:

مرزاعلی نام تھا اور لطف تخلص۔دہلی کے رہنے والے تھے۔دہلی کی بر بادی نے دہلی چھوڑ نے پر مجبور کر دیا۔وہ لکھنؤ آئے اس کے بعد پٹنہ گئے اور وہاں سے پھر کلکتہ پہنچ گئے۔گلکرسٹ نے ان سے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔مرزا علی لطف اپنے مایۂ ناز تذکرہ"گلشن ہند" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ان کا ذکر "گلشن بے خار" اور "سخن الشعرا" میں بھی ملتا ہے۔مرزا دہلی میں پیدا ہوئے اور تباہی کے ایک عرصے بعد تک دہلی میں مقیم رہے۔پھر تلاش معاش میں دہلی کو خیر باد کہا اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ان کا ارادہ عظیم آباد ،سے پٹنہ ہوتے ہوئے دکن آنے کا تھا لیکن حسن اتفاق گلکرسٹ سے ملاقات ہو گئی اور ان کی فرمائش پر1801ء میں "تذکرہ گلشن ہند" ترتیب دیا۔

اس تذکرے کا ماخذ نواب علی ابراہیم کافارسی تذکرہ "گلزار ابراہیم " ہے۔لطف نے خود لکھا ہے کہ اس کی سنہ تصنیف1184ء ہے۔جب یہ تذکرہ گلکرسٹ کے سامنے سے گزرا تو خیال آیا کہ اردو شعراء کا یہ تذکرہ اردو میں ترجمہ ہوجائے تو خوب ہو۔لطف نے پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن آسانی کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان فارسی کے بجائے اردو ہے اور لطف نے شعرا کے احوال میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کیا ہے بلکہ تحقیقی نگاہ ڈالی ہے۔لطف نے اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔زبان کی سطح پر یہ تذکرہ بہت کامیاب نہیں ہے۔اس کی زبان مشکل اور پیچیدہ ہے۔عبارت مقفیٰ و مسجع ہے لیکن اس تذکر ہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی تھیں جو اس زمانے کے تذکروں میں عام طور پر نہیں ملتیں۔انھوں نے شعرا کے حالات ہی بیان نہیں کیے بلکہ اس دور کے ماحول اور پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔اس میں انداز بیان گنجلگ اورتعقید سے پرہے۔عبارت مسجع و مقفع ہے۔حالانکہ لطف کو حکم ملاتھاکہ اسے سلیس سادہ زبان میں لکھو تاہم انہوں نے فارسی اور عربی الفاظ کو اس لیے شامل کیا کہ انہیں پڑھ کر لوگ سبحان اللہ کہیں گے۔مؤرخین نے ان کی قافیہ پیمائی اور مقفع مسجع عبارت پر اعتراض کیا ہے۔

13.5.5 میر بہادر علی حسینی:

میر بہادر علی حسینی کالج میں چیف منشی تھے۔1801 ء میں کالج میں آئے۔"باغ و بہار" کے دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میر امن سے پہلے ہی اس کالج میں آئے لیکن ان کا کوئی بھی کارنامہ1802ء سے پہلے کا نہیں ہے۔گلکرسٹ نے ان کی سفارش پر میر امن کا تقرر کیا۔حسینی اپنے نثری کارناموں کے لیے مشہور ہیں۔پھر بھی یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شاعری بھی کی ہوگی۔اخلاق ہندی میں بعض مقامات پر اشعار درج ہیں جو غالباً ان کے ہی ہوں گے ،لیکن وہ اس لائق نہیں کہ ان کو شاعر کی حیثیت سے کوئی مقام دے سکیں،البتہ ان کی چار نثری کتابیں ہیں۔(1)نثر بے نظیر(2)اخلاق

ہندی(3)تاریخ آسام(4)رسالہ ڈاکٹر گلکرسٹ۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے بعض کتابوں کے ترجمے میں گلکرسٹ کی مدد کی۔
بہادر علی حسینی کی سب سے پہلی کتاب ''نثر بے نظیر''اردو کی شہرۂ آفاق مثنوی ''سحر البیان'' کا نثری خلاصہ ہے۔1802ء میں حسینی نے اسے ترتیب دیا اور1803ء میں اسے شائع کیا گیا۔حسینی نثر میں اگلے لوگوں سے سبقت نہ لے جا سکے۔ان کی زبان بظاہر سادہ اور سلیس ہوتی ہے لیکن انہیں روزمرہ کے زبان اور محاوروں کا شعور نہیں ہے اس لیے اس میں دلکشی کا پہلو نظر نہیں آتا۔انہیں مقفع و مسجع نثر لکھنے کا بھی شوق تھا لیکن ان کی نثر میں دلکشی اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ان کی دوسری کتاب ''اخلاق ہندی'' ہے۔یہ بہادر علی حسینی کا سب سے زیادہ مشہور کارنامہ ہے۔یہ گلکرسٹ کی فرمائش پر 1802ء میں لکھی گئی۔اس کی اصل کتاب''ہتو پدیش'' سنسکرت زبان میں لکھی گئی۔فارسی میں اس کے دو ترجمے دستیاب ہیں جن میں ''نگار دانش'' اور ''مفرح القلوب'' کافی مشہور ہیں۔''اخلاق ہندی'' کا ایک طویل حصہ پہلے ہی ڈاکٹر گلکرسٹ کی ''بیاض ہندی''میں شائع ہو چکا تھا۔جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ حسینی کا طرز بیان بالکل سادہ اور بے لطف ہے۔اس میں کوئی خاص دلکشی نہیں۔وہ مسلسل فقرے لکھتے چلے جاتے ہیں اور قاری ان سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ان کی نثر میں نہ تو عربی الفاظ کی کثرت ہے اور نہ ہندی الفاظ کی بھرمار،ان کی نثر سادہ ہے، لیکن اس میں ایک پھیکا پن ہے۔اس کے علاوہ زبان میں فرسودگی بھی پائی جاتی ہے۔وہ قواعد پر اچھی گرفت رکھتے ہیں جو ان کی نثر کو مزید بوجھل بنانے کا ایک سبب ہے۔وہ میرامن اور شیر علی افسوس کی طرح نثر کی روح تک نہیں پہنچ پاتے۔

اس کے علاوہ بہادر علی حسینی نے''تاریخ آسام'' بھی لکھی۔اس کا ماخذ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تصنیف ''تاریخ آسام'' کا اردو ترجمہ ہے۔اس کتاب میں اورنگ زیب عالم گیر کے سپہ سالار میر جملہ کی مہم کی تفصیلی تاریخ ہے۔یہ ترجمہ اب ناپید ہے اس لیے اس کی نثر کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔اس کے علاوہ حسینی نے ''قواعد زبان اردو'' بھی لکھی جو ''رسالہ گلکرسٹ'' کے نام سے مشہور ہے۔یہ دراصل گلکرسٹ کی کتاب ''ہندوستانی کی صرف نحو'' کا خلاصہ ہے۔گلکرسٹ کی کتاب کی ضخامت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی تلخیص لکھنے کی فرمائش کی گئی جسے حسینی نے علمی جامہ پہنایا۔

13.5.6 مظہر علی خاں ولاؔ:

مظہر علی خاں نام اور ولا تخلص تھا۔ممنونؔ مرزا جان طپشؔ اور مصحفی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔1802 ء میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اور لگ بھگ سات کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن چند کتابیں ہی شائع ہو سکیں۔مظہر علی خاں ولانے مادھو نل اور بیتال پچیسی،ہفت گلشن اور پند نامہ سعدی شیرازی کااردو میں ترجمہ کیا،لیکن ان کی شہرت تاریخ شیر شاہی سے ہوئی۔یہ تاریخ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے عباس خاں شیروانی نے لکھی تھی۔بیتال پچیسی کے ترجمے میں ولاؔ کے ساتھ للو لال اور تارنی چرن متر بھی شامل تھے۔اصل کتاب سنسکرت سے برج

بھاشا میں ترجمہ کی گئی۔اس کتاب میں پچیس کہانیاں ہیں جو ایک بیتال نے بکرماجیت کو سنائی تھیں۔کتاب میں نصیحتوں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ناصحانہ انداز قاری کو نہیں کھٹکتا،البتہ کچھ کہانیوں میں ناصحانہ انداز کہانی کی دلکشی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ہندی الفاظ کا کثیر استعمال نثر کو گراں بار بنا دیتا ہے۔اگر ہندی الفاظ میں تناسب کا خیال رکھا جاتا تو کتاب کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا۔مظہر علی خاں نے فورٹ ولیم کالج میں درج ذیل کتابوں کا اضافہ کیا ہے:

1۔ مادھونل کام کندلا : یہ کتاب ہندی سے اردو میں نقل کی گئی ہے۔یہ ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کندلا کی داستان عشق ہے۔

2۔ ترجمہ کریما : سعدی شیرازی کے مشہور پند نامہ "کریما"کو ولاؔنے اردو میں منظوم کیا۔

3۔ ہفت گلشن : ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کو اردومیں منتقل کیا۔اس میں تہذیب واخلاق کے قاعدے ، نصیحت آموز کہانیاں اور حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔

4۔ اخلاق ہندی : اس میں اخلاقی حکایات ملتی ہیں۔

5۔ بیتال پچیسی : یہ ولاؔ کا مشہور کارنامہ ہے۔یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔برج بھاشامیں اس کا ترجمہ ہوا۔برج بھاشاسے ولا نے اردو میں منتقل کیا۔

6۔ تاریخ شیر شاہی : یہ شیر شاہ سوری کے عہد کی تاریخ ہے۔

7۔ جہانگیر نامہ : تزک جہانگیر کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔

13.5.7 میر کاظم علی جوانؔ:

میر کاظم علی نام اور جوان تخلص تھا۔فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں تھے۔دہلی کے رہنے والے تھے۔دہلی کی تباہی کے بعد مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔کرنل اسکاٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تالیف و تصنیف سے وابستہ ہوئے۔انہیں اردو،فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں پر قدرت تھی۔ان کی سب سے مشہور کتاب "شکنتلا" ہے۔1802ء میں للو لال جی کی مدد سے سنگھاسن بتیسی بھی مرتب کیا۔ان کا اسلوب سادہ اور عبارت میں دلکشی پائی جاتی ہے،لیکن کہیں کہیں بھاشا کے الفاظ کی تعداد زیادہ ہی نہیں بلکہ غیر مانوس اور مشکل الفاظ اردو عبارت میں کھٹکنے لگتے ہیں۔ان کی مشہور کتاب "شکنتلا" کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔یہ کہانی مہابھارت کی طرز پر لکھی گئی۔پہلے اس کو کالی داس نے برج بھاشا میں لکھا اور اسی کو سامنے رکھ کر جوان نے اردو نثر کا جامہ پہنایا۔انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔اس ترجمہ میں اور بھی منشی شامل تھے۔یہ ترجمہ 1804ء میں مکمل ہوا۔اس پر انہیں پانچ سو روپئے انعام کا اعلان ہوا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باقی منشیوں کے مقابلے میں ان کادخل کتنا زیادہ تھا۔اس کے علاوہ ایک مثنوی "بارہ ماسہ یاد ستور ہند" کے نام سے لکھی جس میں سال کے بارہ مہینوں میں ہندو اور مسلمانوں کے تہواروں کی ساری تفصیل جزئیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔"تاریخ فرشتہ " کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ بھی کیا جس میں سلاطین بہمنی کا ذکر ملتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے شعرائے اردو کے کلام کے انتخاب کا کام دوسرے مولفین کے ساتھ انجام دیا اور کئی کتابوں کی ترتیب واشاعت میں بھی حصہ لیا۔

13.5.8 نہال چند لاہوری:

نہال چند لاہوری فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور منشی تھے۔ان کے آباواجداددہلی کے رہنے والے تھے۔دہلی کی تباہی کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی۔ایک انگریز کپتان کے وسیلے سے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ہاں پہنچے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں انہیں ملازم رکھ لیا گیا۔

کالج میں نہال چند لاہوری کا نام "مذہب عشق" کی وجہ سے مشہور ہوا۔گل کرسٹ کی فرمائش پر "تاج الملوک" کو نثر کا جامہ پہنایا اور تاریخی نام "مذہب عشق" رکھا۔اس کا ماخذ عزت اللہ بنگالی کا قصہ تاج الملوک اور گل بکاولی بتایا جاتا ہے۔1803ء میں ترجمہ مکمل ہوا اور 1804ء میں اسے شائع کیا گیا۔اسی قصے کو دیا شنکر نسیم نے نظم میں باندھا۔نہال چند لاہوری نے اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے،تکرار لفظی کو بھی ترک نہیں کیا۔ترجمہ اصل سے قریب ہونے کی وجہ سے سلیس اور رواں نہیں ہے۔تمام کتاب پر فارسی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

13.6 کالج کے دیگر مصنفین

گزشتہ صفحات پر ہم نے فورٹ ولیم کالج کے ان مصنفین اور مترجمین کے بارے میں پڑھا جن کے بغیر کالج کی تاریخ ادھوری ہے۔اُن مشاہیر کی تصنیف و تالیف میں جن اہل قلم نے مدد کی ان کو کالج کے دیگر مصنفین کی فہرست میں رکھا جا رہا ہے۔یہاں ہم ان کی خدمات پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

مولوی اکرام علی1800ء میں کالج سے وابستہ ہوئے۔ان کی کوئی بھی تخلیق یا ترجمہ سامنے نہیں آسکا۔ان سے محض ایک کتاب "اخوان الصفا" منسوب ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ ہے۔یہ داستان امیر حمزہ کے بعد سب سے ضخیم کتاب ہے۔اخلاق اور پند و نصائح کے خشک موضوع اور عربی جیسی وسیع زبان سے ترجمہ کرنا مولوی اکرام علی کا ہی کام تھا۔اس ترجمہ میں نہ صرف آزادی سے کام لیا گیا بلکہ اصل کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

للو لال جی1801ء میں کالج میں ملازم ہوئے۔کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولا ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔انہوں نے ساتھ مل کر کئی تراجم بھی کیے۔کاظم علی جوان کے ساتھ مل کر انہوں نے "شکنتلا" ناٹک کا ترجمہ کیا،وہ بیتال پچیسی کے ترجمے میں بھی شریک رہے۔"لطائف ہندی" ان کی مشہور ترین تصنیف ہے۔اس میں دلچسپ قصے کہانیاں، کہاوتیں،لطائف اور امثال وغیرہ شامل ہیں۔یہ کتاب ہندی اور اردو دنوں زبانوں میں طبع ہوئی۔کتاب کے آخر میں ہندی اور اردو زبانوں کی فرہنگ بھی ہے۔

ان مصنیفین اور مترجمین کے علاوہ بنی نرائن جہاں نے تذکرہ "دیوان جہاں" اور ایک عشقیہ قصہ "چار گلشن"

لکھا۔ مولوی حفیظ الدین نے "عیار دانش" کا ترجمہ "خرد افروز" کے نام سے کیا۔ اس کا ماخذ عربی کی مشہور کتاب "کلیلہ و دمنہ" ہے۔ ملاحسین واعظ کاشفی کے بعد ابو الفضل نے اس کی تلخیص کی اور "خرد افروز" اسی تلخیص کے نصف حصے کا ترجمہ ہے۔اس کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے اور اس کی شہرت کا باعث ہے۔ہندی و فارسی کا امتزاج بھی نثر کو دلکش بناتا ہے،فصاحت کے ساتھ سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ خلیل خاں اشک کا نام "داستان امیر حمزہ" کی وجہ سے زندہ رہے گا۔یہ کتاب اگست1802ء میں شائع ہوئی۔اشک نے لفظی ترجمہ کرتے ہوئے اصل عبارت کو اپنے الفاظ میں سیدھی سادی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ان کے یہاں میر امن کی سادگی ،لطافت اور فصاحت نہیں پائی جاتی لیکن کالج کی نثر کے معیار کے مطابق یہ غیر معیاری نہیں ہے۔ان کی دوسری تصانیف میں "قصہ گلزار چین" یا "نگار خانہ چین" بھی شامل ہے۔یہ داستان بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ منصور علی بھی فورٹ ولیم کالج کے ملازم میں شامل تھے۔انہوں نے محمد عمر کی مثنوی "سیف الملوک" کا ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام "بحر عشق" رکھا۔یہ ترجمہ 1803ء میں مکمل ہوا۔اس میں بول چال کی سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

13.7 کالج کا زوال

ہالٹ میکنزی (Halt Mackenzie)وہ پہلا شخص تھا جس نے کالج کے وجود پر سوالیہ نشان لگایا۔1835ء میں جب وہ کالج کونسل کا صدر بنا تو اس نے ممبران کے درمیان پہلی بار یہ شبہ ظاہر کیا کہ کالج اپنے مقاصد کی تکمیل میں کھرا نہیں اتر رہا ہے۔اس نے ویلزلی کے منصوبے پر تنقید کی اور نئے تعلیمی نظام کی پر زور حمایت کی۔

یکم اگست 1828 کو ولیم بنٹک نے کالج بند کرنے کے سلسلے میں میکنزی کی حمایت کی،اس کے باوجود ہندی کے پروفیسر کیپٹن پرائس نے 22/مارچ 1830 کو اس کے اس فیصلے کے خلاف لکھا لیکن4/مئی1830 کو نئے تعلیمی منصوبہ سرکاری طور پر منظور کر لیا گیا۔یکم مارچ 1831ء کو کالج کی کونسل کر منسوخ کر کے کتابیں ایسیاٹک سوسائٹی لائبریری کو منتقل کر دی گئیں۔1835ء میں اس نے رائٹرس بلڈنگ کے دروازے پر تالا ڈال کر کالج کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔1854ء میں لارڈ ڈلہوزی کی رپورٹ پر گورنر جنرل نے اس کالج کے خاتمے کا سرکاری حکم جاری کیا۔

13.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- فورٹ ولیم کالج10/جولائی 1800 کو کلکتہ میں قائم ہوا۔
- فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد نو وارد انگریز عہدے داروں کو ہندوستانی زبان اور یہاں کے طور طریقوں سے روشناس کرنا تھا۔

- ہندوستانی عوام پر حکومت کرنے کے لیے یہاں کے باشندوں کے رسم و رواج اورتہذیب و ثقافت سے واقفیت درکار تھی لہٰذا اس کے لیے داستان اور کہانیاں سب سے بہترین ذریعہ تھیں۔
- اس ادارہ سے اردو نثر کو بے حد فائدہ پہنچااور بہت سے فارسی عربی اور دیگر زبانوں کے قصے کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا، جس سے اردو کے ادبی سرمائے میں وسعت پیدا ہوئی۔
- اردو نثر میں اس وقت جو کتابیں تھیں ان کی زبان بہت مشکل تھی۔ چند کتابیں جو سادہ نثر میں تھیں وہ مذہبی رسالے تھے ،جو مذہب اسلام کے مسائل اور عقائد کی توضیح و تشریح کے لیے لکھے گئے تھے۔اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ نے ملک کے ہر حصے سے ادیبوں کو جمع کر کے کتابوں کو ترجمہ وتالیف کروایا۔
- فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین میں میرامن ‘ سید حیدر بخش حیدری ‘ میر شیر علی افسوس‘ مرزاعلی لطف ‘ میر بہادر علی حسینی ،مظہر علی خاں ولا ‘ میر کاظم علی جوان اور نہال چند لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں۔
- فورٹ ولیم کالج کا سب سے بڑا کار نامہ یہ ہے کہ اس نے ارددو نثر کو سادہ ‘ سلیس اور ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کے قابل بنایا۔اسی کالج کی خدمات کی بدولت ہی غالب نے اردو کو اس قابل بنایا کہ وہ مراسلہ اور مکالمہ میں بھی سلاست اور روانی کو برقرار رکھ سکے۔

13.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مسلط	:	قبضہ کرنا
تصانیف	:	تصنیف کی جمع
ثقافت	:	تہذیب ‘ کلچر
تدوین	:	مرتب کرنا
تالیف	:	مختلف کتابوں سے مضامین چن کر پیرا ئے میں ترتیب دینا
بادی النظر میں	:	سرسری نظر میں، ابتدائی نظر میں
فاضل فرزانہ	:	زیادہ پڑھا ہوا، عاقل
بلدہ	:	شہر، نگر، قصبہ
تفوق	:	برتری، بڑائی، ترجیح
عرق ریزی	:	کمال محنت، نہایت ہی جانفشانی
علوم عقلیہ	:	وہ علوم جن میں موجودات کے تصور سے بحث کی جاتی ہے(سائنس، فلسفہ)

علوم نقلیہ : وہ علم جو عقل کے بجائے نقل یا بیان کی ہوئی باتوں سے بحث کرتا ہے

اطبا : طبیب کی جمع، بہت سے حکیم

باریاب : رسائی پانے والا، کامیاب، موثر

فصیح البیان : خوش بیان، شیریں کلام، جس کے بیان میں سلاست اور روانی ہو

بزرگانِ سلف : گزرے ہوئے نیک آبا و اجداد، برگزیدہ لوگ

ید طولیٰ : خدا تعالیٰ کی قدرت، طاقت

فارغ التحصیل : حصول تعلیم یا تربیت سے فارغ، تعلیم حاصل کیا ہوا

13.10 نمونۂ امتحانی سوالات

13.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ ولیم کالج میں میر امن نے کتنی کتابیں لکھیں؟

(a) پانچ (b) چار (c) دو (d) تین

2۔ سید حیدر بخش حیدری کی سب سے پہلی کتاب کون سی ہے؟

(a) قصہ مہر وماہ (b) قصہ لیلیٰ مجنوں (c) آرائش محفل (d) ہفت پیکر

3۔ میر شیر علی افسوس کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) کلکتہ (b) دہلی (c) بنارس (d) علی گڑھ

4۔ "نثر بے نظیر" کے مصنف کون ہیں؟

(a) میر امن (b) شیر علی افسوس (c) بہادر علی حسینی (d) مرزا علی لطف

5۔ فورٹ ولیم کالج کب قائم کیا گیا؟

(a) 1800 (b) 1825 (c) 1850 (d) 1860

6۔ گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج میں کس زبان کے پروفیسر تھے؟

(a) اردو (b) فارسی (c) انگریزی (d) عربی

7۔ ذیل کی کون سی کتاب جان گل کرسٹ کی نہیں ہے؟

(a) بیاض ہندی (b) مشرقی قصے (c) لطائف ہندی (d) رہنمائے اردو

8۔ "آرائش محفل" کب شائع ہوئی؟

(a) 1803 (b) 1805 (c) 1807 (d) 1809

9۔ "گلستان سعدی" کا اردو ترجمہ "باغ اردو" کے عنوان سے کس نے کیا؟

(a) میر امن　(b) حیدر بخش حیدری　(c) میر شیر علی افسوس　(d) مرزا علی لطف

10۔ فورٹ ولیم کالج کو کس سنہ میں بند کیا گیا؟

(a) 1835　(b) 1854　(c) 1830　(d) 1820

13.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ میر امن اور باغ و بہار کی اردو نثر میں کیا اہمیت ہے؟

2۔ سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس نے اردو ادب کی کیا خدمات انجام دیں؟

3۔ میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

4۔ میر بہادر علی حسینی اور کاظم علی جوان پر نوٹ لکھیے۔

5۔ فورٹ ولیم کالج کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔

13.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد اور اس کالج کے نصاب پر روشنی ڈالیے۔

2۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اردو کے دوسرے پروفیسران کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

13.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات　ڈاکٹر عبیدہ بیگم

2۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد　ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی

3۔ میر امن سے عبد الحق تک　ڈاکٹر سید عبد اللہ

13.10.1 کے جوابات:　1۔d　2۔a　3۔b　4۔c　5۔a

6۔a　7۔c　8۔a　9۔c　10۔b

اکائی 14: دہلی کالج، جامعہ عثمانیہ

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 دہلی کالج کا قیام
14.2.1 اردو ذریعہ تعلیم
14.2.2 شعبہ جات
14.2.3 کالج کے پرنسپل
14.2.3.1 مسٹر جوزف ہنری ٹیلر
14.2.3.2 مسٹر فلیکس بترو
14.2.3.3 ڈاکٹر الواس اشپر نگر
14.2.4 کالج کے اساتذہ
14.2.4.1 مولوی مملوک علی نانوتوی
14.2.4.2 امام بخش صہبائی
14.2.4.3 ماسٹر رام چندر
14.2.4.4 منشی ذکاءاللہ
14.2.4.5 مولوی سبحان بخش
14.2.4.6 مولوی ضیاءالدین
14.2.5 کالج کے نمایاں طلبا
14.2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد
14.2.5.2 مولوی محمد حسین آزاد
14.2.5.3 پنڈت موتی لال بسمل
14.2.5.4 مولوی قاسم نانوتوی

14.2.5.5 مولوی کریم الدین پانی پتی

14.2.6 ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

14.2.6.1 ترجمہ شدہ کتابیں

14.3 جامعہ عثمانیہ

14.3.1 جامعہ عثمانیہ سے قبل

14.3.2 جامعہ عثمانیہ کی تحریک

14.3.3 جامعہ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر

14.3.4 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں

14.4 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی تدریس اور عمارتیں

14.4.1 آرٹس کالج کی عمارت

14.4.2 جامعہ عثمانیہ کے شعبہ جات

14.4.3 آرٹس، سائنس اور قانون کے شعبہ جات

14.4.4 میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تعلیمات کے شعبہ جات

14.4.5 یونیورسٹی سے کالجوں کا الحاق

14.5 نصابات کی تدوین

14.5.1 دارالترجمہ کی کارکردگی

14.5.2 دارالترجمہ کی اصطلاحات کمیٹی

14.5.3 دارالترجمہ کے ناظم اور مترجمین

14.6 ضمیمہ جات

الف: جامعہ عثمانیہ کے چانسلرس (پولیس ایکشن سے قبل) ج: دارالترجمہ کے نظما (خاتمہ تک)

ب: جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس د: دارالترجمہ کے چند اہم مترجمین

14.7 اکتسابی نتائج

14.8 کلیدی الفاظ

14.9 نمونۂ امتحانی سوالات

14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

ہندوستان میں مغربی قوموں بالخصوص انگریزوں کی آمد کے بعد تین اہم تعلیمی اداروں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ان میں تاریخی اعتبار سے فورٹ سینٹ جارج کالج پہلا جب کہ دہلی کالج آخری ہے۔ ان کے مقاصد، خدمات اور اثرات جداگانہ ہیں۔ ہم اردو والے سب سے زیادہ فورٹ ولیم کالج سے واقف ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں اول یہ کہ اس کالج پر نسبتاً زیادہ لکھا گیا دوم یہ کہ اس کالج کی خدمات کا بیشتر حصہ داستانوی ادب پر مشتمل ہے۔ حالانکہ سائنسی علوم افادیت پسندی، معاشی فلاح، سماجی اصلاح، اور فکری تنوع کے اعتبار سے دہلی کالج کا مقام بڑھا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد نووارد انگریز افسران کو ہندوستانی زبان سے روشناس کرانا جب کہ سینٹ جارج کالج کا مقصد ججوں، منشیوں اور وکیلوں کو تربیت دینا تھا مگر دہلی کالج صرف اور صرف ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا اردو ذریعہ تعلیم کا ادارہ تھا اور زبان و ادب کے علاوہ اردو میں دیگر علوم کے فروغ کے لیے ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست حیدرآباد کے ساتویں فرماں رواں نواب میر عثمان علی خان کا اہم کارنامہ رہا کہ انہوں نے اپنی ریاست کی اردو زبان کو ترقی دیتے ہوئے پہلی اردو کی یونیورسٹی "جامعہ عثمانیہ" کا قیام عمل میں لایا۔ اس جامعہ میں تمام علوم و فنون کے علاوہ سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون کی تعلیم کے لیے اردو نصابات کا آغاز کیا گیا اور مقامی سطح پر مشہور طباعت کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی کی سائنس و ٹکنالوجی کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کا آغاز کیا گیا۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے تمام نصابات کی تکمیل کے لیے "دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ" کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کے ذریعے عمدہ اور نایاب کتابیں ترجمہ کی گئیں جو جامعہ عثمانیہ کے معیاری نصاب کا ذریعہ بنتی رہیں، جس کی وجہ سے ہندوستان کی پہلی ہندوستانی زبان کی یونیورسٹی اور اردو ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کی وجہ سے ساری دنیا میں جامعہ عثمانیہ کا اپنا امتیاز قائم ہو گیا۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- دہلی قالج کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالی سکیں۔
- اردو زبان و ادب و دیگر علوم کے فروغ کے لیے دہلی کالج کی اہمیت پر روشنی ڈال سکیں۔
- کالج کے پرنسپل، اساتذہ اور اس کے نمایاں طلبا کی خدمات بیان کر سکیں۔
- ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے مقاصد کو بیان کر سکیں۔
- جامعہ عثمانیہ سے قبل اور اس کے بعد کی تاریخ پر روشنی ڈال سکیں۔

- جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کی ابتدائی جماعتوں کے بارے میں تفصیلات بیان کر سکیں۔
- جامعہ عثمانیہ کی تدریس اور اس کی مختلف عمارتوں کا حال بیان کر سکیں۔

14.2 دہلی کالج کا قیام

نو آبادیاتی نظریات کی حامل یوروپی استعماری طاقتوں نے صدیوں قبل مشرق اور مشرق بعید کے ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ تجارت کی آڑ میں ان کی کمپنیوں نے کیا۔ بالآخر جس کمپنی کے ہاتھ جو ملک آیا وہ کمپنی کی نو آبادیات یا دوسرے لفظوں میں غلام بن گیا۔ چنانچہ بڑے تصادم کے بعد ہندوستان، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصے میں آگیا جس نے تجارت کے ساتھ ساتھ اقتدار کے لیے بھی راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔ 1757 سے 1857 کے درمیانی سو سالوں میں وہ یہ کام منظم انداز اور شاطرانہ چالوں سے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کمپنی ہر پر محاذ پر کامیاب ہوتی چلی گئی۔ اس کے کیا اسباب تھے وہ آپ تاریخ میں پڑھیں گے البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ ہر ملک اور ہر عہد کا سیاسی نظام کے ساتھ ایک تعلیمی نظام بھی ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں بھی صدیوں سے ایک تعلیمی نظام رائج تھا۔ یہ تعلیم مدرسوں اور پاٹھ شالائوں میں دی جاتی تھی۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی تو تعلیمی نظام سے وہ کیسے غافل رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ صدیوں سے مروج طرز تعلیم اور تعلیم گاہوں کو کچھ عرصہ تک اس نے برداشت کیا۔ کیوں کہ کمپنی میں اس تعلیم کی ہمنوائی کرنے والوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود تھی۔ بالآخر لارڈ میکالے کے انتہائی سخت موقف نے یوروپی طرز کی جدید تعلیم کے لیے راہ ہموار کر دیا۔

1813ء کے چارٹر ایکٹ میں کمپنی نے تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپیہ مختص کیے تھے مگر دس برسوں تک اسے خرچ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ آگے چل کر 1823ء میں دس افراد پر مشتمل ایک "جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن" تشکیل دے کر اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس رقم کو تعلیم کے مد پر خرچ کرے۔ کمیٹی نے سب سے پہلے ہندوستان کے مدارس کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک سرکلر جاری کیا۔ مسٹر جے ایچ ٹیلر کو دہلی کے لیے منتخب کیا جنہوں نے بڑی سرگرمی سے دہلی کے مشرقی اداروں یعنی مدارس کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کی۔ منجملہ دیگر امور کے مسٹر ٹیلر نے مدرسوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کالج کے قیام کی تجویز کمیٹی کے سامنے رکھیں جس پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ ظاہر ہے کالج کے لیے عمارت کا ہونا ضروری ہے جس کی تعمیر کے لئے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ اس مسئلہ کا حل بھی تلاش کر لیا گیا یعنی مدرسہ غازی الدین حیدر کی پر شکوہ عمارت کو کمیٹی نے حاصل کر لیا اور 1825ء میں اس مدرسہ کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔

14.2.1 اردو ذریعہ تعلیم:

1835 میں لارڈ ولیم بینٹنگ کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے بعد پورے ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو لازمی قرار دے دیا گیا مگر دہلی کالج کی یہ خصوصیت تھی کہ ذریعہ تعلیم اردو تھا یعنی تمام علوم جو داخلِ نصاب تھے وہ اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ یہ ایک مشکل مگر کامیاب تجربہ تھا جسے ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ترجمہ کے ذریعے حل کر لیا گیا۔ دہلی کالج میں اردو کو

ذریعۂ تعلیم رکھنے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طلبا محنت اور شوق سے سائنسی اور سماجی علوم پڑھتے تھے۔ نیز طلبا میں ذہنی بیداری، ملکی اور غیر ملکی حالات سے آگاہی میں اضافہ ہوا۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ پورے ملک میں جب تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو نافذ کر دیا گیا تو دہلی کالج ہی وہ ادارہ تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی جس کی تعریف 1853 کی جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی رپورٹ میں اس طرح درج ہے۔

> ”اردو کے ذریعہ سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی مسٹر مواٹ نے بہت تعریف کی ہے۔ ہز آنر ایسی تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں۔“

اسی سال (1853) ناظم تعلیمات بنگال نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

> ”ایک مدت سے دہلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبہ جات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور یہ خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بتر و نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اشپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دے دیا جائے۔“

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کالج تجربہ اور نتائج کے اعتبار سے مقبول ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ طلباء کے تقرر ات بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے جو اس بات کا غماز ہے کہ کالج کا معیار بلند تھا یقیناً اسے لائق اور فائق اساتذہ کی خدمات بھی حاصل رہی ہیں۔ دہلی کالج کے خطوط ہی پر چل کر سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

14.2.2 شعبۂ جات:

1825 میں دہلی کالج مدرسہ غازی الدین حیدر کی عمارت میں قائم کیا گیا جو مشرقی علوم کی درس گاہ تھی اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں البتہ مسٹر ٹیلر کی رپورٹ کے مطابق 1824ء میں نو طالب علم اور ایک استاد مولوی عبد اللہ تھے۔ جب دہلی کالج وجود میں آ گیا تو مشرقی شعبہ کو برقرار رکھتے ہوئے 1828ء انگریزی شعبہ کو عمل میں لایا گیا۔

مشرقی شعبہ میں فارسی اور عربی کے درجات تھے جس میں دونوں زبانوں کی قواعد، صرف و نحو، نثر و نظم، حدیث، فقہ، ریاضی و تاریخ، منطق و فلسفہ، جغرافیہ و سائنس اور قانون سیاست وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جبکہ شعبۂ انگریزی میں حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، عربی و فارسی زبان و ادب کو چھوڑ کر وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے تھے جو مشرقی صوبہ میں زیر نصاب تھے البتہ اضافی طور پر انگریزی زبان و

ادب شامل نصاب تھا۔

آغاز میں تمام طلباء کو وظائف دیے جاتے تھے 1831 میں ایک رپورٹ پیش کی گئی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دہلی کا کوئی باشندہ تعلیم کی اجرت دینے پر آمادہ نہیں ہو گا خواہ وہ انگریزی شعبہ میں پڑھتا ہوں یا مشرقی شعبہ میں۔ چنانچہ کئی سال تک طلباء سے فیس نہیں لی گئی آگے چل کر انگریزی شعبہ کے طلباء سے فیس لینے کی ابتدا ہوئی، جس کا اطلاق رفتہ رفتہ مشرقی شعبوں پر بھی کیا گیا۔ تعلیمی رپورٹ اور طلبا کی لیاقت کا سال بہ سال جائزہ لینے کے بعد کالج کی انتظامیہ نے ایک بڑا قدم یہ اٹھایا کی دونوں شعبوں کے نصاب تعلیم کو یکساں کر دیا جائے اس کے بعد 1844ء میں مشرقی اور انگریزی شعبوں کو ضم بھی کر دیا گیا۔

14.2.3 کالج کے پرنسپل:

کالج قائم کیا گیا تو انتظامی امور کی نگرانی کے لیے ایک مجلس مقامی (Local Comittee) کی تشکیل عمل میں آئی۔ مزید بر آں کالج کی سالانہ رپورٹ صوابدید اور منظوری کے لیے صدر مجلس تعلیمات عامہ (General Comittee of public Instruction) کو بھیجی جاتی تھی جو کہ احاطۂ بنگال کی درسگاہوں کی نگراں تھی۔ اس وقت دہلی بھی احاطہ بنگال کا حصہ تھا مگر 1843ء میں دہلی کے تعلیمی اداروں کی نگرانی مغربی و شمالی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ نصاب کی جزوی تبدیلی بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری کے بغیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ بہر حال کالج کی اصل کمیٹی یعنی مجلس مقامی نے تجویز پیش کی کہ کالج کا ایک پرنسپل مقرر کیا جائے جو اپنا بیشتر وقت کالج کے فرائض انجام دینے میں صرف کرے ساتھ ہی مجلس مقامی کے سکریٹری کی خدمات بھی انجام دے۔ مجلس مقامی کے پہلے سکریٹری مسٹر جوزف ہنری ٹیلر تھے لہذا کالج کا پہلا پرنسپل انھیں کو بنایا گیا۔

14.2.3.1 مسٹر جوزف ہنری ٹیلر:

1836ء مسٹر جوزف ہنری ٹیلر کو کالج کا پہلا پرنسپل بنایا گیا۔ 1841ء تک وہ اس عہدہ پر بر قرار رہے۔ دوسری معیاد کے لیے 1843ء سے 1850ء کے درمیانی عرصہ میں تین سال تک پرنسپل رہے۔ پھر تیسری مرتبہ 1854ء سے 1857ء میں اپنی وفات تک وہ پرنسپل رہے۔ 1857ء کے قیامت خیز ہنگامہ کی زد میں مسٹر ٹیلر بھی آگئے اور انھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

1824ء سے 1857ء تک مسٹر ٹیلر کا دہلی کالج سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا۔ اس طرح 33 برس لگاتار انہوں نے دہلی کالج کی خدمت کی۔ مرزا اسد اللہ خان غالب کو انہوں نے دہلی کالج میں بحیثیت استاد تقرر کرنا چاہا مگر مرزا نوشہ کب نوکر (سرکاری ملازم) بننا چاہتے۔ مسٹر ٹیلر نے بغیر کسی مخالفت کے بہت سی اصلاحات کیں اور کالج کو ترقی کے درجے تک پہنچایا۔ منشی ذکاء اللہ کے سوانح نگار سی سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F. Andrews) کا کہنا ہے کی کالج کے اساتذہ اور طلبا مسٹر ٹیلر سے بہت متاثر تھے دراصل وہ طلبا پر بڑی شفقت کرتے اور انھیں اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کا یہ رویہ ہی تھا کہ کالج سے تاریخ ساز شخصیتوں نے جنم لیا۔

14.2.3.2 مسٹر فلیکس بترو:

مسٹر فلیکس بترو نے 1841ء میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ وہ کم عمری میں اپنے وطن فرانس سے ہندوستان آگئے تھے اس لئے اردو

زبان پر دسترس حاصل کرلی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مشرقی شعبے میں مغربی علوم کی ترویج ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن تھا جب مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ ورناٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس سوسائٹی کی ترقی اور کتابوں کے ترجمے کے لئے مسٹر بتر و نے جس مستعدی اور خلوص کا مظاہرہ کیا وہ تاریخِ ادب کا ایک حصہ ہے۔ مشرقی شعبے کو انہوں نے انگریزی شعبے کے برابر لا کر کھڑا کیا۔

مشہور فرانسیسی اسکالر گارساں دتاسی کا کہنا ہے کہ مسٹر بتر و نے فارسی کے بجائے ہندوستانی (اردو) کو رواج دینے کے لئے راستہ ہموار کیا۔ نیز ہندوستانیوں کو نثر لکھنے کا شوق دلایا ورنہ عام طور پر یہ دستور تھا کہ صرف شعر وشاعری سے شغف اور اسی کا چرچا تھا۔

مسٹر فلیکس بترو دہلی کالج کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کمیشن کے سکریٹری بھی تھے۔ جس کے پیش نظر یہ کام تھا کہ طلبا کی ضروتوں اور معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا نصاب تیار کیا جائے کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے ورنہ اس وقت تک اعلیٰ تعلیم عربی، فارسی اور سنسکرت کی وساطت سے دی جاتی تھی۔ اس کمیشن نے تیس اعلیٰ پائے کی کتابیں مختلف موضوعات پر تیار کرائیں۔ مسٹر فلیکس بترو نے خود تین کتابیں تحریر کیں جو قانون، مالیات اور حقوق سے متعلق ہیں۔ 1845ء میں صحت خراب ہونے کے بنا پر وہ اپنے وطن فرانس لوٹ گئے۔

14.2.3.3 ڈاکٹر الواس اشپر نگر:

1845ء میں ڈاکٹر اشپر نگر دہلی کالج کے پرنسپل بن کر آئے۔ اس سے قبل وہ بنگال ملٹری سروس میں اسسٹنٹ سرجن تھے 1847 میں نوابان اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کے لیے انہیں بھیجا گیا۔ 1850ء میں واپسی پر انھیں کالج کا دوبارہ پرنسپل مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر الواس اشپر نگر جس وقت دہلی کالج کے پرنسپل بنائے گئے اس وقت دہلی کالج کی نوعیت پرانے مدرسوں اور نئے کالجوں دونوں سے جدا تھی۔ پرنسپل یوروپین ہوتا تھا جو مشرقی علوم اور اس کے اصولوں سے ناواقف ہوتا تھا اس کے برعکس اکثر اساتذہ ہندوستانی تھے جو مغربی خیالات اور طرز فکر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے ان حالات میں ڈاکٹر اشپر نگر کا کالج پہنچنا اس کے حق میں بے انتہا مفید ثابت ہوا کیونکہ اشپر نگر مشرقی اور اسلامی علوم نیز عربی و اردو زبانوں کے زبردست اسکالر تھے۔ دہلی کالج کو ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی پرنسپل کا عہدہ سنبھالتے ہی اشپر نگر نے کالج کے نصاب میں اصلاح و اضافہ کا کام انجام دیا۔ جو کتابیں بہت ضروری اور نایاب تھیں ان کو مہیا کرایا اور بعض کا ترجمہ اردو میں کرایا۔ طرز تعلیم میں ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے پرانا ڈھانچہ بدل گیا۔ فارسی جماعتوں کے ناقص ہونے کی بہت شکایت تھی اشپر نگر نے اس کا سبب دریافت کر لیا کہ انشا پردازی اور اسلوب نگارش میں متقدمین کی پیروی کی جارہی ہے۔ چنانچہ مطالب کی ادائیگی میں سادگی پر انہوں نے زور دیا۔

ڈاکٹر اشپر نگر نے ایک باتصویر رسالہ کی بنیاد رکھی جس کا نام ”قران السعدین“ تھا۔ اس رسالہ کا مقصد مشرق و مغرب کے فاصلوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ ایک دہے کے اندر اس طرح کے بارہ سے زائد رسالے شائع ہونے لگے۔ ڈاکٹر اشپر نگر کی ایک اہم تصنیف لائف آف محمد ﷺ ہے۔ یہ کتاب کسی بھی یوروپین مصنف کے ذریعہ

اب تک لکھی گئی سیرت کی کتابوں میں ممتاز درجہ رکھتی ہے کیونکہ ڈاکٹر اشپرنگر نے بنیادی مآخذ کا براہ راست مطالعہ کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تنگ نظری اور لغزشیں نہیں پائی جاتیں۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ شاہانِ اودھ کے کتب خانہ کی زمرہ سازی (Cataloguing) انھوں نے تیار کیا۔ تقریباً دس ہزار مخطوطات کا مطالعہ کرکے ہر کتاب اور اس کے مصنف کا مختصر حال لکھا۔ یہ کام انھوں نے لارڈ ہارڈنگ کی ایما پر 1847ء میں شروع کیا جس میں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔

ڈاکٹر اشپرنگر 1857ء میں سبکدوش ہو کر اپنے وطن جرمنی لوٹ گئے اور اپنے ساتھ مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر کے لے گئے جو آج بھی "اشپرنگری ذخیرۂ مشرقیات" کے نام سے برلن کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

14.2.4 کالج کے اساتذہ:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دہلی کالج ایک ایسا ادارہ تھا جہاں باضابطہ تعلیمی نصاب تھا مشرقی اور جدید علوم کے شعبے تھے۔ ذریعۂ تعلیم اردو تھا اس لیے جدید علوم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے ترجمہ کی سوسائٹی بھی تھی۔ ان تمام امور کے پیش نظر یہاں انتہائی قابل اساتذہ کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ جو مختلف علوم وفنون پر کامل دسترس رکھتے تھے ساتھ ہی یہ اساتذہ ذولسان اور کثیر اللسان بھی ہوتے تھے۔ دہلی کالج کے ایسے چند قابل اساتذہ کا ہم یہاں تعارف کرائیں گے۔

14.2.4.1 مولوی مملوک علی نانوتوی:

مولوی مملوک علی نانوتوی مشرقی شعبہ کے صدر تھے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی حدیث، فقہ، علم ہندسہ اور اقلیدس کے عالم تھے۔ مولانا رشید الدین خان اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی وغیرہ سے دہلی میں تعلیم حاصل کی، مملوک علی نانوتوی کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی، مولانا کی بے پناہ علمی استعداد اور تدریسی صلاحیت پر سب کا اتفاق ہے۔ سرسید مرحوم نے "آثار الصنادید" میں ان کا ذکر بڑی عظمت سے کیا ہے۔ مولوی کریم الدین پانی پتی طبقات شعرائے ہند میں رقم طراز ہیں:۔

> "فارسی، اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے ہیں اور جس کام پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہو۔"

(تذکرۂ طبقات شعرائے ہند، مطبع العلوم مدرسہ دہلی، 1848، ص463)

دہلی کالج میں رہتے ہوئے مولوی مملوک علی نانوتوی انگریز دشمنی کی ترجمانی کر رہے تھے۔ جس کا سرا شاہ ولی اللہ سے جا کر ملتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" میں انگریز دشمنی کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے طلباء کی تربیت کی اور تحریک ولی للہی کی فکری قیادت سنبھالنے کے قابل بنا دیا۔ جنھوں نے 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تحریک دیوبند کا منبع بھی دہلی کالج ہی ہے۔

14.2.4.2 امام بخش صہبائی:

امام بخش صہبائی فارسی کے صدر مدرس تھے ان کے علم و فضل کی تعریف متعدد حضرات نے کی ہے۔ گارساں دتاسی کا کہنا ہے کہ یہ قابل مصنف دہلی میں سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں۔ امام بخش صہبائی کے مفتی صدر الدین آزردہ، شیفتہؔ اور غالبؔ سے گہرے مراسم تھے۔ صہبائی تدریس کے ساتھ تصنیف کا کام بھی انجام دیتے رہے، " ترجمہ حدائق البلاغت"" اردو صرف و نحو" اور "شعرائے اردو کا تذکرہ" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

بے چارے امام بخش صہبائی کا انجام بڑا دردناک ہوا۔ 1857ء کی قیامت خیز بلا میں بلا قصور انگریزوں نے انھیں گولیوں کا نشانہ بنایا اور شہید کر دیا۔ منشی صدرالدین آزردہؔ آن کی شہادت کی خبر سن کر تڑپ گئے اور کہا:

کیونکہ آزردہؔ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

14.2.4.3 ماسٹر رام چندر:

دہلی کالج کی ایک مشہور و معروف شخصیت ماسٹر رام چندر کی تھی جو اسی کالج کے طالب علم رہے بعد میں بحیثیت استاد اور مترجم ان کا تقرر ہوا۔ دوران تعلیم ہی ماسٹر رام چندر مضامین لکھتے رہے۔ ریاضی میں آپ کو خاص دلچسپی تھی اس لیے ان کی سترہ (17) کتابوں میں بیشتر ریاضی سے متعلق ہیں۔ ان کی کتاب "رسالہ مسائل کلیات و جزئیات A Treatise on the Problems of Maxima and minima) "اتنی مقبول ہوئی کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر آگسٹن ڈی مارگٹن نے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے شائع کیا اور انعام سے بھی نوازا گیا۔

ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور صحافی بھی تھے۔ اپنے رسالہ "خیر خواہ ہند" (بعد میں اس کا نام محب ہند ہو گیا) کے ذریعہ اردو تنقید کی وہ بنیاد رکھ چکے تھے۔ اردو شاعری پر انھوں نے جو صحت مند تنقید کی ہے ممکن ہے "مقدمہ شعر و شاعری" لکھنے سے قبل الطاف حسین حالی کی اس سے واقفیت رہی ہو۔

14.2.4.4 منشی ذکاءاللہ:

ماسٹر رام چندر کی طرح منشی ذکاء اللہ بھی دہلی کالج کے طالب علم تھے۔ ریاضی، طبعیات، تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کی خدمات کے پیش نظر برطانوی حکومت نے انھیں پندرہ (1500) سو روپیہ کا انعام اور خان بہادر و شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ مختلف علوم فنون پر انھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں لکھیں جن میں صرف ریاضی (Mathemetics) پر ان کی ستاسی (87) کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے سیکڑوں مضامین شائع ہوئے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ باون ہزار صفحات انھوں نے سیاہ کیے ہیں۔

منشی ذکا اللہ کی تصانیف معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن جہاں تک طرز تحریر کا سوال ہے وہ کسی قدر پھیکا ہے۔ شگفتگی اور دلکشی نہیں پائی جاتی۔ مگر اس کی امید بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ریاضی، سائنس اور تاریخی موضوعات میں اس کی گنجائش کم ہی رہتی ہے۔ پھر بھی طرز نگارش سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سلجھا دیتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مختلف علوم و فنون اور موضوعات کی کتابیں اردو میں لکھ کر یا ترجمہ کر کے جدید علوم کی تحصیل کے لیے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے قابل بنایا۔ ان کی مشہور کتابوں میں سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ، آئین قیصری، اقبال نامۂ اکبری، تاریخ ہندوستان اور رسالہ مجالس مناظرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منشی ذکاء اللہ کے جگری دوست سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے انگریزی میں ان کی سوانح عمری (Zakaullah of Delhi) نام سے تحریر کی جس میں موصوف کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

14.2.4.5 مولوی سبحان بخش:

مولوی سبحان بخش دہلی کالج میں عربی اور فارسی کے ایک کامیاب مدرس تھے۔ انھوں نے ترجمہ کا کام بھی کیا ہے۔ "تزک تیموری"، "تاریخ ابن خلکان" اور "تذکرہ مفسرین" کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سب سے اہم کتاب "محاورات ہند" ہے۔

محاورات ہند کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ محاورات کی طرف ابھی تک کسی کا خیال نہیں ہوا۔ اس لیے جمع نہیں کیا گیا اور نہ یہ لکھا گیا کہ لفظ کیا معنی دیتے ہیں اور قائل کی مراد کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> "مجھ کو یہاں کے رواج کے مطابق اور استعمال کے مطابق جتنے (محاورات) میسر ہوئے وہ بہ ترتیب حروف تہجی جمع کر دیے ہیں ور جن میں فحش تھا وہ ترک کر دیے اور واضح ہو کہ ان محاورات میں زبان کے لہجہ کو بہت دخل ہے اور ایک لفظ لہجہ بدلنے سے اور معنی دیتا ہے اور سامع اس کو خوب سمجھتا ہے لیکن مجبوری ہے کہ لہجہ لکھنے میں بالکل نہیں آتا۔"

محاورات ہند کو 1913ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

14.2.4.6 مولوی ضیاء الدین:

مولوی ضیاء الدین کا بھی ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاء اللہ کی طرح دہلی کالج کے طلبا میں شمار ہوتا ہے۔ جن کا تقرر اسی کالج میں ہوا۔ شعبہ عربی کے ممتاز طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ چناچہ 1864ء میں وہ عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں شمس العماء کا خطاب ملا۔ البتہ انھوں نے کوئی قابل قدر تصنیف نہیں چھوڑی۔ تدریس سے ہی شغف تھا۔

مولوی ضیاء الدین کا انجام بھی امام بخش صہبائی کی مانند دردناک ہوا۔ انقلاب 1857ء کو کچلنے کے بعد جب انگریز دہلی میں داخل ہوئے تو وہ اپنے مکان میں موجود تھے۔ قضا آگئی اور مولوی ضیاء الدین بھی گولی کا نشانہ بن کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

14.2.5 کالج کے نمایاں طلبا:

قدیم دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا میدان عمل میں اول درجہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالج کے طلبا کا تقرر ملک کے

مختلف حصوں میں ہوتا تھا۔ جہاں بھی یہ طلبا جاتے عوام و خواص ان کا پر جوش خیر مقدم کرتے ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ انگریز عملداری کے کالجوں میں بحیثیت استاد نیز نوابوں اور راجاؤں کے اتالیق حیثیت سے تقرر حاصل کرتے۔ دفتروں میں ملازم اور مترجم بھی بن کر جاتے۔ ہم عصر اخباروں میں ان حضرات کی مصروفیتوں اور کارناموں کی خبریں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بہر حال کچھ طلبا کا یہاں ذکر کرنا مناسب ہے جن کی خدمات نمایاں ہے۔

14.2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد کے دہلی کالج میں داخلہ کی کہانی مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں تفصیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد نذیر احمد اول پنجاب میں مدرس رہے پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور پہنچے۔ آخر میں حیدرآباد کے نظام سالار جنگ اول نے افسر بندوبست مقرر کیا نیز محکمۂ مال کے ممبر بھی بنایے گئے مگر وقت سے پہلے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کے علمی ماحول سے خوب خوب استفادہ کیا۔ وہ مشرقی علوم کے ماہر اور مفسر قران کے علاوہ اردو ادب کے پہلے ناول نگار بھی ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کے مسائل، ان کی تعلیم، مسلم گھرانے کی اصلاح اور سماجی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا، ایامیٰ اور رویائے صادقہ وغیرہ اسی موضوع پر لکھے گئے ناول ہیں۔ نذیر احمد کا ایک اہم ناول ابن الوقت ہے۔ جس میں انھوں نے اس وقت کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے ناولوں میں انھوں نے معاشرتی برائیوں کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم و تربیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا انداز خطیبانہ ہے مگر اردو میں مقصدی ادب کا نمونہ انھوں نے پیش کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا پلاٹ سادہ ہے۔ ان میں نہ کوئی جدت ہے نہ دلکشی لیکن مکالمے کے وہ بادشاہ ضرور ہیں۔ عورتوں کے لب و لہجے۔ انداز گفتگو اور روزمرہ پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ عام طور پر بیان میں روانی، جوش، شگفتگی، بے ساختگی غرض سبھی کچھ موجود ہے، لیکن اسلوب ناہموار ہے۔ اگر ایک جگہ عربی کے ثقیل الفاظ و محاورات اور اشعار، آیات و حدیث لکھتے ہیں تو دوسری جگہ ٹھیٹھ ہندی کے سادہ اور سلیس الفاظ سے کام لیتے ہیں بہر حال نذیر احمد دہلی کالج کی ایک عہد آور شخصیت تھی جنھوں نے اردو ادب کو نہ صرف مالامال کیا بلکہ ایک صنف ادب کا آغاز بھی انھیں کے ہاتھوں ہوا۔

14.2.5.2 مولوی محمد حسین آزاد:

مولوی محمد حسین آزاد مولوی محمد باقر کے فرزند اور دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے والد کے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' سے منسلک ہو گئے۔ انقلاب 1857ء کے دوران انھوں اس اخبار کو حریت پسندوں کا آرگن بنا دیا۔ انقلاب کو دبانے کے بعد مولوی محمد باقر کو بلا قصور انگریزوں نے شہید کر دیا تو یہ بمشکل جان بچا کر لاہور پہنچے۔ پنڈت منپھول کی کوششوں سے سر رشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ حکومت نے ان سے ''قصص ہند'' اور بچوں کے لیے '' ریڈرس'' لکھوائیں۔ ''آب حیات'' سے مولوی محمد

حسین آزاد کو زیادہ شہرت ملی جس میں ان کا تجر علمی اور اسلوب کی شوخی صاف دکھائی دیتی ہے گرچہ یہ موجودہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتی پھر بھی اس کی بنیادی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ آزاد کی دیگر تصانیف میں ''نیرنگ خیال''، ''سخن دان فارس''، ''دربار اکبری''، ''قند پارسی''، ''نگارستان فارس'' اور ''جانورستان'' وغیرہ مشہور ہیں۔ نیرنگ خیال مضمون اور طرز تحریر دونوں لحاظ سے بہت دلچسپ ہے سخن دان فارس کے ذریعہ آزاد نے اردو والوں کو علم السنہ سے متعارف کرایا اور دربار اکبری کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لارڈ میکالے کی کتاب تاریخ انگلستان کے تتبع میں لکھی گئی۔

مولوی محمد حسین آزاد کی ادبی و علمی زندگی کا سب سے روشن اور نمایاں پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب انھوں نے ڈاکٹر لائٹز کے ساتھ مل کر مئی 1874ء میں انھوں نے انجمن پنجاب لاہور کی بنیاد رکھی اور جدید شاعری کا آغاز کیا انھوں نے اردو ادب کو ایک نئی فکر اور جدید ذہن عطا کیا۔ غزل کے بجائے نظم کی اہمیت پر زور دیا۔ چناچہ 8 مئی 1847ء کو آزاد نے ایک مدلل اور تاریخی تقریر کی جسے تحریک انجمن پنجاب لاہور کا منشور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے وہ تمام بنیادی مقاصد واضح طور پر بیان کر دیے جو آزاد کا مطمح نظر تھے۔ آزاد کا کہنا ہے کہ سادہ جذبات کو اصلی رنگ میں پیش کرنے کے لیے بھاشا کا استعمال ضروری ہے۔ چناچہ بدیسی زبانوں کے بے محابہ استعمال نے اردو کو نقصان پہنچایا ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد نے برج بھاشا کو اردو کی ماں قرار دیا۔ ہر چند کہ یہ نظریہ اب قابل قبول نہیں رہا تاہم آزاد کے اس بنیادی موقف کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا کہ اردو اسی سرزمین کی بولی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کے اس جلسے کے اختتام پر اپنی مشہور نظم ''مثنوی شب قدر'' پڑھ کر سنائی۔ بہر حال اردو کے عناصر خمسہ میں سے ایک مولوی محمد حسین آزاد کا اردو زبان و ادب میں بڑا مقام ہے۔

14.2.5.3 پنڈت موتی لال بسمل:

پنڈت موتی لال بسمل کا دہلی کالج کے ممتاز طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ''قران السعدین'' کے اڈیٹر رہے۔ بعد میں '' بورڈ آف ایڈ مینسٹریشن'' لاہور کے فارسی مترجم اس کے بعد اکسٹرا جوڈیشنل اسسٹنٹ اور آخر میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ پنڈت موتی لال بسمل کو غیر علمی و ادبی مصروفیتوں میں بھی علمی ذوق باقی رہا۔ ''تعلیم نسواں'' اور ''صغر سنی کی شادی'' پر انگریزی میں دو رسالے لکھے۔ ''مسمریزم'' کے موضوع پر دو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں، اردو اور فارسی شعر و ادب سے بھی شغف تھا۔ شاعر تھے۔ بسمل تخلص رکھا۔ زبان سلیس اور شیریں ہے۔ انداز بیان بھی والہانہ ہے۔

14.2.5.4 مولانا محمد قاسم نانوتوی:

دہلی کالج کے تعلیم یافتہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تعلق مشرقی شعبہ کے صدر مولوی مملوک علی نانوتوی کے وطن سے تھا۔ 1844ء میں ان کا داخلہ ہوا اسی سال مشرقی و مغربی شعبوں کو ضم کر دیا گیا۔ چناچہ عربی پڑھنے والے طلبا بھی جدید علوم سے واقف ہو گئے۔ اس کا بھرپور فائدہ مولانا قاسم نانوتوی نے اٹھایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک کی پرزور حمایت کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میرٹھ کے ایک مطبع میں تصحیح کا کام انجام دے رہے تھے کہ انقلاب 1857ء کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس محاذ آرائی میں اپنے رفقا

کے ہمراہ مولانا قاسم محمد نانوتوی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس انقلاب کو چند مہینوں کے اندر ہی انگریزوں نے قابو میں کرنے کے بعد جو ظلم و ستم ڈھایا وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ بہر حال اس طوفان کے تھمنے کے بعد قوم و ملت کے مختلف قائدین اور مصلحین نے اپنے اپنے طور پر فلاح و بہبود کے لیے قدم اٹھائے۔ مولانا قاسم نانوتوی کے اسلامی تشخص اور علوم دینیہ میں ان مسائل کو تلاش کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اتر پردیش کے قصبہ ''دیوبند'' میں 30 مئی 1866ء کو ایک ''ادارہ'' قائم کیا جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ اس کا تعلق اور تعاون حکومت کے بجائے صرف عوام سے ہو۔ جلد ہی اس ادارہ نے دارالعلوم دیوبند'' نام سے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ تعلیم گاہ کی شکل اختیار کرلی۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ڈانڈے دہلی کالج سے جا کر ملتے ہیں۔ مولانا قاسم نانوتوی کے علاوہ دارالعلوم کے تقریباً تمام محرکین مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمن عثمانی اور مولانا منیر نانوتوی وغیرہ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

14.2.5.5 مولانا کریم الدین پانی پتی:

دہلی کالج کے ایک نمایاں طالب علم مولوی کریم الدین پانی پتی تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آگرہ کالج میں اردو ادب کے استاد مقرر ہوئے اس کے بعد سر رشتہ دار عدالت لاہور میں ملازم رہے۔ شعر و ادب سے خاص دلچسپی رہی۔ کچھ عرصہ تک اپنے مکان پر ہر ماہ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ اس میں بڑھا جانے والا کلام ''گل رعنا'' کے نام سے شائع کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا ایک بڑا ذخیرہ بھی انھوں نے چھوڑا۔ چناچہ قاضی عبدالودود نے مختلف علوم و فنون پر ان کی چونتیش (34) کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ مولوی کریم الدین پانی پتی کو سب سے زیادہ شہرت ''تذکرہ نگاری'' سے ملی۔ اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے تذکرہ نگاری سے کیا اور تاعمر اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ ان کے تذکروں میں ''طبقات شعرائے ہند'' اور گلدستہ نازنیناں'' زیادہ مشہور ہیں۔ مولوی کریم الدین پانی پتی کے تذکروں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ تذکرے کو تاریخ کی ایک شاخ سمجھنے کی کوشش کی۔ تاریخ اور تذکروں کی جو تعریف انھوں نے بیان کی اس سے پہلے کسی اور تذکرہ نگار نے اس طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔ تذکروں کے بعد اس نے قلم کا جوہر ''تاریخ ابو الفداء'' کے ترجمے میں کھلتا ہے جو ڈاکٹر اشپرنگر کی فرمائش پر کیا گیا۔

ان کے علاوہ دہلی کالج کے طلبا کی ایک طویل فہرست ہے جو تحصیل علم کے بعد پورے ملک میں پھیل گئے۔ یہ طلبا جہاں بھی جاتے عوام و خواص ان کا پر جوش خیر مقدم کرتے۔ تدریس کے علاوہ دیگر پیشوں سے یہ بھی وابستہ رہے مثلاً لالہ مکند لال گورنر جنرل کے سرجن مقرر ہوئے، پنڈت بشیشر ناتھ ایک کامیاب مترجم تھے۔ مولوی محمد یعقوب اور مولوی ذوالفقار علی ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ منشی امید سنگھ مہاراجہ اندور کے اتالیق مقرر ہوئے۔

14.2.6 ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی:

1835ء میں لارڈ میکالے کی نگارشات کے بعد دہلی کالج ہی وہ ادارہ تھا جس نے آخر تک اردو زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنائے رکھا۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا مغربی علوم اور افکار کی افادیت کے پیش نظر لوگوں کا رجحان اس طرف بڑھنے لگا۔ مگر دیسی زبانوں

میں اس طرح کی کتب کی عدم موجودگی کی وجہ سے دہلی کالج کی ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ تراجم کے ذریعہ مغربی علوم کا تعارف کرا کے مشرق کے فکری جمود کو توڑا جائے۔

ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی داغ بیل کالج کے پرنسپل مسٹر بترو نے ڈالی۔ ماسٹر رام چندر اور امام بخش صہبائی ان کے اہم معاونین میں تھے۔ شروع میں اسے ''انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بعض اسے کتب خانہ برائے کار آمد معلومات (Library of usefull knowledge) بھی کہتے تھے۔ بعد میں ورنا کلر ٹرانلیشن سوسائٹی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ سوسائٹی کا مقصد اردو، ہندی اور بنگالی تینوں زبانوں میں ترجمہ کا کام کرنا تھا لیکن محدود وسائل اور بعض دوسری مجبوریوں کی بنا پر صرف اردو میں ہی کام ہو سکا۔

ترجمہ کا کام گرچہ مسٹر بترو کی تقرری کے سال یعنی 1841ء میں ہی شروع ہو چکا تھا لیکن 1843ء میں انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی کے قائم ہونے پر یہ کام دہلی کالج میں باقاعدہ شروع ہو گیا اور ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی نگرانی میں کتابیں طبع ہونے لگیں۔ 1845ء میں مسٹر بترو یورپ چلے گئے تو ان کی جگہ ڈاکٹر اشپرنگر کا تقرر ہوا۔ انھوں نے بھی ترجمہ و تالیف کے کام کو اسی شوق اور سرگرمی سے جاری رکھا۔

یہ سوسائٹی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ 1877ء میں دہلی کالج کو ختم کر کے لاہور اورینٹل کالج میں ضم کر دیا گیا۔ پھر بھی قلیل عرصہ میں اس نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ سوسائٹی کی زیر نگرانی ریاضی، طبعیات، کیمیا، طب، جغرافیہ، تاریخ، قانون، سیاسیات، معاشیات اور مذہب وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے ان کی تعداد 128 جبکہ مالک رام نے 131 شمار کرائی ہے۔ جو بھی ہو اس فہرست کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ نمونہ کے طور پر چند ترجمہ شدہ کتابوں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

14.2.6.1 ترجمہ شدہ اہم کتابیں:

تذکرہ طبقات شعرائے ہند کو مولوی کریم الدین پانی پتی نے مسٹر ایف فلین کے ساتھ مل کر ''گارساں دتاسی'' کی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کی ضخامت 504 صفحات پر مشتمل ہے جو 1848ء میں مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں تاریخ اور تذکرہ کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔

تذکرہ شعرائے عرب کو مولوی کریم الدین پانی پتی نے خود اپنی عربی تصنیف ''فرائد الدہر'' کو اشپرنگر کی فرمائش پر اردو میں منتقل کیا جو 1847ء میں مطبع العلوم دہلی کالج سے شائع ہوئی۔ اس میں 347 شعرا کے فکر و فن کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے نمونہ کلام بھی پیش کیے گئے ہیں۔

دہلی کالج کے استاد مولوی سبحان بخش نے عربی تصانیف تذکرۃ المفسرین اور تذکرۃ الفقہا کا اردو ترجمہ تاریخ الحکماء نام سے کیا جو 1848ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں مختلف اہل فن کا ذکر کیا گیا ہے جو علم ہندسہ علم نحو اور اقلیدس وغیرہ کے ماہر تھے۔ ترجمہ خوب البتہ املا قدیم طرز پر ہے۔

مشہور مورخ گولڈ اسمتھ کی انگریزی کتاب ''History of England'' کا ترجمہ '' تاریخ انگلستان'' نام سے دہلی کالج کے کئی

اساتذہ نے مل کر کیا۔ اسی طرح گولڈ اسمتھ ہی کی کتاب "History of Rome" کا ترجمہ منشی شیو پرشاد نے "تاریخ روم" کے نام سے کیا۔ کتاب کے آغاز میں نہ تو دیباچہ ہے اور نہ ہی وجہ ترجمہ بیان کیا گیا ہے۔ دراصل 1845ء تک کی طبع شدہ کتابوں میں وجہ ترجمہ بتانے یا پیش لفظ لکھنے کا اہتمام نہیں تھا۔

دہلی کالج کے تعلیم یافتہ پنڈت رام کشن کو ترجمے میں بڑی مہارت تھی ان کے ترجمے میں روانی اور تصنیف کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے قوانین کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر بترو کی کتاب "Principle of the Law of Nations" کا ترجمہ "اصول قوانین ممالک مختلف" اور انھیں کی کتاب "Principle of Public Revenue" کا ترجمہ "اصول سرکاری محاصل کے" نام سے شائع کیا۔ اسی طرح W.H. Macnaghten کی کتاب "Principle of Hindu Laws کا ترجمہ "اصول دھرم شاستر" اور "Dumont & Benthan" کی کتاب 'Principle of Lagislature" کا ترجمہ "اصول قواعد اخلاق اور قوانین" نام سے کیا۔ قانون ہی کی ایک کتاب "نسخہ رہنما" کا ترجمہ "قانون مال کا" عنوان سے دہلی کالج کے متعدد اساتذہ نے کیا۔

ماسٹر رام چندر اور مولوی ذکاء اللہ کا دہلی کالج کے نمایاں طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ دونوں ریاضی داں تھے۔ انھوں نے ریاضی کی طبع زاد کتابیں تحریر کیں نیز انگریزی سے ترجمہ بھی کیں۔ ماسٹر رام چندر کی کتاب "رسالہ مسائل کلیات وجزیات (A Treatise on the " Problems of Maxima and Minima "اس قدر مشہور ہوئی کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر آگسٹس ڈی مارگن نے (Augustus De Margon) نے اپنے مقدمہ کے ساتھ لندن سے شائع کیا۔ منشی ذکاء اللہ نے ابتدائی درجوں کے طلبا کے لیے "علم مثلث" نام سے دو چھوٹے چھوٹے رسالوں پر مشتمل ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ منشی ذکا اللہ نے ریاضی کی اصطلاحات کو بڑی خوبصورتی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جبکہ ایسے خشک موضوع پر ترجمہ کرتے وقت زبان وبیان میں سلاست وروانی برقرار رکھنا بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ مشرقی شعبہ کے صدر مولوی مملوک علی نانوتوی نے "تحریر اقلیدس" نام سے بارہ مقالوں کا اردو ترجمہ کیا ہے جو مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا۔ مولوی کریم الدین پانی پتی کا کہنا ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہادیا ہے۔

علم طبیعیات (Physics) کی متعدد کتابوں کے ترجمے سوسائٹی کے تحت ہوئے۔ مثلاً "Theodolite" کی کتاب "Practical land Surveying" کا ترجمہ "رسالہ پیمائش زمین کا" عنوان سے منشی ہردیو سنگھ نے کیا۔ یہ رسالہ آلات زمین کی پیمائش سے متعلق تھا۔ اسی طرح Young کی کتاب "Machanism" کا ترجمہ "رسالہ علم ادات" نام سے پنڈت رادھا کشن نے کیا۔ اس رسالہ میں جیومیٹری کی شکلیں بنانے اور ان کے اصولوں پر مختلف کل پرزے بنانے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ دہلی کالج علم کا ایسا مرکز تھا جہاں انگریز بھی مترجم تھے۔ جی ہاں اردو کے مترجم، اپنی مادری زبان سے بدیسی زبان میں ترجمہ کیا وہ بھی میڈیکل سائنس کی کتاب کا ترجمہ مترجم ہیں دہلی کالج کے پرنسپل جوزف ہنری ٹیلر جنھوں نے Cooper کی کتاب "Treatise on Surgery" کا اردو ترجمہ "رسالہ پیچ بیان اعمالِ جراحی کے" نام سے کیا۔ جو مطبع العلوم دہلی سے 1848ء میں شائع ہوئی۔ سرورق پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کتاب اور مترجم کا نام صاف لفظوں میں لکھا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں چند ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس سے حوصلہ پاکر دیگر اردو

ذریعہ تعلیم کے ادارے بھی اپنے کام کو آگے بڑھا سکیں۔

14.3 جامعہ عثمانیہ

14.3.1 جامعہ عثمانیہ سے قبل:

ریاست حیدرآباد اگرچہ ملکی ریاست تھی' جس کا اپنا ٹپہ، کرنسی، ریلوے، ٹرانسپورٹ اور ہوائی اڈے کے ساتھ ساتھ ڈاک و تار کے محکمہ قائم کرکے انتظامی صلاحیتوں اور باضابطہ عدالت اور مختلف محکمہ جات کے قیام پر توجہ دی گئی۔ حیدرآباد میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے قبل انگریز حکومت نے ہندوستان میں ممبئی، کولکاتا، اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اندرون ریاست مواقع فراہم نہیں تھے' اگر ریاست حیدرآباد کا کوئی باشندہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو وہ مدراس یونیورسٹی یا پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے علاوہ دوسری ڈگریاں حاصل کرنے پر توجہ دیتا تھا۔ حیدرآباد میں صرف دو کالجوں کا رواج تھا۔ امیر و امراء اور جاگیر داروں کے خاندان کے فرزندان "جاگیر دار کالج (موجودہ بیگم پیٹ ہائی اسکول)" میں شریک ہوتے تھے'جب کہ "نظام کالج" جیسے ادارے میں عام شہریوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کی تخت نشینی 1911ء سے قبل ریاست حیدرآباد کے بادشاہ کی حیثیت سے نواب میر محبوب علی خان نے "محبوب یونیورسٹی" کے قیام کے لیے کوشش کی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے' لیکن اپنی زندگی میں انہوں نے عوام کی بھلائی کے لیے مذہبی یونیورسٹی "جامعہ نظامیہ" کا 1872ء میں قیام عمل میں لایا اور عوام کو مذہبی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے باضابطہ وقیع لائبریری "آصفیہ کتب خانہ" کی بنیاد رکھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل حیدرآباد میں تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں۔ مختلف تعلقوں اور اضلاع میں پرائمری اور ہائی اسکول قائم تھے۔ لیکن کسی بھی ضلع میں کالج کا تصور نہیں تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل باضابطہ تعلیمی سرگرمیاں ریاست حیدرآباد کا حصہ تھیں۔ لڑکوں کے لیے علاحدہ مدارس اور لڑکیوں کے لیے علاحدہ مدارس کا انتظام تھا۔ اور ان مدارس کو مدرسہ ذکور اور مدرسہ اُناث کی حیثیت سے اہمیت حاصل تھی۔ غرض جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل ہی حیدرآباد کا تعلیمی نظام مستحکم تھا، لیکن کسی بھی قسم کی جدید یونیورسٹی قائم نہ تھی۔ صرف دو کالجوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے اطراف واکناف میں مدراس یونیورسٹی اور میسور یونیورسٹی کے ذریعے اعلیٰ تعلیمی نظام کا سلسلہ جاری تھا۔

14.3.2 جامعہ عثمانیہ کی تحریک:

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے لیے شاہی حکمران کو اہمیت حاصل ہے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادارہ اچانک وجود میں نہیں آتا۔ ریاست حیدرآباد میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے لیے عوامی تحریک بھی جاری تھی۔ اس مقصد کو بادشاہِ وقت نے پورا کیا۔ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم حیدرآباد نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ریاست کے طلباء اور طالبات کے لیے ایک یونیورسٹی کا قیام لازمی ہے جس کے ذریعے اس علاقے کے باشندگان کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم ہوجائیں۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے 1884ء میں جب نواب میر محبوب علی خان اقتدار سے وابستہ تھے۔ نواب رفعت یار جنگ اور ان کے ہم عصر ساتھیوں میں سرسالار جنگ اول اور نواب مختار الملک نے 1292ھ

مطابق 1875ء کو ایک محضر پیش کیا' جس میں ایسی یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا گیا جو اردو ذریعہ تعلیم سے جدید علوم کی تدریس پر توجہ دے۔ اس محضر کے 9 سال بعد علامہ جمال الدین افغانی جب حیدرآباد آئے تو انہوں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔ تاریخی کتابوں میں لکھا ہے کہ لارڈ رِپن کی توجہ اس جانب مبذول کروانے کے لیے حکومت سے گذارش کی گئی۔ آصف سادس کی نگرانی میں باغ عامہ کے احاطے میں جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ''محبوب یونیورسٹی'' کے قیام کا خاکہ پیش کیا گیا۔ دارلعلوم حیدرآباد کے فارغ طلباء نے 1332ھ مطابق 1913ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تو ریاست میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ اِن تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی نمائندگی اور شاہی دلچسپی کے نتیجے میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے حالات پیدا ہوئے۔ جس میں نواب رفعت یار جنگ اور عوامی نمائندے ہی نہیں' بلکہ ایجوکیشن کانفرنس کی جستجو کو بھی بڑا دخل ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے سربراہوں میں مولوی محمد مرتضیٰ، مولوی ملا عبدالباسط، مولوی رضی الدین کیفی، سید بہاء الدین شطاری، جمال الدین مرحوم اور محمد مظہر مرحوم شامل تھے۔ جنہوں نے ریاست کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا۔ غرض ان تمام نمائندگیوں اور عوامی جستجو کی وجہ سے نواب میر محبوب علی خان کے دور میں جامعہ قائم نہ ہو سکی، لیکن میر عثمان علی خان کے عہد میں نئی جدید علوم کی جامعہ عثمانیہ کا قیام ممکن ہو گیا۔

14.3.3 جامعہ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر:

ریاست حیدرآباد میں جدید علوم کی اردو ذریعہ تعلیم سے شروع کی جانے والی یونیورسٹی کے لیے پہلی عرض داشت 22/اپریل 1917ء کو پیش کی گئی۔ جس میں سر اکبر حیدری معتمد تعلیمات نے میر عثمان علی خان بادشاہِ وقت کی خدمت میں معروضہ پیش کیا تھا کہ ریاست کی ضرورت کی تکمیل کے لیے نئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس معروضہ کو فخر الملک معین المہام عدالت و کوتوالی اور امور عامہ کی طرف سے منظوری دی گئی۔ ناظم تعلیمات اور اکابرین قوم و ملت ہی نہیں' بلکہ ماہرین تعلیم سے تفصیلات دریافت کی گئیں۔ اس عرض داشت پر فخر الملک کے علاوہ اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر راس مسعود سر سید کے پوتے کے دستخط بھی موجود تھے۔ اس نمائندگی کے باوجود وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے رائے دی تھی کہ غیر زبان کے ذریعے تعلیم کے نقصانات بہت زیادہ ہیں' اور شبہات ظاہر کیے گئے تھے' جس کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی قائم کرنے میں رکاوٹ درپیش ہوئی۔ جس کے جواب میں نواب عمادالملک، پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر عربی آکسفورڈ یونیورسٹی مسٹر فشر لیڈس یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر بائیکل ووڈواٹر، لیفٹننٹ گورنر پنجاب مسٹر گلانسی، معین المہام فینانس نے دوبارہ مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ غرض اس یادداشت اور عرضداشت کے جواب میں بادشاہِ وقت نے فرمان جاری کیا جس پر امین جنگ صدرالمہام پیشی کے دستخط تھے۔ جو 1335ھ مطابق 1917ء کی یادگار ہے۔ جس میں بادشاہِ وقت نے یونیورسٹی کے قیام کے احکامات جاری کیے تھے۔

> ''مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کہ مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جس میں دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے

پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلباء کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔" اس فرمان میں یہ بھی حکم صادر ہوا کہ "حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کاروائی شروع کی جائے۔"

اس حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے باضابطہ ماحول تیار ہو گیا۔ بادشاہِ وقت کے فرمان کے توسط سے 1918ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل جامعہ کے نصابات کی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک نئے محکمہ کے قیام کی اجازت دی گئی۔ جس کے تحت 14/ اگست 1917ء کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذمہ جامعہ عثمانیہ کی تمام نصابی کتابوں کی ترتیب و اشاعت اور اُنہیں نصاب میں شامل کرنا تھا۔ اس طرح اردو ذریعہ تعلیم سے شروع کی جانے والی ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی میں اردو نصاب کو جاری رکھنے کے لیے بادشاہِ وقت کے فرمان کے ذریعے یونیورسٹی کا قیام اور اس کے نصابات کی تیاری کے لیے دارالترجمہ کا قیام اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

14.3.4 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں:

عثمانیہ یونیورسٹی میں سب سے پہلے انٹر میڈیٹ کی کلاسوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے دو شعبے یعنی فنون (Arts) اور دینیات (Theology) کی تعلیم شروع کی گئی۔ مختلف عرضداشت اور احکامات کے ذریعے یہ پتہ چلتا ہے کہ 15/ اگست 1918ء کو "عثمانیہ یونیورسٹی کا دستور العمل" منظور کیا گیا۔ اس وقت مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی صدر یار جنگ صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ جب کہ محمد اکبر نذر علی حیدری معتمد عدالت و کوتوال سرکار عالی نے بھی دستخط کیے۔ تاریخی پس منظر میں یہ بتایا ہے کہ یکم ذی الحجہ 1337ھ مطابق 28/ اگست 1919ء کو باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اردو کے علاوہ انگریزی زبان بھی باضابطہ پڑھائی جانے لگی۔ یونیورسٹی کا نصاب بھی تیار کیا گیا اور اساتذہ کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ احکامات کے مطابق شوال 1337ھ مطابق 1918ء میں اساتذہ کا تقرر بھی ہو گیا۔ یونیورسٹی کے نصاب میں اردو، تلگو، مراٹھی، کنڑی اور تامل زبانوں کو شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ انگریزی کے دو پرچے، تاریخ و جغرافیہ کے دو پرچے، ریاضی کے دو پرچے، نیچرل سائنس کا ایک پرچہ، علوم السنہ میں کوئی ایک زبان جیسے عربی، سنسکرت، فارسی، تلگو، مراٹھی، کنڑی، تامل، فرانسیسی اور لاطینی کے علاوہ یونانی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی پہلی جماعت ایف اے (فیلو آف آرٹس) میں داخلہ لینے والے طلباء کے نام عبدالمجید صدیقی، احمد بن عبداللہ، عزیز الرحمن، ابوالفتح نصراللہ اور وینکٹیشور رائو تھے۔ جبکہ اورنگ آباد سے شریک ہونے والے طلباء میں یوسف الدین، کلیم الدین انصاری اور انیس احمد شامل تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے دفتر' مسجل (رجسٹرار) پروفیسر اور مددگاروں کے نام اخبارات میں شائع کیے گئے۔

14.4 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی تدریس اور عمارتیں

14.4.1 آرٹس کالج کی عمارت:

ہندوستان گیر سطح پر ہی نہیں' بلکہ عالمی سطح پر ریاست حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جبکہ بنگالی زبان کے عالمگیر شہرت یافتہ شاعر رابندرناتھ ٹیگور نے حیدرآباد کے بادشاہ کی جانب سے ہندوستانی ذریعہ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی کے قیام

پر مبارک باد دی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کے توسط سے انجام دی جانے والی سر گرمیوں کا احاطہ بہت کم کتابوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس خصوص میں چند تفصیلات بطور نمونہ پیش ہیں:

> ''بادشاہِ وقت کی جانب سے 26/ اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی گئی۔ 22/ ستمبر 1918ء تک یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلہ میں تمام بنیادی کام انجام دیئے گئے اور اسی 22/ ستمبر 1918ء کو سرکاری طور پر عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کی باضابطہ جماعتوں کے آغاز کے لئے مقام اور عمارتوں کے لیے غور کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے عابد روڈ کے علاقہ میں موجود توپ کا سانچہ جسے آج ''گن فائونڈری'' کہا جاتا ہے' اس علاقہ میں کئی عمارتوں کو منتخب کیا گیا۔ ان تمام عمارتوں میں سب سے خوبصورت عمارت ''آغا منزل'' تھی۔ اس خوبصورت عمارت کے احاطہ میں 28/ اگست 1919ء کو نواب صدر یار جنگ نے بحیثیت وائس چانسلر صبح 10 بجے عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ اس یادگار تقریب میں ملک کے امراء، علم و ادب کے چاہنے والے، اردو ادب کے جانثار اور مسٹر ولنکر موجود رہے۔ وائس چانسلر نے خطبہ افتتاحیہ پڑھا اور توپ کا سانچہ کے علاقہ میں جامعہ عثمانیہ کا آغاز ہوا۔''

اِن حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ تدریس کا آغاز 28/ اگست 1919ء کو بمقام توپ کا سانچہ (گن فاؤنڈری) کے احاطے میں ہوا۔ ابتداء میں آرٹس فیکلٹی کی بنیاد رکھی گئی اور اساتذہ کے تقررات کو قطعیت دینے کے بعد مختلف علوم و فنون کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی اور ان کی تدریس کا بھی انتظام کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے تمام شعبہ جات کا تعلیمی سلسلہ عابد روڈ کے احاطہ میں جاری رہا۔ 1935ء میں اڈکمیٹ کے علاقہ میں جامعہ عثمانیہ کی نئی عمارتوں کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔ چنانچہ مشہور زمانہ آرٹس کالج کی عمارت اور دیگر سائنس، انجینئرنگ، قانون، تعلیمات' شعبۂ امتحانات اور انتظامی امور کے شعبے 1938ءمیں اڈکمیٹ منتقل ہو گئے۔ 1935ء سے 1938ء تک اس علاقے میں عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ ستمبر 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو رہا۔ 1948ء میں ''سقوط حیدرآباد'' اور ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کی وجہ سے ریاست کے مشہور تعلیمی ادارے ''جامعہ عثمانیہ'' کے ذریعہ تعلیم کو اردو سے انگریزی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس خصوص میں نہ کوئی سینٹ کی میٹنگ ہوئی اور نہ ہی عوامی رائے کا لحاظ کیا گیا' بلکہ نئی حکومت کے اعلامیہ کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کے اردو ذریعہ تعلیم کو وقفہ وقفہ سے ختم کر دیا گیا۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تھے۔

بادشاہِ وقت میر عثمان علی خان نے آرٹس کالج کی عمارت کے لیے عالمی سطح کے مقابلے منعقد کیے۔ اس مقابلے میں ولیم جاسپر کے نقشے کو پسند کیا گیا۔ اس نقشے پر آرٹس کالج کی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس عمارت کی خوبی یہ ہے کہ اس کی پہلی منزل کی تعمیر میں مندروں کے ستون کے طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری منزل کی عمارت کے ستون مسجد کے طرز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب

کہ آرٹس کالج کا باب الداخلہ عیسائی چرچ کی تعمیر کا نمائندہ ہے۔ اس طرح آرٹس کالج کی عمارت میں بیک وقت تین بڑے مذاہب ہندو، مسلمان اور عیسائی کے اشتراک کا انداز واضح ہے۔ ہر فیکلٹی کی عمارت اس طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ آرٹس کالج کی عمارت کی تعمیر پر بادشاہِ وقت نے 30 لاکھ روپئے منظور کیے۔ اس عمارت کی تعمیر میں مقامی پہاڑوں کا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ عمارتوں کی تعمیر کے لیے نواب زین یار جنگ اور سید علی رضا جیسے پی ڈبلیو ڈی کے انجینئرس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جنہوں نے اڈ کمیٹ کے کیمپس کا انتخاب کر کے اس علاقے میں یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر کی اجازت دی۔ عمارتوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے بادشاہِ وقت نے اُس دور کی عالمی سیاحت کے لیے 6,146 پائونڈ کی رقم منظور کی تاکہ عالمی سطح پر مشہور اہم عمارتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں کا ڈیزائن تیار کیا جائے۔ غرض آرٹس کالج کی عمارت عالمی سطح پر منفرد انداز اور جمالیاتی حسن کی نمائندگی کرنے والی عمارتوں میں شامل کی جاتی ہے۔

4.2 .14 جامعہ عثمانیہ کے شعبہ جات:

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے توسط سے نہ صرف جدید علوم فنون کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی' بلکہ مختلف شعبہ جات کے علاوہ فیکلٹیز کے قیام اور اس کی کتابوں کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ سب سے پہلا اور بڑا شعبہ ''فیکلٹی آف آرٹس'' قرار دیا گیا۔ جس کے پہلے حصے میں زبانوں کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔ فیکلٹی آف آرٹس کے دوسرے حصہ میں تاریخ اور جغرافیہ کی جانب توجہ دی گئی۔ جس میں اسلامی، یونانی، رومی اور ہندوستانی تاریخ اور جغرافیہ شامل تھے۔ یہ شعبہ بھی سب سے بڑا شعبہ تھا۔ اس کے بعد فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات، سماجیات، سیاسیات اور معاشیات کو بھی شعبہ آرٹس سے وابستہ کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کی ''فیکلٹی آف لاء'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس میں بین الاقوامی، آئینی، یونانی، ہندوستانی اور کریمنل قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فیکلٹی آف سائنس میں حساب اور سائنس شامل تھے' جب کہ فیکلٹی آف سائنس کے دوسرے شعبے میں طبیعیات اور کیمیاء کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فیکلٹی آف انجینئرنگ میں میکانیکل اور انجینئرنگ کے شعبہ جات شامل تھے۔ فیکلٹی آف میڈیسن میں معالجات اور آپریشن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں فیکلٹی آف ایجوکیشن بھی موجود تھا۔ یہی نہیں بلکہ زبانوں کے شعبہ جات کے علاوہ دو علاحدہ شعبے دینیات اور اخلاقیات کے شامل تھے۔ انہیں بھی فیکلٹی آف آرٹس کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ آرٹس فیکلٹی میں سوشیالوجی، سیاسیات اور معاشیات کا دخل بھی تھا۔ غرض عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد آرٹس فیکلٹی کے تین شعبے' قانون کا شعبہ اور فیکلٹی آف سائنس کے تین شعبے' انجینئرنگ اور میڈیسن کے کئی شعبوں پر مشتمل عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے ذریعے طلبا اور طالبات کو باضابطہ تدریس کا اہتمام کیا گیا۔

4.3 .14 آرٹس، سائنس اور قانون کے شعبہ جات:

جامعہ عثمانیہ میں آرٹس کے شعبے کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ علوم السنہ کا تعلق بھی شعبہ آرٹس سے تھا۔ چنانچہ آرٹس کے ذریعہ سب سے پہلے زبانوں کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔ جس کے تحت مشرق وسطیٰ کی زبانوں میں عربی اور فارسی کو نصاب کا درجہ دیا گیا۔ ہندوستانی زبانوں میں شمالی ہند کی سب سے مقبول زبان یعنی سنسکرت کو نصاب کا موقف دیا گیا۔ علوم السنہ میں

جنوبی ہند کی تمام زبانوں کی تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا گیا' کیوں کہ جامعہ عثمانیہ کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔ یہی وجہ رہی کہ تلگو، مراٹھی، کنڑی اور تامل زبان کے شعبے قائم کیے گئے، جن کا تعلق آرٹس فیکلٹی سے تھا۔ اس کے علاوہ بیرونی زبانوں میں فرانسیسی، لاطینی اور یونانی زبانوں کے شعبے قائم کیے گئے۔ ان کا تعلق بھی آرٹس فیکلٹی میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آرٹس فیکلٹی کے توسط سے باضابطہ السنہ کے بعد فلسفہ، مابعد الطبعیات، نفسیات، منطق اور اخلاق کو شمار کیا گیا۔ فیکلٹی آف آرٹس کا تیسرا حصہ سماجیات، سیاسیات اور معاشیات سے وابستہ رہا۔ جب کہ فیکلٹی آف آرٹس کا چوتھا حصہ تاریخ و جغرافیہ سے وابستہ ہے جس کے تحت اِن شعبے جات میں اسلامی تاریخ، ہندوستانی تاریخ (قدیم و جدید)، عہد وسطیٰ کی تاریخ، عہد حاضر کی تاریخ، یونان کی تاریخ، روم اور یوروپ کی تاریخ کی تدریس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس طرح فیکلٹی آف آرٹس کا تعلق علوم السنہ اور دوسرے شعبے جات سے وابستہ رہا۔

جامعہ عثمانیہ کے سائنس کے شعبہ جات کا تعلق بھی تین مختلف عنوانات سے جاری و ساری رہا۔ پہلا شعبہ حساب اور سائنس سے متعلق تھا جس کے تحت الجبرا، جامیٹری، ٹگنامنٹری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جس کے بعد سائنس کے دوسرے شعبے میں فزکس کو اہمیت حاصل تھی جس کے ذریعے آواز اور نور، الکٹری سٹی، مقناطیسیت، جنرل فزکس اور پریکٹیکل فزکس کے موضوعات کو درس و تدریس میں شامل کیا گیا تھا۔ فیکلٹی آف سائنس کے تیسرے شعبے میں کیمسٹری یا کیمیا کو داخل کیا گیا تھا۔ جس کے ذریعہ فزیکل کمیسٹری، آرگینک کیمسٹری، نامیاتی کیمسٹری، کیلکولس، اپلائیڈ میتھامیٹکس اور آسٹرانومی کے علاوہ پریکٹیکل کیمسٹری، جیالوجی، باٹنی اور زوالوجی کے شعبے بھی شامل تھے۔ اِن تمام شعبے جات کو سائنس کی تعلیم سے وابستہ کیا گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ میں باضابطہ قانون کا شعبہ قائم تھا۔ اس قانون کے شعبے کو علاحدہ فیکلٹی کا درجہ حاصل تھا جس کی علاحدہ عمارت اور علاحدہ تقررات بھی جاری و ساری تھے۔ جس کے ذریعے اینشینٹ لاء، جوریس پروڈنس، بین الاقوامی قانون، آئینی قانون، کریمنل قانون، پرسنل قانون، لاء آف ٹراٹس، لاء آف ایویڈنس، یونانی قانون، سنسکرت قانون، یوروپی قانون اور ایشیائی قانون کی درس و تدریس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس طرح شعبہ آرٹس، سائنس اور قانون کے توسط سے نہ صرف اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا' بلکہ ہر شعبے کی اہم عمارت کے علاوہ تدریس کے لیے جماعتوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔

14.4.4 میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تعلیمات کے شعبہ جات:

جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کو جدید انداز سے وابستہ کرنے کے لیے باضابطہ جماعتوں کا اہتمام اور اساتذہ کے تقرر کے علاوہ تجربہ گاہیں بھی قائم کی گئیں' جس کے ساتھ جماعتی تدریس کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ میڈیکل سائنس کی تعلیم کو جدید تقاضوں سے وابستہ کرکے عثمانیہ یونیورسٹی میں باضابطہ فیکلٹی آف میڈیسن کے تحت جوریس پروڈنس، اناٹومی، ہسٹالوجی، فزیالوجی، سرجری، آپتھمالوجی اور ڈیسیز آف ویمنس کے شعبے قائم رہے۔ باضابطہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا اردو ذریعہ تعلیم سے میڈیکل کی تعلیم کو عام کیا گیا۔ غرض دارالترجمہ کی نصابی کتابوں کی وجہ سے میڈیسن کی تعلیم کو اردو میں فروغ حاصل ہوا۔ اسی طرح انجینئرنگ کی فیکلٹی کے ذریعے سیول اور میکانیکل انجینئرنگ کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ جس کے لیے باضابطہ علاحدہ عمارت اور اس کے مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔ اِسی طرح اساتذہ

کی فراہمی اور ان کی تربیت کے لیے باضابطہ کالج آف ایجوکیشن قائم کیا گیا' جس کے تحت علوم السنہ کی تدریس کے علاوہ سائنس کی تدریس کے مواقع فراہم کیے گئے۔ تدریسیات پر کتابوں کی فراہمی کے علاوہ مشرقی اور یوروپی طریقہ تدریس کے طریقوں پر مواد فراہم کیا گیا۔ چنانچہ فیکلٹی آف ایجوکیشن کے توسط سے اساتذہ کی تربیت اور ان کو عملی تدریسیات اور بچوں کی نفسیات سے وابستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ کے اِن شعبے جات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

14.4.5 یونیورسٹی سے کالجوں کا الحاق:

جامعہ عثمانیہ کے قیام 1918ء کے بعد ہندوستان کی آزادی اور 1966ء تک اس یونیورسٹی سے 20 کالجوں کا الحاق تھا۔ جس کے مطابق آرٹس کالج کیمپس میں 6 کالجس، شہر میں 7 کالجس اور اضلاع میں 7 کالجوں کا الحاق تھا' جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا شہر میں 16 کالجس اور اضلاع میں 44 کالجس کے الحاق کا آغاز ہوا۔ 1966ء میں ریاست آندھرا پردیش میں جملہ 91 کالجس موجود تھے۔ جن میں 68 کالجس شہر میں واقع تھے۔ جب کہ 31 کالجس اضلاع کی نمائندگی کرتے تھے۔ 2000ء تک جامعہ عثمانیہ کو دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کا درجہ اس لیے حاصل تھا کہ اس یونیورسٹی سے ساری ریاست کی 1750 کالجس کا الحاق موجود تھا۔ 2000ء کے بعد ریاست آندھرا پردیش نے اطراف واکناف میں کئی یونیورسیٹیوں کا قیام عمل میں لایا۔ جس کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کی صد سالہ تقاریب 1918ء میں اس یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں کی تعداد 950 تھی دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی سے ملحق اتنی بڑی کالجوں کا تعداد وموجود نہیں ہے' اس لیے جامعہ عثمانیہ کو بے شمار کالجوں اور ریسرچ سنٹرس کے الحاق کا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔

14.5 نصابات کی تدوین

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کی ذریعہ تعلیم کو اردو میں تقویت پہنچانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ جدید علوم و فنون کی تعلیم و تدریس کے لیے معیاری اور اعلیٰ سطحی کتابوں کی فراہمی پر توجہ دی جائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے پہلے حیدرآباد کا نصاب تعلیم روایتی قسم کا تھا۔ اگرچہ ہائی اسکول درجہ تک کی تعلیم کے لیے 1911ء میں میر عثمان علی خان نے کمیٹی قائم کرکے ریاست کی تعلیمی ترقی پر توجہ دی تھی۔ جس کی وجہ سے دسویں جماعت تک علوم السنہ کے علاوہ سائنس اور صنعت و حرفت کی تعلیم کو فروغ دیا گیا تھا۔ ہندوستان کی سرزمین میں جامعاتی سطح پر نصابات کی تدوین اور یوروپی یونیورسٹیوں کے معیارات کو برقرار رکھتے ہوئے جامعہ عثمانیہ میں تدریس پر خصوصی توجہ دی گئی' اور ملک گیر سطح سے قابل اساتذہ کو اس جامعہ میں تدریس کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس خصوص میں ہر شعبہ جات اور فیکلٹی سے متعلقہ سینئر اور تجربہ کار اساتذہ پر مبنی باضابطہ کمیٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ہر قسم کی کمیٹی کی تشکیل کے معاملے میں شعبہ جات کو اختیارات دیے گئے کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے شعبے سے متعلق ہی نہیں بلکہ دوسری یونیورسٹی کے شعبہ جات کے اساتذہ کو بھی نصابات کمیٹی میں شامل کریں۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ میں پہلی مرتبہ جمہوری انداز سے نصابات کی تدوین کا آغاز ہوا۔ اگرچہ یونیورسٹی کو بادشاہِ وقت نے قائم کیا تھا لیکن یونیورسٹی کے تمام معاملات میں جمہوری انداز اختیار کیا جاتا تھا' چنانچہ ہر زبان، ہر علم اور ہر فیکلٹی کے علاوہ ہر شعبے سے متعلق نصابی کمیٹیوں کا آغاز ہوا۔ اِن نصابی کمیٹیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ عالمی معیار کی جامعات کے نصابات کو پیش نظر رکھ کر یا پھر دنیا کی مشہور جامعات

میں بطور نصاب رائج شدہ کتابوں کو نصاب میں شامل کریں اور اُن کتابوں کو عالمی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ اس مقصد کے لیے نصابات کمیٹی کی طرف سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کو نمائندگی دی جاتی تھی۔ چنانچہ نصاب سے متعلق پیش کردہ کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت پر خصوصی توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ غرض دارالترجمہ کا شعبہ اور اس کے مختلف ذیلی شعبے کتابوں کے ترجمے اور اس کی کتابت کے علاوہ اشاعت کی ذمہ داری پوری طرح انجام دیتے تھے۔

14.5.1 دارالترجمہ کی کارکردگی:

جامعہ عثمانیہ کے نصابی کتابوں کی تصنیف و تالیف سے وابستہ ادارہ کی حیثیت سے دارالترجمہ نے اپنی کارکردگی کا شاندار مظاہرہ کیا۔ اس ادارہ کے نام کے بارے میں بھی اختلافات ہیں۔ بیشتر ناقدین اور محققین نے ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کی حیثیت سے اس کے وجود کو تسلیم کیا۔ بعض محققین نے اس ادارہ کا نام ''دارالتصنیف و تالیف و ترجمہ'' کی حیثیت سے پیش کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں موجود قدیم الماریوں اور میزوں پر ''دارالترجمہ'' کا نام لکھا ہوا ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالترجمہ ہی اس کا اہم نام ہے اور پہلی شائع ہونے والی کتاب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''اراکین دارالترجمہ'' کے ذریعے اسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔

اس اکائی کے ابتدائی موضوعات میں واضح کیا گیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل 14/ اگست 1917ء کو جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ نامپلی ریلوے اسٹیشن کے روبرو سابق رائل ہوٹل کی عمارت کی جگہ ''دارالترجمہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بادشاہِ وقت نے فرمان کے ذریعے اس شعبے کے لیے ابتدائی طور پر 16 ہزار روپئے کی رقم منظور کی تھی۔ جو مختلف ادوار میں 80 لاکھ تک اضافہ ہوگئی۔ محتاط اندازے کے مطابق دارالترجمہ کی کتاب کے ایک صفحہ کے ترجمہ کے لیے اس دور میں 27 روپئے خرچ ہوتے تھے۔ دارالترجمہ ایک ایسا ادارہ تھا' جس میں بیک وقت ترجمے کے کام کے علاوہ اصطلاح سازی کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا۔ 3/ ستمبر 1917ء کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات انجام دینے کے لیے جن اشخاص کا انتخاب عمل میں لایا گیا، اس کے تحت برکت علی ایم اے، الیاس احمد برنی بی اے، عبدالماجد دریابادی بی اے، سرور حسین اور نذیر ہاشمی کا تقرر عمل میں آیا۔ اسی طرح دارالترجمہ کے دفتر کے لیے 150 روپئے ماہانہ کرایے کی منظوری دی گئی۔ اس ادارے کے ذریعے سائنس، کیمسٹری، انجینئرنگ، طبیعیات، اقتصادیات، فزکس اور قانون کے علاوہ میڈیکل سائنس اور جدید علوم و فنون کی کتابوں کی ترجمہ نگاری اور اس کے ساتھ نئی اصطلاحات کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی گئی۔ موجودہ تحقیق کے اعتبار سے دارالترجمہ سے وابستہ 129 مترجمین نے جملہ 386 کتابوں کے ترجمے انجام دیے۔ اِن ترجموں میں زبان و بیان کا حسن ہی نہیں' بلکہ ترجمے کی عصری روایت بھی شامل رہیں۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ ترجموں کو باضابطہ روایتی ترجمہ کی اہم کوشش کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ ترجمے خوبصورت کتابت اور طباعت کے علاوہ انتہائی عمدہ جلد سازی کی وجہ سے اشاعت کی دنیا میں یادگار کا درجہ رکھتی ہیں۔

14.5.2 دارالترجمہ کی اصطلاحات کمیٹی:

عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعہ نصابی کتابوں کی اشاعت کا وقار قائم کیا۔ خوبصورت طباعت اور بہترین جلد اور اس کی خوبصورتی حد درجہ دیدہ زیب ہوتی تھی۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دارالترجمہ کی ترجمہ شدہ کتابیں موجود ہیں' جو آج بھی اپنے وقار کا پتہ دیتی ہیں۔

ترجمہ شدہ کتابوں کے علاوہ دارالترجمہ کے ذریعے نئی اصطلاحات بھی وضع کی گئیں۔ جس کے مطابق دارالترجمہ نے 80 ہزار نئی اصطلاحیں تیار کیں۔ جن کی اشاعت پاکستان کی سرزمین سے "اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" کے زیر عنوان دو جلدوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی۔ دارالترجمہ کی اشاعت کے دور میں ہی ہر فیکلٹی کی اصطلاحات پر مبنی کتابیں اُسی ادارہ سے شائع کی جاچکی تھیں۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ کی کارکردگی میں جہاں کتابوں کے ترجمے کو اہمیت حاصل رہی ہے' وہیں نئی اصطلاحات پیش کرنے پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ میں ریڈیو کے لیے لاسلکی کی اصطلاح تیار کی گئی۔ آپٹیکل کے لیے عینک کی اصطلاح وضع کی۔ سائنس اور قانون کے علاوہ میڈیکل سائنس کی بے شمار اصطلاحات جو آج بھی رائج ہیں' جیسے استوانہ، نخزنایہ، جوہر وغیرہ۔ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں میں نئی اصطلاحات شامل کی گئی ہیں۔ ہر شعبے کی نصابی کمیٹی جس کتاب کو منتخب کرکے ترجمے کے لیے مترجم کے پاس بھیجتی، اُسے مترجم ترجمہ کرنے کے بعد "وضع اصطلاحات کمیٹی" کو بھیجتا، جو نئی اصطلاحات کی تیاری اور ان کی جانچ پرکھ کرتی تھی۔ دارالترجمہ کے توسط سے شائع ہونے والی تمام کتابوں میں کسی بھی قسم کے قابل اعتراض مواد کو دور کرنے کے لیے دو شعبہ جات موجود تھے۔ جنہیں "ناظر ادبی" اور "ناظر مذہبی" کی حیثیت حاصل تھی۔ جن کے ذمے ترجمہ شدہ کتابوں میں کوئی ادبی اور مذہبی اختلاف راہ پاجائے تو اسے دور کرنا ہوتا تھا۔ ابتداء میں علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی کو ناظر ادبی اور حضرت علامہ عبداللہ عمادی کو ناظر مذہبی مقرر کیا گیا' جس کے بعد جوش ملیح آبادی دارالترجمہ کے ناظر ادبی و مذہبی مقرر کیے گئے۔ اس طرح دارالترجمہ کی کارکردگی حد درجہ منصوبہ بند تھی۔ علوم و فنون کی دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا اور نئی لفظیات کو اصطلاح کے طور پر استعمال کرکے اردو میں نئی اصطلاحات کو شامل کیا گیا۔ اس طرح دارالترجمہ کی کارکردگی میں ترجمہ ہی نہیں' بلکہ اصطلاحات سازی کی خصوصیات کو حد درجہ اہمیت حاصل ہے۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ ہر کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے درج کی جاتی تھی۔

14.5.3 دارالترجمہ کے ناظم اور مترجمین:

جامعہ عثمانیہ میں مختلف شعبہ جات کی تعلیم اور علوم و فنون کی نمائندگی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے طرز تعلیم کی عالمی شہرت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ اور اس یونیورسٹی کی نصابی کتابیں بھی نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی وقار سے زیادہ اہم دارالترجمہ کی ترجمہ شدہ کتابوں میں شامل مواد کو عالمی حیثیت سے آج بھی وقار حاصل ہے۔ دارالترجمہ کے قیام کے ساتھ ہی مغربی علوم و فنون کی اہم کتابوں کی اشاعت اور ترجمے کی روایت کو فروغ دیا گیا۔ اس ادارہ سے جملہ 386 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس ادارہ کو مستحکم اور کارکرد بنانے کے لیے ہر فیکلٹی کے مترجمین کی طویل فہرست موجود ہے۔ سب سے پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا دارالترجمہ کے اولین ناظم کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے سید محی الدین، حمید احمد انصاری، محمد عنایت اللہ دہلوی، محمد الیاس برنی، ڈاکٹر نظام الدین اور ایشور ناتھ ٹوپا کو دارالترجمہ کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع فراہم کیا گیا۔ ایشور ناتھ ٹوپا کے دور میں ہی دارالترجمہ کی مستقل حیثیت ختم ہوگئی۔ 1950ء سے اردو کتابوں کی اشاعت منسوخ ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ترجمے اور اشاعت کے سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا۔ 1955ء تک دارالترجمہ کی کسی بھی کتاب کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ البتہ 18 / اگست 1955ء کو رات کے وقت دارالترجمہ کی عمارت میں آگ لگ

گئی اور 80 ہزار سے ایک لاکھ تک کی کتابیں جل کر خاکستر ہو گئیں، جب کہ آہنی الماریوں میں بند نایاب کتابیں محفوظ رہیں۔ 5 آتش فرو انجنوں کی مدد سے دو گھنٹے کے دوران آگ پر قابو پایا گیا۔ اس طرح 18/ اگست 1955ء کو دارالترجمہ کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کی اطلاع اُس دور کے مشہور روزنامہ 'رہنمائے دکن' میں شائع ہوئی تھی۔

دارالترجمہ سے وابستہ مترجمین تین قسم کے ہوتے تھے۔ بیشتر ہمہ وقتی مترجمین کی حیثیت سے کام انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جزوقتی مترجمین اور پھر موقتی مترجمین بھی کام کرتے تھے۔ سائنس، طب، قانون اور دیگر علوم و فنون کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، معاشیات، نفسیات، ریاضیات، طبعیات، انجینئرنگ، حیاتیات اور عمرانیات کی کتابوں کے ترجمہ کرنے والوں میں اہم مترجمین شامل تھے، جن کی فہرست ضمیمہ میں شامل ہے۔ غرض عصر حاضر میں جامعہ عثمانیہ کی اہمیت میں اس وجہ سے اضافہ ہو جاتا ہے کہ عالمی سطح پر اردو کا معیار قائم ہونے اور 1948ء کے بعد جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم ختم کر دیے جانے کے باوجود 1998ء میں ہندوستانی حکومت نے پارلیمانی قانون کے ذریعے دوبارہ حیدرآباد کی سرزمین میں اردو ذریعہ تعلیم کی نئی یونیورسٹی "مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی" کا قیام عمل میں لایا اور ہندوستانی زبان اردو کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی تعلیم کی قدر افزائی کی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالترجمہ کے توسط سے جامعہ عثمانیہ کے نصاب کا موقف حاصل کرنے والی ترجمہ شدہ اردو کتابیں عصر حاضر میں معلومات اور علوم کی ترقی کی وجہ سے قابل قبول نہیں رہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں میں عام فہم اردو اور آسان زبان کے بجائے اس دور کے تقاضوں کے مطابق باضابطہ عربی اور فارسی تراکیب کے استعمال کی وجہ سے اس دور کی نصابی کتابوں کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم جامعہ عثمانیہ اور اس کے قیام سے لے کر اس کے توسط سے ترجمہ شدہ کتابیں اردو زبان و ادب میں علوم و فنون کی ترویج کے ورثے کی حیثیت سے آج بھی اہمیت کی حامل ہیں اور اسے جامعاتی سطح کی اردو علوم و فنون کی کتابوں کے اہم ورثے کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔

14.6 ضمیمہ جات

(الف) جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس (پولیس ایکشن تک):

(1)	سر سید علی امام	1920ء تا 1921ء
(2)	نواب فرید الملک بہادر	1922ء تا 1923ء
(3)	نواب ولی الدولہ بہادر	1924ء تا 1925ء
(4)	مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ	1926ء تا 1937ء
(5)	نواب حیدر نواز جنگ بہادر	1937ء تا 1941ء
(6)	کرنل نواب سر محمد احمد سعید خان	1941ء تا 1945ء
(7)	امین الملک سر مرزا محمد اسماعیل	1946ء تا 1947ء
(8)	میر لائق علی	1947ء تا 1948ء

(ب) جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس (پولیس ایکشن کے بعد):

(1)	نواب صدر یار جنگ	1918ء تا 1919ء
(2)	نواب ولی الدولہ بہادر	1920ء تا 1935ء
(3)	نواب مہدی یار جنگ بہادر	1936ء تا 1943ء
(4)	نواب اعظم جنگ بہادر	1943ء تا 1945ء
(5)	نواب علی یاور جنگ بہادر	1945ء تا 1946ء
(6)	ڈاکٹر ولی محمد	1946ء تا 1947ء
(7)	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	1947ء تا 1948ء

(ج) دارالترجمہ کے نظما:

(1)	مولوی عبدالحق بی اے	اولین ناظم	ستمبر 1917ء تا اگست 1919ء
(2)	مولوی احمد محی الدین ایم اے ' بار ایٹ لا	منصرم ناظم	اگست 1919ء تا فروری 1920ء
(3)	مولوی حمید احمد انصاری بی اے	نگران ناظم	فروری 1920ء تا جنوری 1921ء
(4)	مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی بی اے	ناظم	جنوری 1921ء تا جنوری 1935ء
(5)	مولوی محمد الیاس برنی ایم اے، ایل ایل بی	ناظم	جنوری 1935ء تا جنوری 1945ء
(6)	پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین	ناظم	جنوری 1945ء تا اکتوبر 1948ء
(7)	پروفیسر محمود احمد خان	نگران ناظم (رجسٹرار)	اکتوبر 1948ء تا 23/ دسمبر 1948ء

(8) ایشور ناتھ ٹوپا ناظم شعبہ ترجمہ وطباعت 1948ء تا 1956ء کے بعد بھی ان کی خدمات جاری رہیں۔

(د) دارالترجمہ کے چند اہم مترجمین:

2۔ مولانا عبدالحلیم شرر	3۔ مولانا عبدالماجد دریابادی	4۔ مولانا ظفر علی خان
5۔ مولانا عبداللہ عمادی	6۔ علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی	7۔ شبیر حسین خان جوش ملیح آبادی
8۔ قاضی تلمذ حسین	9۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان	10۔ مولانا عنایت اللہ دہلوی
11۔ پروفیسر ہارون خان شروانی	12۔ رشید احمد صدیقی	13۔ مولانا الیاس برنی
14۔ محمد فداء علی طالب	15۔ سید ہاشمی فرید آبادی	16۔ سید ہاشم ندوی
17۔ مولانا سید محمد ابراہیم ندوی	18۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	19۔ عبدالباری ندوی
20۔ پروفیسر عبدالقدیر حسرت	21۔ حکیم عبدالباقی شطاری	22۔ مولانا محمد سبزواری

23۔	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	25۔	محمد نذیر احمد	25۔	محمد عبد الرحمن خان
26۔	چودھری برکت علی	27۔	پروفیسر فیروزالدین	28۔	پروفیسر محمد سعید الدین
29۔	ڈاکٹر خواجہ حبیب حسن	30۔	ڈاکٹر مظفر الدین قریشی	31۔	ڈاکٹر غلام دستگیر
32۔	ڈاکٹر مفتی شاہ نواز	33۔	ڈاکٹر حیدر علی خان	34۔	ڈاکٹر خورشید حسین
35۔	ڈاکٹر فضل کریم خان	36۔	حکیم کبیر الدین	37۔	ڈاکٹر خلیل الرحمن
38۔	ڈاکٹر محمد حسین	39۔	قاضی محمد حسین	40۔	کشن چند
41۔	پروفیسر حسین علی مرزا	42۔	جۓ تیر تھ سستور کر	43۔	مر تنجے راؤ
44۔	رائے بیج ناتھ	45۔	پروفیسر محمد مجیب	46۔	محمد عاقل
47۔	محمد نصیر الدین خان	48۔	محمد احمد محی الدین انصاری	49۔	سید علی رضا
50۔	عبد المجید صدیقی				

14.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد تین اہم تعلیمی اداروں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا، جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمات انجام دی۔
- 1825ء میں قائم کردہ دہلی کالج وہ ادارہ تھا جو ہندوستانیوں کے لیے قائم کیا گیا اور ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔
- دہلی کالج کے پرنسپل یوروپین اور اساتذہ ہندوستانی تھے۔ اس کالج میں مشرقی اور مغربی علوم کے شعبے مساوی تھے جنھیں بعد میں ضم کر دیا گیا۔
- جدید علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کالج کے پرنسپل مسٹر بتروکی کوششوں سے ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی کے زیر نگرانی پرنسپل، اساتذہ اور طلبا نے مل کر مختلف علوم وفنون کی سینکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔
- دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا حرف اول کا درجہ رکھتے تھے چناچہ ان طلبا کا ملک کے مختلف حصوں میں تقرر ہوتا تھا اور وہ جہاں گئے کالج کا نام روشن کیا۔
- کالج نے ایسے طلبا کی تربیت کی جنھوں نے اردو فکشن کا آغاز کیا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت کو فروغ بخشا، مشاعروں کی سرپرستی کی، جدید نظم نگاری کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ غالب کی مکتوب نگاری اور منفرد نثر کے لیے راہ ہموار کیا۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی کتابوں کو ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کیا۔
- دہلی کالج نے اردو میں علمی مضامین کی بنیاد رکھی جو ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے نیز اردو والوں کو یوروپی ادب و فلسفے سے

روشناس کرایا۔

- فکری اعتبار سے عالمگیر تہذیبی وحدت، سیاسی اعتبار سے لبرل ازم، سماجی اعتبار سے افادیت پسندی کا نقطہ نظر دہلی کالج کے سامنے رہا جب کہ اساتذہ اور طلبا کے نزدیک تعلیم کا مقصد انفرادی معاشی فلاح اور ساتھ ہی ساتھ سماجی اصلاح تھا۔
- دہلی کالج نے سہ رخی مذہبی زاویہ پیش کیا چنانچہ دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ تحریک اور تحریک انجمن پنجاب کے ڈانڈے دہلی کالج میں آکر ملتے ہیں۔
- حیدرآباد کے طالب علم اعلیٰ تعلیم کی ڈگری مدراس یونیورسٹی یا علی گڑھ سے امتحان دے کر اپنی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتے۔
- حیدرآباد کے ساتویں بادشاہ نواب میر عثمان علی خان نے شاہی فرمان کے ذریعہ "جامعہ عثمانیہ" کے قیام کی منظوری دے دی۔
- جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل 14/اگست 1917ء کو "دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ" کا آغاز شاہی فرمان کے ذریعہ ہوا۔
- جامعہ عثمانیہ میں امتحانات کے لیے انگریزی لازمی مضمون رکھا جب کہ اختیاری مضامین میں اردو، تلگو، مراٹھی، کنڑی، سنسکرت اور تامل کے علاوہ بیرونی زبانیں عربی، فارسی، فرانسیسی، لاطینی اور یونانی کو بھی اہمیت دی گئی۔
- عثمانیہ یونیورسٹی کے ہر شعبے میں کارگذار اساتذہ اور ان کے مددگار اپنے شعبے کا نصاب مرتب کر کے کتابوں کی فہرست دارالترجمہ کے حوالے کر دیتے تھے۔
- دارالترجمہ سے وابستہ ہمہ وقتی اور جزوقتی مترجمین نصاب کی کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔
- دارالترجمہ کے توسط سے سائنس، قانون، طب اور آرٹس کی 386 کتابیں شائع کی گئیں اور 80 ہزار اصطلاحات تیار کی گئیں۔
- دارالترجمہ میں مترجمین کے علاوہ اصطلاحات بنانے والی کمیٹی کے ارکان بھی تھے۔
- دارالترجمہ سے وابستہ 8 ناظم اور 129 مترجمین نصابی کام انجام دیتے رہے۔
- 1921ء تک جامعہ عثمانیہ کے اسٹاف اراکین میں 25 افراد اور باقاعدہ طلبہ کی تعداد 225 تھی۔
- جامعہ عثمانیہ کا پہلا بی اے کا امتحان جون 1923ء میں ہوا اور پھر 1924ء میں ایم اے کے امتحانات کا آغاز ہوا۔
- پولیس ایکشن کے بعد نئی حکومت نے سینیٹ کی منظوری کے بغیر، یونیورسٹی کے اردو ذریعہ تعلیم کو تبدیل کر دیا اور انگریزی کو یونیورسٹی کی زبان کا موقف حاصل ہو گیا۔
- جامعہ عثمانیہ کا خوشگوار ماضی اردو ذریعہ تعلیم سے وابستہ ہے۔
- جامعہ عثمانیہ اردو کی عظمت رفتہ کا ثبوت ہے جس نے اپنے قیام کے 100 سال مکمل کر لیے ہیں۔

14.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
فکری تنوع	:	مختلف افکار

مساوی	:	برابر
زبوں حالی	:	بربادی
آگاہی	:	واقفیت
اطلاق	:	عمل
شغف	:	شوق
عبقری	:	عظیم،بڑا
شگفتگی	:	خوشگوار
ثقیل الفاظ	:	بھاری بھر کم الفاظ
مطمح نظر	:	پیش نظر
مطبع	:	اشاعت گھر
ڈائریکٹر	:	ناظم
باب الداخلہ	:	داخل ہونے کا دروازہ'
اختراع	:	نئی بات نکالنا،ایجاد
معروضہ	:	عرضی، عریضہ
عرضداشت	:	درخواست، گذارش
فرمان	:	شاہی حکم نامہ
سینیٹ	:	یونیورسٹی کے اساطین کی مجلس
طباعت	:	پرنٹنگ
عصری	:	زمانے کی ضرورت کے مطابق
صلاح	:	مشورہ کرنا
مدارالمہام	:	وزیراعظم کا عہدہ' منتظم
معین المہام	:	مددگاروزیر۔نائب منتظم

انضمام : ضم ہونا، شرکت، الحاق

علوم السنہ : زبانوں کا علم

عمرانیات : معاشرہ سے متعلق علوم

رصد گاہ : اجرام فلکی کے مشاہدے کا مقام

14.9 نمونہ امتحانی سوالات

14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی کالج کب قائم ہوا؟

(a) 1800 (b) 1815 (c) 1817 (d) 1825

2۔ دہلی کالج کے پہلے پرنسپل کا نام کیا تھا؟

(a) جوزف ہنری ٹیلر (b) فلیکس بترونے (c) اشپرنگر (d) ماسٹر رام تاراچند

3۔ مولوی مملوک علی نانوتوی کس شعبہ کے صدر تھے؟

(a) مغربی شعبہ (b) مشرقی شعبہ (c) سائنسی شعبہ (d) ریاضی شعبہ

4۔ ماسٹر رام چندر کا تعلق کس کالج سے تھا؟

(a) فورٹ ولیم کالج (b) عثمانیہ کالج (c) دہلی کالج (d) فورٹ سنٹ جارج کالج

5۔ کس کا شمار دہلی کالج کے اساتذہ میں نہیں ہوتا؟

(a) نذیر احمد (b) ماسٹر رام چندر (c) امام بخش صہبائی (d) مولوی سبحان بخش

6۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی منظوری کس بادشاہ کے ذریعہ حاصل ہوئی؟

(a) میر عثمان علی خاں (b) میر محبوب علی خاں (c) نواب رفعت یار جنگ (d) ان میں سے کوئی نہیں

7۔ جامعہ عثمانیہ کب قائم کی گئی؟

(a) 1900 (b) 1915 (c) 1918 (d) 1925

8۔ دارالترجمہ کہاں قائم کیا گیا؟

(a) حیدرآباد (b) کلکتہ (c) دہلی (d) مدراس

9۔ جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم کس سن میں ختم کیا گیا؟

(a) 1936 (b) 1940 (c) 1948 (d) 1950

10۔ جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر کا نام کیا تھا؟

(a) میر لائق علی (b)سر سید علی امام (c)نواب صدیار جنگ (d)ڈاکٹر ولی محمد

14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی کالج کے قیام اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

2۔ ماسٹر رام چندر کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیجیے؟

3۔ ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

5۔ دارالترجمہ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی کالج سے وابستہ نمایاں اساتذہ کرام کی خدمات کا مجموعی جائزہ لیجیے۔

2۔ ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی سے ترجمہ شدہ کتابوں کا جائزہ لیجیے۔

3۔ عثمانیہ یونیورسٹی پر ایک نوٹ لکھیے۔

14.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مرحوم دہلی کالج	مولوی عبدالحق
2۔	قدیم دہلی کالج	مالک رام
3۔	ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار	شمس الہدیٰ
4۔	جامعہ عثمانیہ	از محمد عبدالحئ
5۔	دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	پروفیسر مجید بیدار

14.9.1 کے جوابات: 1۔d 2۔a 3۔b 4۔c 5۔a

6۔a 7۔c 8۔a 9۔c 10۔b

اکائی 15: علی گڑھ تحریک

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 پس منظر
15.3 سر سید احمد خاں کی خدمات
15.3.1 سماجی خدمات
15.3.2 تعلیمی خدمات
15.3.3 ادبی خدمات
15.4 سر سید کے رفقا کی ادبی خدمات
15.4.1 الطاف حسین حالی
15.4.2 علامہ شبلی نعمانی
15.4.3 ڈپٹی نذیر احمد
15.4.4 نواب محسن الملک
15.4.5 دیگر رفقا
15.5 اکتسابی نتائج
15.6 کلیدی الفاظ
15.7 نمونۂ امتحانی سوالات
15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

انسانی زندگی مسلسل حرکت میں ہے پھر بھی زندگی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جس میں نقل در نقل اور رواج در رواج عمل کرتے رہنے سے جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔اس جمود کو توڑنے کے لیے افراد یا جماعتیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں' ان کے اس کام کو تحریک کہتے ہیں۔دنیا میں فنون لطیفہ اور ادب کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ادب میں بھی جمود اور سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔انیسویں صدی میں انقلاب 1857 ء کا واقعہ اردو ادب کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔کیوں کہ ہماراادب گذشتہ سے پیوستہ رہتے ہوئے نئی توانائی اور جدید اصناف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔اس کو وقت کے تقاضے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور با مقصد بنانے میں سر سید یا علی گڑھ تحریک کا بڑا اہم کردار ہے، اس کا تفصیلی مطالعہ آپ اس اکائی میں کریں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- علی گڑھ تحریک کے پس منظر کو سمجھ سکیں۔
- علی گڑھ تحریک کے مقصد سے واقف ہو سکیں۔
- سر سید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات بیان کر سکیں۔

15.2 پس منظر

1757 ء کی جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان جدید دور میں داخل ہوتا ہے۔یہ پہلا موقعہ تھا جب یوروپی تجارتی قوم نے ہندوستان کی سیاست میں ریشہ دوانیوں کا فائدہ حاصل کرکے ، اپنا استبدادی پنجہ گاڑ دیا۔بنگال کی بے شمار دولت ہاتھ لگنے کے بعد انگریزوں کی نیت خراب ہو گئی۔پھر 1764 ء کی بکسر کی لڑائی میں مغل، اودھ اور بنگال کی متحدہ افواج کو انگریزوں نے شکست دے کر اپنی فوجی برتری کو ثابت کر دیا۔ہندوستان کی دیگر ریاستوں کو بھی رفتہ رفتہ انگریزوں نے شکست دے کر یا کمزور کر کے لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔آخر یہ ظلم و بربریت کب تک ؟ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکنے لگی۔چنانچہ جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد 1857 ء میں انگریزوں کے خلاف پورے ہندوستان میں جنگ لڑ کر انھیں بے دخل کرنے کی آخری کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش دیرپا ثابت نہ ہوئی جس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً اتحاد و اتفاق کی کمی، بہتر اور منظم فوج کا نہ ہونا، انگریزوں کے مقابلے میں ناقص ہتھیار اور اسلحہ ، ترسیل ورابطہ کی عدم موجوگی ، انگریزی خفیہ محکمہ کی چابکدستی اور خود ہندوستانیوں کے ذریعہ مخبری اور غداری کرناوغیرہ وغیرہ ایسے حقائق تھے جس کی بنا پر چند مہینوں میں انگریزوں نے پورے انقلاب کو کچل ڈالا اورصدیوں سے قائم مغل شہنشاہیت کے آخری ٹمٹماتے

ہوئے چراغ کو بھی ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

انقلاب 1857 ء ہندوستانی تاریخ کے سب سے اہم واقعات میں سے ایک ہے،جس نے ایک نئے ہندوستان کو جنم دیا۔انگریزوں اور پہلے کی دیگر فاتح قوموں میں‌ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ مو خرالذکر نے ہندوستان کو غلام نہیں بنایا بلکہ وہ خود اس کے غلام ہو گئے جب کہ اس کے بر عکس انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنایا۔نسلی تفوق، علمی بر تری اور عسکری قوت کازعم ان میں‌موجود تھا نتیجتاً ہندوستانی عوام ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر احساس کمتری کا شکار ہوگئی۔انھیں اس مصیبت سے نکالنے کے لیے بہت سارے مصلح قوم اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے مختلف انداز سے سیاسی ، سماجی ، تعلیمی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ذریعہ مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ایسے ہی ایک مصلح قوم کا نام سر سید احمدخان ہے جن کی تحریک علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

انیسویں صدی کی ان تحریکات کوہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک کی بنیاد انگریزوں سے مفاہمت پر ہے جو مغربی علوم، سائنسی طرز فکر، منطقی استدلال اور عقلیت پر ستی کی روشنی میں تجدیدی کام کرنا چاہتا تھا تاکہ کھو یا ہوا وقار بحال ہو سکے ساتھ ہی انگریزوں کے ذہنوں میں ہندوستانیوں کے تئیں جو شکوک و شبہات ہیں اس کا ازالہ بھی ہو جائے۔دوسری طرح کی تحریکات کی بنیاد انگریزوں سے نفرت پر ہے جو مغربی ثقافتی یلغار کے سامنے اپنی مشرقی روایات ، تشخص، تہذیب و ثقافت کو مٹنے دینا نہیں چاہتا۔اس نے عقلیت کے بجائے عقائد اور تجدید کے بجائے احیا پر زور دیا۔اول الذکر میں برہمو سماج، پر ارتھنا سماج اور علی گڑھ تحریک وغیرہ جب کہ دوسری طرح کی تحریکات میں آریہ سماج ، رام کرشن مشن اور دیوبند تحریک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1857 ء کے انقلاب میں چوں کہ مسلمانوں کا بڑا اہم رول رہا اور انگریز اس بات سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھیں ہر پہلوسے نظرانداز کرنا ضروری سمجھا۔سر سید نے اپنی انتھک کوششوں سے ایک طرف انگریزوں کے ذہنوں کو صاف کر نے کی کوشش کی تو دوسری طرف مختلف انجمنوں اور علی گڑھ کالج کے قیام ، تصنیف، تالیف ، مضامین، صحافت اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی، سیاسی اور سماجی انحطاط کو دور کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کے تنزل کے سد باب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی بڑے گہرے اثرات مر تب کیے۔اس اکائی میں سر سید اور ان کے رفقا کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

15.3 سر سید احمد خاں کی خدمات

15.3.1 سماجی خدمات:

یکم اپریل 1869 ء کو سر سید انگلینڈ روانہ ہوئے۔گرچہ اس سے پہلے اپنی تصنیفات اور سائنٹفک سو سائٹی کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھے گئے اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے ذریعہ انھوں نے اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔مگر اکتوبر

1870 ء میں انگلینڈ سے واپس ہوئے تو ان کے ذہن میں سماجی اصلاح اور تعلیمی تصور کا ایک واضح خاکہ موجود تھا۔انھوں نے " محمڈن اینگلو اور ینٹل کالج علی گڑھ " قائم کر کے تعلیمی مشن کو عملی جامہ پہنا یا بلکہ ''تہذیب الا خلاق'' پرچہ جاری کر کے سماجی اصلاح کا کام انجام دیا۔

تہذیب الاخلاق جسے ''محمڈن سوشل رفارمر'' بھی کہتے تھے 'کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوجائے نیز ان تمام خرابیوں کو دور کیا جائے جو سماج کو گھن کی طرح کھارہی ہیں۔سر سید نے تہذیب الاخلاق کی ایک اشاعت میں سماجی اصلاح سے متعلق 29 نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا۔

سب سے پہلے ''آزادیٔ رائے''کو سر سید ضرور سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسان کو آزادانہ رائے دینے کا حق ہو تو دنیا کی آدھی برائیاں ختم ہوجائیں گی۔''دین اور دنیا'' کی تفریق کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔کہتے ہیں کہ بد بختی سے دنیا دین کو غارت کردیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔دین اور دنیا کے بارے میں سر سید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں جدید علوم اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔سرسید قوم میں ''خود اعتمادی'' پیدا کرنا چاہتے تھے۔اس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ تھا کہ دوسروں کے دستِ نگر نہ ہوں اور اپنے مسائل آپ حل کرنا سیکھیں۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب ''اپنی مدد آپ'' کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ترقی کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق خود کسی بیرونی امداد کا انتظار کیے بغیر کوشش کیے۔

یہی جذبہ ترقی کی بنیاد ہے۔''ناامیدی اور مایوسی''کو وہ قوم کے لیے انتہائی مضر سمجھتے تھے۔سرسید نے اپنے مشن میں بار بار ناکام ہونے کے باوجود اپنا کام جاری رکھا اور آخر ایک دن اپنی منزل کو پالیا۔اپنے مضمون' 'امید کی خوشی' 'میں بڑی خوب صورتی سے انہوں نے مثالوں کے ذریعہ اس بات کو سمجھایا ہے۔''رسم و رواج'' کی پابندی کو سر سید نے بندر کی نقل سے تشبیہ دی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ نقل کے بجائے عقل سے کام لے کر اچھی رسموں کو اختیار کرے اور بری رسموں کو رد کرے۔کاہلی اور سستی کسی کے نزدیک بھی اچھی چیز نہیں ہے۔مگر سر سید نے 'کاہلی و سستی''کو جسمانی محنت کے بجائے قلبی اور عقلی محنت کی کمی کو سمجھا تھا۔دوسرے لفظوں میں دل' دماغ اور عقل کو قوم کے مفید کاموں میں استعمال کرے۔ ''خوشامد'' سر سید کے نزدیک دل کی بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک ہے۔اس کی وجہ سے انسان خود غرضی اور مطلب پرستی کا شکار ہوجاتا ہے۔''ریاکاری'' کو انہوں نے تہذیب اور معاشرت کا دشمن بتایا ہے۔ریاکاری ظاہر و باطن کو الگ کرتی ہے۔ریاکار آدمی آسانی سے اپنے دوست کو دھوکہ دے سکتا ہے۔''بحث و تکرار'' بھی سر سید کے نزدیک ایک اچھی چیز نہیں۔اس سے دلوں میں کدورت پیدا ہوجاتی ہے اور ''تعصب''کو سر سید بدترین خصلتوں میں سے ایک خصلت بتاتے ہیں۔یہ نیکیوں کو برباد اور خوبیوں کو تباہ کردیتی ہے۔عدل و انصاف اس کی وجہ سے جاتا رہتا ہے۔

ان چند انتہائی اہم اور قابلِ غور معاشرتی خرابیوں کی طرف سر سید نے توجہ مبذول کرائی ہے جن کو دور کرکے قوم

ترقی کرسکتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ یہ برائیاں ہمارے سماج میں پنپ رہی تھیں اور پنپ رہی ہیں جس کو سر سید نے محسوس کرکے بلا خوف لکھا' بتایا اور دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

15.3.2 تعلیمی خدمات:

سر سید کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے۔وہ قوم کے سارے امراض کا علاج مغربی تعلیم میں تلاش کرتے ہیں۔1857ء کے بعد ملک کے حالات تیزی سے بدل گئے۔اندازِ فکر' رہن سہن' تعلیمی نظام اور نصاب کے علاوہ ہر چیز پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔اب اگر ملازمتوں کو حاصل کرنا ہے' سماج میں بہتر زندگی گذارنا ہے' حکومت میں اپنی رسائی حاصل کرنا ہے' تجارت ' صنعت و حرفت کے شعبوں میں ترقی کرنا ہے تو جدید تعلیم سے منہ موڑ نہیں سکتے۔لیکن مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ صدیوں تک حکومت ان کے پاس تھی ان کے علوم اور زبان کو دیگر اقوام سیکھ اور پڑھ رہے تھے۔یہ پہلا موقعہ تھا کہ اپنی زبان اور علوم کو ترک کرکے دوسرے علوم اور زبان کو سیکھنا پڑ رہا تھا۔اس کے لیے اتنی جلدی سے یہ آمادہ نہیں تھے۔سرسید نے وقت کے تقاضہ کو سمجھا اور لاکھ مخالفتوں کے باوجود اپنے مشن میں لگے رہے۔وہ سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کو بھی جدید علوم پڑھنے پڑیں گے۔ابتدا میں سر سید ہندو اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے یکساں کوشش کرتے رہے مگر راجہ رام موہن رائے نے بہت پہلے ہی ہندوؤں میں بیداری پیدا کردی تھی اور ان کے سامنے مسلمانوں کی طرح کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔وہ پہلے عربی اور فارسی پڑھتے تھے اب انگریزی پڑھنے میں انہیں کیوں کر جھجھک محسوس ہوگی۔البتہ سرسید نے اپنے تعلیمی ادارے کے دروازے غیر مسلموں پر بھی اسی طرح کھلے رکھے جس طرح مسلمانوں پر۔

سرسید اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمان انگریزی سیکھنے پر راضی نہیں ہوں گے۔اس لیے وہ جدید علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔گرچہ دہلی کالج کی "ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" نے یہ کام انجام دیا تھا لیکن بے وقت کالج بند ہوجانے سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔اس مقصد کے تحت سر سید نے غازی پور میں اپنے قیام کے دوران 9 جنوری 1869ء کو "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی بعد میں ان کے تبادلہ کے ساتھ یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔

آغاز میں سر سید مادری زبان یعنی اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہتے تھے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلے گذر چکی یعنی مسلمان انگریزی کی طرف مائل نہیں ہورہے تھے۔دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان کی کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے تو دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ایک تو اصل مضمون پر دوسرے زبان سیکھنے پر مزید یہ کہ یہ علم دیرپا نہیں ہوتا اس لیے ان کے ذہن میں ایک ورناکلر یونیورسٹی کا خاکہ موجود تھا۔مگر برطانیہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد ان کی فکر میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے اور وہ اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے کی پرزور دعوت دیتے ہیں۔اپنے اس

موقف کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ ”تمام علوم کو اردو میں منتقل نہیں کیا جاسکتا جب کہ جدید علوم کو حاصل کرنا ناگزیر ہوگیا ہے دوسرے یہ کہ حکمرانوں کی زبان انگریزی ہے۔ تیسرے یہ کہ راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں برادرانِ وطن انگریزی زبان کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے آگے بڑھ چکے ہیں“۔ بہرحال سرسید نے برطانیہ سے لوٹ کر دو بڑے کام انجام دیے۔ایک مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق پرچہ کا اجرا' دوسرے تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام۔

24 مئی 1875 کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید کا قائم کردہ یہ کالج آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی کا بڑا اہم کردار ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حالاں کہ ان کے اس تعلیمی مشن میں رکاوٹیں بھی پیدا کی گئیں۔ مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش کٹر مخالفین میں تھے۔ شبلی نعمانی نے بھی بعض چیزوں میں سرسید کی مخالفت کی۔ اکبر الہ آبادی شروع میں اپنی شاعری کے ذریعہ سر سید پر چوٹیں کسیں مگر بعد میں مداح ہوگئے۔ سر سید کا ساتھ دینے والوں میں الطاف حسین حالی' ڈپٹی نذیر احمد' منشی ذکاء اللہ ' محسن الملک' وقار الملک' مولوی سمیع اللہ وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ سر سید کے ان رفقا نے بھی تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔

سرسید تعلیم کو سبھی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مگر تعلیم حاصل کرنے والوں کو وہ چھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے تعلیم کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو تجارت یا صنعت و حرفت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ہیں۔ تیسری طرح کے لوگوں میں زمین دار اور جاگیردار آتے ہیں (یہ آزادی سے قبل کا طبقہ ہے)۔ چوتھی قسم میں ایسے لوگ آتے ہیں جو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کرکے تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پانچواں طبقہ علم دین حاصل کرنے والوں کا ہے۔ چھٹا گروہ عام لوگوں کا ہے جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرکے اپنے روزمرہ کے کاموں میں معمول کے مطابق لگا رہنا چاہتا ہے۔ اگر ان تمام پر غور کیا جائے تو سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پہلی قسم کے لوگ یعنی سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند ہی متوجہ ہوئے۔ یہاں کے طلبا نے ملازمت ہی کو ترجیح دی اور کالج کے ارباب حل و عقد کا مقصد بھی یہی تھا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کو اطمینان بخش بنایا جائے۔

عورتوں کی تعلیم کی طرف سرسید نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے مخالف تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ مرد جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کی بات ہے اس کا خاکہ بھی سرسید کے ذہن میں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم ہوں اس مقصد کے لیے انہوں نے 1886 ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ بہرحال سرسید کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان بالآخر تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئے۔

15.3.3 ادبی خدمات:

سرسید بے انتہا مصروف انسان تھے پھر بھی انھوں نے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالا۔وہ کہا کرتے تھے کہ تصنیف و تالیف میں جیسا میرا جی لگتا ہے ویسا کسی اور کام میں نہیں لگتا۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سیاسی ' سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے ہوئے لکھنے پڑھنے کے مشغلہ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ایک بڑی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سرسید کے تمام کاموں سے کچھ نہ کچھ اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اردو زبان و ادب کی جو خدمات انھوں نے انجام دیں ان کا اعتراف دوست دشمن سبھی کرتے ہیں۔

سرسید نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کردیا تھا اور یہ سلسلہ وفات کے نو دن پہلے تک چلتا رہا۔آخری مضمون انہوں نے تہذیب الاخلاق میں اردو کی حمایت میں لکھا تھا جب کہ آغاز اپنے بڑے بھائی کے اخبار ”سید الاخبار“ سے کیا۔ان کی پہلی کتاب ’رسالہ القلوب بذکر محبوب“ ہے۔انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔تاریخ کی تین اہم کتابوں ”آئین اکبری“ ”تاریخ فیروز شاہی“ اور ”تزک جہانگیری“ کو مرتب کیا۔دہلی کی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ ”آثار الصادید“ میں لیا ہے۔انقلاب 1857ء کے تعلق سے ”تاریخ سرکشی بجنور“ اور ”اسباب بغاوت ہند“ تحریر کی۔مذہب پر کئی کتابیں لکھیں۔ان میں”تفسیر قرآن“، ”تفسیر انجیل“ (تبئین الکلام)، ”خطبات احمدیہ“، ”ابطالِ غلامی اور ”احکام طعام اہل کتاب “ وغیرہ اہم ہیں۔کل ملا کر چالیس سے زائد کتابیں سرسید نے تحریر کیں۔جہاں تک ادب کی بات ہے اس پر باضابطہ کتاب تو نہیں لکھی البتہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی (بعد کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) اور تہذیب الاخلاق میں شائع ان کے انشائیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان' اسلوب اور نثر کو خود سرسید اور ان کی تحریک نے کس قدر متاثر کیا ہے۔انہوں نے آسان اور سادہ نثر نگاری کو فروغ دیا۔گرچہ فورٹ ولیم کالج اور خطوطِ غالب کے ذریعہ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی مگر ابھی یہ رجحان عام نہیں ہوا تھا۔سرسید اور علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کی یہ بڑی خدمت کی کہ پُر تکلف نثر کو ترک کرکے سلیس و سادہ نثر کو ترقی دی۔دوسرا کام یہ کیا کہ تحریر کو بامقصد اور افادیت کا حامل بنایا۔تہذیب الاخلاق میں سرسید کے جو ادبی مضامین یا انشایئے شائع ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں : بحث و تکرار' امید کی خوشی'گزرا ہوا زمانہ' جاڑہ' تعلیم ' رسم و رواج کی پابندی' آزادئ رائے' سمجھ' دنیا بہ امید قائم ہے' اخلاق ' ریاکاری' خوشامد ' اپنی مدد آپ وغیرہ۔

سرسید نے اپنے ان تمام مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔فطرت کی سچی تصویر کشی' درد انگیزی' اثر پذیری' حقیقت نگاری' افادیت پسندی وغیرہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ایک بڑا وصف ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ علمی اصطلاحات' الفاظ اور تعلیمات کو بڑی سادگی' صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے۔ان کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

”مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کرکر آپس میں مل

بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ایک کوئی بات سمجھتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں کہتا کہ واہ تم کیا جانو؟ وہ بولتا ہے تم کیا جانو؟ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔تیوری چڑھ جاتی ہے۔آنکھیں ڈراؤنی ہوجاتی ہیں' باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔کسی نے بیچ بچاؤ کرکر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔'' (بحث و تکرار)

اسے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آسان الفاظ میں انسانی فطرت کی کتنی سچی تصویر کھینچی ہے۔یہ اثر ان کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔شوخی و ظرافت کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں کہیں‌نظر آجاتی ہیں۔

شاعری سے سرسید کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی۔البتہ ان نقائص کی نشاندہی کی ہے جو ہماری شاعری میں راہ پاگئے۔شاعروں کو مفید مشورے بھی دیے۔انجمنِ پنجاب لاہور کی زیر نگرانی جب نئی طرز کی شاعری کو رواج دیا گیا تو محمد حسین آزاد کو جو اس انجمن کے روح رواں تھے' سرسید نے مبارک باد دی۔سر سید کی یہ بڑی تمنا تھی کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے چنانچہ الطاف حسین حالیؔ سے انہوں نے مسدس'مدوجزر اسلام لکھوائی جو آج تک اپنی اثر انگیزی' مضمون آفرینی' سادگی اور خلوص کی وجہ سے اتنی ہی مقبول ہے جتنی کہ پہلے تھی۔مجموعی طور سے دیکھا جائے تو سرسید کی کوششوں سے ادب کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا اور کچھ ہی دنوں میں نثر ونظم کا ایسا سرمایہ فراہم ہوگیا جس پر فخر کیا جاسکتا ہے۔

15.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات

15.4.1 الطاف حسین حالیؔ:

حالیؔ کا وطن پانی پت (ہریانہ) ہے۔1854ء میں جس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی' دہلی آئے اور ادبی شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔خصوصاً غالبؔ سے وہ بڑے متاثر ہوئے اور ان سے گہرا رشتہ وابستہ ہوگیا۔1857ء کی بغاوت میں وہ دہلی سے چلے گئے پھر 1863ء میں دہلی واپس ہوگئے۔اس سفر میں نواب مصطفی خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔بغاوت کے بعد وہ دہلی زیادہ دنوں نہ رہ سکے اور لاہور چلے گئے۔اسی زمانے میں انجمنِ پنجاب لاہور نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔یہ اس سے وابستہ ہوگئے۔سکریٹری بھی بنائے گئے۔انہوں نے انجمن کے لیے چار نظمیں ''برکھارُت'' ، ''نشاطِ امید''، ''مناظر ہ رحم و انصاف'' اور ''حب ِ وطن'' لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔چند سال لاہور رہ کر وہ پھر دہلی چلے آئے۔

دہلی آکر اردو نثر نگاری کی طرف توجہ دی کیوں کہ اب وہ سر سید کی صحبت میں آگئے تھے۔ان کی نثر میں سر سید کی چھاپ بھی ہے اور انفرادیت بھی۔مثلاً سادگی' منطقی استدلال اور بے تکلف اظہار وغیرہ سر سید کے اثرات کا نتیجہ ہے۔سادگی میں لطافت' منطقیت میں شاعرانہ انداز ' تمثیلی پیرایہ' فطری اور بول چال کا لہجہ' عربی اور فارسی الفاظ سے احتراز مگر بعض جگہ انگریزی کا بے جا استعمال حالیؔ کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔حالیکی نثر نگاری کو دیکھنا ہے تو ان کی سوانحی تصانیف کو پڑھنا چاہیے۔اردو میں سوانح نگاری کو سر سید تحریک نے ہی جلا بخشی۔حالیؔ نے تین اہم سوانح عمریاں لکھی ہیں۔

خود سرسید کی سوانح "حیاتِ جاوید" نام سے لکھی۔اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھی جانے والی کوئی تحریر اس کے استفادے سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔اسی طرح غالبؔ کی سوانح "یادگارِ غالب" کے عنوان سے تحریر کی۔یہ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ 'حیاتِ جاوید"۔تیسری کتاب "حیاتِ سعدی" ہے جو کہ فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی سوانح عمری ہے۔

سرسید نے حالیؔ سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی چنانچہ مد و جزر اسلام (اسلام کا عروج و زوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔یہ نظم بعد میں "مسدس حالیؔ" نام سے مشہور ہوئی۔نظم میں حالیؔ نے سب سے پہلے اسلام کے عروج و زوال پر روشنی ڈالی۔پھر مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ایک سچی اور دل سوز آواز کو لوگوں نے سنا۔سرسید اس نظم کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔زبان سادہ' سلیس اور دل نشیں ہے۔روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔1879ء میں یہ نظم شائع ہوئی۔ہندوستان میں خواتین کی حالتِ زار کو بھی حالیؔ نے سمجھا۔راشد الخیری کو دنیا مصورِ غم کے نام سے جانتی ہے۔حالی نےؔ بھی عورتوں کے دکھ درد' بیوگی و بے چارگی کو سمجھنے اور اپنی نظموں میں ان حالات کو پیش کرنے میں جو تصویر کشی کی ہے 'وہ مصور غم سے کسی طرح کم نہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے 1874ء میں "مناجاتِ بیوہ" اور 1906 ء میں "چپ کی داد'' نام سے طویل نظمیں لکھیں۔حالیؔ اس معاملہ میں سر سید سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے چنانچہ "تعلیم نسواں" کے بارے میں ان کا ایک واضح تصور تھا۔ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی خواتین کے لیے ناول "مجالس النسا" تحریر کی۔

اردو تنقید کی تاریخ میں الطاف حسین حالیؔ کا بڑا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں بحیثیت فن ' تنقید کی ابتدا حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہوتی ہے۔1893ء میں انہوں‌نے یہ فکر انگیز مقدمہ اپنے مجموعہ کلام کے ساتھ شائع کیا تھا۔اس کے شائع ہوتے ہی پوری ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔اردو تنقید کو اس سے نئی راہ ملی۔اس طرح حالیؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شعر کو کسوٹی پر پرکھا اور تنقیدی مسائل سے بحث کی۔بحیثیت مجموعی سرسید کے اہم رفیق حالیؔ سے اردو ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ان پر آپ تفصیل سے مطالعہ کرسکتے ہیں۔

15.4.2 علامہ شبلی نعمانی:

شبلی نعمانی (1857-1914) اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔عربی فارسی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اپنے وقت کے علما سے حاصل کی۔1872ء میں وہ علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے۔یہاں پر سرسید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا اور ان ہی کی توجہ سے سوانح نگاری کی طرف راغب ہوئے۔حالاں کہ اس وقت تک وہ نظمیں لکھتے تھے۔علی گڑھ میں قیام کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔آرنلڈ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان کے ہمراہ مصر' شام و دیگر اسلامی ممالک کا سفر کیا۔سرسید کے آخری دور میں کچھ اختلافات کی بنا پر شبلی علی گڑھ سے علاحدہ

ہوگئے۔1897ء میں وہ وہاں سے اپنے وطن اعظم گڑھ آگئے اور ایک نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔کچھ عرصہ وہ حیدرآباد میں رہے جہاں انھیں تصنیف و تالیف کا اچھا موقعہ ملا۔ لکھنؤ میں جب دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا تو شبلی کی خدمات حاصل کی گئیں۔وہاں رہ کر مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی جیسے صاحبِ طرز ادیبوں کی تربیت کرتے رہے۔آخر میں پھر اعظم گڑھ آگئے اور ایک تحقیقی ادارہ "دارالمصنفین" نام سے قائم کیا جو آج تک اپنا کام کررہاہے۔

سر سید کے رفقا میں علامہ شبلی بڑی عبقریت کی حامل شخصیت تھی۔علم الکلام اور فلسفہ میں کامل دست رس رکھتے تھے۔سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادب، انشا اور شاعری کے ساتھ اردو تنقید میں بھی ان کا ایک بلند مقام ہے۔"سیرۃ النبی"، "المامون"، "الفاروق"، "الغزالی"، "سیرۃ النعمان" اور "سوانح مولانا روم" ان کی سوانح عمریاں ہیں جب کہ "شعر العجم " اور "موازنہ انیس و دبیر" سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ایک مختصر کلیات بھی شائع ہوا ہے جس میں مثنوی، مسدس، قصیدے اور اخلاقی و سیاسی نظمیں ملتی ہیں۔برطانوی سامراج کے واقعات پر بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر شبلی خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔

شبلی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قوت اور جوشِ بیان کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار بھی ہے۔چوں کہ شبلی جمالیاتی تنقیدی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نثر میں شاعرانہ فضا پیدا کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔وہ برمحل اشعار کا استعمال کرکے معانی و مطالب کو دل کش انداز میں ادا کردیتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نثر کی سادگی میں فن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ادب کے طالب علم کو شبلی کی موازنۂ انیسؔ و دبیر اور شعر العجم کی چوتھی جلد ضرور پڑھنی چاہیے۔

15.4.3 ڈپٹی نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد کا وطن بجنور ہے۔بچپن میں دہلی آگئے اور قدیم دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔انگریزی حکومت کی ملازمت کی اس لیے ان کی حمایت کرتے رہے۔انہوں نے کبھی کچھ وقت حیدرآباد میں گذارا، بقیہ زندگی دہلی میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔"شمس العلما" کے خطاب سے نوازے گئے۔

سرسید سے ان کے روابط تھے۔عموماً تقاریر کے لیے سرسید انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ آواز بلند اور بھاری بھرکم تھی۔بڑے بڑے اجتماعات میں تقریر کرتے تو سناٹا چھا جاتا۔ان کی تقریروں کے مجموعے خطبات نذیرا حمد کے نام سے شائع ہوچکے ہیں، جسے پڑھ کر ان کے وسیع علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔قرآن پاک کی تفسیر بھی انہوں نے لکھی۔قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں"تعزیراتِ ہند" اور"قانونِ شہادت" مشہور ہیں۔نذیر احمد کی اصل شہرت ان کے ناولوں کی وجہ سے ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔حالاں کہ بحیثیت ناول انہوں نے نہیں لکھا۔ان کے سامنے پہلے

سے ناول کا خاکہ یا نمونہ اردو میں موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے ان کے ناول فکری اور فنی اعتبار سے کمزور ہیں البتہ ناول کے عناصر ترکیبی ہونے کی بنا پر ان کی تصانیف کو ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے۔پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' 1869ء میں لکھا جو کہ اپنی لڑکی کی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لیے لکھا تھا۔لیکن ایک انگریز کلکٹر کی فرمائش پر اسے شائع کیا جو مقبول ہوگیا۔دوسرا ناول ''بنا ت النعش'' بھی اسی مقصد سے لکھا۔تیسراناول ''توبۃ النصوح'' سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔اس کو پڑھ کر دلی کے اجڑتے ہوئے مسلم خاندانوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔اس ناول کا ایک زندہ جاوید کردار ''مرزا ظاہر دار بیگ'' ہے۔ان کے دیگر ناولوں کے نام ''ابن الوقت ''، ''فسانۂ مبتلا''، ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ '' ہیں۔

نذیر احمد کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ فن کے اعتبار سے ان کے ناول' ناول کے بجائے خطبات نظر آتے ہیں جس میں اصلاح معاشرت کی بات کہی گئی ہے۔مگر اعتراض کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس وقت سماجی مسائل مسلمانوں کے درمیان سب سے اہم مسئلہ بنا ہوا تھا اور سر سید تحریک کے زیر اثر نذیر احمد بھی ناولوں کے ذریعہ لوگوں کو نئی راہ دکھانا چاہتے تھے۔اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی تمام خوبیاں تلاش کرنا بے کار ہے۔مگر انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کی بہترین تصویریں ان ناولوں میں ملتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر ناول کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں بلکہ دیگر کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوچکے ہیں۔نذیر احمد زبان کے بادشاہ ہیں۔دلی کی عام بول چال' محاورے 'کنایے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ علمی زبان کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی عربی کے نامانوس لفظ اور بے جا محاورے لکھ دیتے ہیں۔دو رخی زبان ہونے کے باوجود یہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بقول سید عبداللہ نذیر احمد کا منفرد اسلوبِ بیان دلوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے۔یہ خاص رنگ سر سید کے رفقا میں سے کسی کو حاصل نہ ہوا۔

15.4.4 نواب محسن الملک:

نواب محسن الملک کا سرسید کے خاص رفقا میں شمار ہوتا ہے۔اٹاوہ (اترپردیش) کے رہنے والے تھے۔انگریزی حکومت میں معمولی ملازمت کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر تک پہنچے۔اٹاوہ میں ملازمت کے دوران سرسید سے ملاقات' تعارف اور پھر زندگی بھر گہری دوستی و رفاقت قائم ہوگئی۔کچھ عرصہ حیدرآباد میں رہے۔1893ء میں علی گڑھ آگئے اور سر سید کے سچے معاون بن کر رہے۔سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور سر سید کے انتقال کے بعد 1899 ء میں کالج کے سکریٹری بنائے گئے۔

نواب محسن الملک فکری اعتبار سے اپنے رفقا میں سرسید کے زیادہ قریب تھے اور ان کی کتابیں بھی دراصل ان ہی خیالات کی ترجمان ہیں۔اس لیے تمام کتابیں مذہبی اور تہذیبی موضوعات پر ہیں۔''تہذیب الاخلاق'' پرچہ میں سر سید کے بعد سب سے زیادہ مضامین انہوں نے لکھے۔ان کے ذریعہ محسن الملک کی ادبی رجحان کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ان کا اندازِ بیان

سادہ اور شیریں ہے۔ تمثیل سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کا ایک مضمون تعلیم و تربیت ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا ایک اقتباس دیکھیے۔

"ایک روز خیال نے مجھے عالمِ مثال تک پہنچایا ...... جب میں عالمِ مثال (وہاں) سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے ہیں۔ صرف یہ کہہ کہ باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا ہے وہ علوم و فنون جدیدہ کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پر ہمارا اپنا دل بہلانے والا کوئی وہاں نہیں جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے وہ پتھر جو سر چشمہ پر آگیا ہے۔ جہالت ہے' وہ ندی نالے' گندے پانی کے رسم رواج کی پابندی " سیلی" نما تعصب' علم نما نادانی ' جھوٹا زہر' جھوٹی شیخی' جاہلانہ تقلید' عامیانہ علامی' ضرر انگیز حرارت' وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں جانتے۔"

یہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ فکر کے ساتھ ساتھ کہنے کا انداز بھی بالکل سر سید جیسا ہے اور مقصدیت غالب ہے۔ لیکن ایسی عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ محسن الملک کے اندر کہانی لکھنے کی پوری صلاحیت نظر آتی ہے ان کے دیگر مضامین "تدبیر و امید" اور "عزت " وغیرہ اہم ہیں جس میں ادبیت بھرپور نمایاں ہے۔ محسن الملک کا مقام اردو ادب میں گرچہ وہ نہیں ہے جو حالیؔ اور شبلیؔ کا ہے مگر ادب کو نئی جہت اور جدت ادا کرنے میں وہ ان کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں۔

15.4.5 دیگر رفقا:

سرسید کے دیگر رفقا بھی ہیں جنہوں نے بہت کچھ لکھا مثلاً منشی ذکا ء اللہ اور مولوی چراغ علی وغیرہ مگر ان کے موضوعات ادب سے ہٹ کر ہیں۔ منشی ذکاء اللہ مشہور ریاضی داں اور تاریخ نگار تھے۔ یہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دہلی کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں انہوں نے لکھی ہیں۔ تاریخ اور ریاضی سے ہٹ کر مضامین تہذیب الاخلاق میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سر سید کی مجوزہ ورناکلر یونیورسٹی کے معاون و موئید تھے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے حامی منشی ذکا ء اللہ نے اپنی زندگی میں محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار صفحات لکھے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اگر انہوں نے ادب کو بھی اپنا موضوع بنایا ہوتا تو یقینا اردو کے نامور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا۔ چراغ علی نے علمی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر انہیں زبردست عبور حاصل تھا۔ متعدد کتابیں انگریزی میں بھی ہیں۔ یہ بھی محسن الملک کی طرح فکری اعتبار سے سر سید سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ اپنی کتابوں میں سر سید کے مذہبی افکار کی ترجمانی کی ہے۔

اردو کے ایک اور بڑے ادیب ہیں جن کا تعلق براہ راست سر سید تحریک سے نہ تھا مگر ادبی اور فکری پہلو سے اس تحریک کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہیں مولوی محمد حسین آزادؔ۔ انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں خدمات انجام دیں۔ ”انجمن ِ پنجاب لاہور“ کے روح رواں یہی تھے۔ اردو شاعری کو فطری اور موضوعاتی بنانے میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالیؔ بھی اس سے وابستہ تھے۔ محمد حسین آزاد کی مشہور کتابوں میں قصص ہند' آب ِ حیات' نیرنگ ِ خیال' دربار ِ اکبری ' سخندان ِ فارس' کلام نظم آزاد وغیرہ ہیں۔ آب ِ حیات کو زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ اردو شعرا کا تذکرہ پہلی مرتبہ اس میں سماجی پس منظر ' تاریخی ارتقا اور ادبی شعور کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

15.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ء کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس سال ہندوستان کے تمام طبقوں اور قوموں نے مل کر ایک ساتھ انگریزوں کو ملک سے بھگانے کی آخری کوشش کی جو کہ ناکام ہوئی مگر اس کے بعد ہندوستان کی صدیوں پرانی روایات' سیاست' تعلیم' معاشرت' مذہب اور تہذیب و ثقافت سب کچھ متاثر ہوئیں۔
- قدیم و جدید کی کشمکش کھل کر سامنے آگئی اور یہ کشاکش ہر میدان میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ عمل اور رد عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی بات ہے۔ اب ہر میدان میں پسپا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔
- رہنمایانِ قوم نے اصلاحی کوششیں تیز کردیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام یقینا سرسید کا ہے جنہوں نے اپنے ساتھ بہترین اور باصلاحیت افراد کو لے کر قومی ' ملی' تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دیں۔
- سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قائم کرنا ہے۔ یہ کالج آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی نے بڑا کام کیا۔
- سرسید نے دوسرا بڑا کام تہذیب الاخلاق پرچہ کے ذریعہ معاشرتی اصلاح کا کیا۔ اس میں مسلسل مضامین لکھ کر اور اہلِ قلم حضرات سے لکھوا کر ذہنی اور فکری جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے ایک پرچہ میں 29 نکات کا پروگرام دیا۔
- تیسرا کام یہ کیا کہ سر سید نے اردو ادب کو ایک رجحان اور تخلیقی ادب سے مالا مال کردیا۔ اپنے مضامین کے ذریعہ موضوع ' اسلوب ' فکر اور فن تمام چیزوں میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ ادب کے لیے یہ ایک بڑی خدمت ہے۔ شاعری سے دلچسپی نہیں تھی البتہ نثر نگاری میں سرسید کی بڑی خدمات ہیں۔
- سر سید' غالب اور شیخ سعدی کی سوانح عمریاں لکھیں۔ شبلی نعمانی علی گڑھ کالج میں استاد تھے۔ سر سید کو قریب سے

دیکھنے اور ان کے کتاب خانے سے استفادے کا موقعہ ملا۔زبردست عالم تھے۔

- علم الکلام اور فلسفہ کے علاوہ تنقید سوانح نگاری' مضامین ' مقالات ' تنقید اور شاعری میں کامل دست رس تھی۔ مختلف شخصیات کی متعدد سوانح عمریاں لکھیں۔سیرۃ النبی بڑی تحقیقی اور مدلل کتاب ہے۔
- شعر العجم میں اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے۔سیاسی اور اخلاقی نظمیں بھی کہیں۔
- ڈپٹی نذیر احمد ناولوں سے پہچانے جاتے ہیں۔انھیں اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔کل سات ناول لکھے۔پہلا ناول مراۃ العروس ہے۔"توبۃ النصوح" اور" ابن الوقت" اپنے نفس مضمون کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔
- نذیر احمد بڑے اچھے خطیب بھی تھے۔دہلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان لکھتے اور بولتے تھے۔قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے۔سر سید کے دو رفقا ایسے تھے جو فکری اعتبار سے ان کی ترجمانی کررہے تھے۔ایک محسن الملک دوسرے چراغ علی۔ان دونوں نے ادبی سے زیادہ مذہبی میدان میں کام انجام دیا ہے۔

15.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ریشہ دوانیاں	:	سازش' جوڑ توڑ
استبداد	:	ظلم و جور
مؤخر الذکر	:	آخر میں کہی گئی بات
عسکری	:	فوجی
زعم	:	غرور' تکبر
استدلال	:	دلیل' ثبوت
استطاعت	:	طاقت' قدرت
بیرونی	:	باہری
مہلک	:	ہلاک کرنے والی
خصلت	:	عادت
حتی المقدور	:	جہاں تک ہوسکے' ممکن حد تک
فراموش	:	بھلانا
فروغ	:	ترقی دینا

افادیت	:	فائدہ پہنچنا
تلمیحات	:	اشعار میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا
مجوزہ	:	تجویز کی ہوئی چیز
صدیوں	:	سینکڑوں
کشاکش	:	رسّہ کشی، کھینچا تانی
رفقا	:	ساتھ رہنے والے افراد
حامل	:	بوجھ اٹھانے والا، کسی چیز کو لے جانے والا

15.7 نمونۂ امتحانی سوالات

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کس نے جاری کیا؟

(a) مولوی نذیر احمد (b) مولوی ذکاءاللہ (c) محمد حسین آزاد (d) سرسید احمد خان

2۔ ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کا قیام کب عمل میں آیا؟

(a) 1875 (b) 1870 (c) 1860 (d) 1860

3۔ ''اسباب بغاوت ہند'' کا مصنف کون ہے؟

(a) مولوی نذیر احمد (b) سرسید احمد خان (c) محمد حسین آزاد (d) مولوی ذکاءاللہ

4۔ ''حیات جاوید'' اور ''حیات سعدی'' کا مصنف کون ہے؟

(a) مولوی ذکاءاللہ (b) مولوی چراغ علی (c) مولانا حالی (d) مولانا شبلی

5۔ ناول ''مجالس النساء'' کس نے تحریر کی؟

(a) مولانا حالی (b) رتن ناتھ سرشار (c) عبدالحلیم شرر (d) نذیر احمد

6۔ ''المامون'' اور ''الفاروق'' کا خالق کون ہے؟

(a) شبلی نعمانی (b) مولانا حالی (c) محسن الملک (d) محمد حسین آزاد

7۔ اردو کا پہلا ناول نگار کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(a) نذیر احمد (b) پریم چند (c) عبدالحلیم شرر (d) منشی گمانی لعل

8۔ الطاف حسین حالی کہاں پیدا ہوئے؟

(a) پانی پت (b)دہلی (c)بلند شہر (d)بدایوں

9۔ ذیل کی کون سی کتاب شبلی نعمانی کی نہیں ہے؟

(a) سیرۃ النبی (b)الغزالی (c)حیات شبلی (d)شعر العجم

10۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کل کتنے ناول لکھے؟

(a)پانچ (b)سات (c) تین (d)چار

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا تعارف کرائیے۔

3۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت کیوں ہے؟ بیان کیجیے۔

4۔ شبلیؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ اردو ادب کو شبلی سے کیا فائدہ پہنچا؟ نشان دہی کیجیے۔

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سر سید کے رفقا کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

2۔ سر سید کی تعلیمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ حالیؔ و شبلیؔ میں سے کسی ایک کے ادبی مقام کی نشان دہی کیجیے۔

15.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالیؔ
2۔	سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی
3۔	سر سید اور ان کے نام و رفقا	سید عبداللہ
4۔	میر امن سے عبدالحق تک	سید عبداللہ

15.7.1 کے جوابات: 1-d 2-a 3-b 4-c 5-a

6-a 7-c 8-a 9-c 10-b

اکائی16: ترقی پسند تحریک

اکائی کے اجزا

16.0 مقصد

16.1 تمہید

16.2 ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

16.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

16.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز و ارتقا

16.5 افتتاحی کانفرنس کی اہم تقریریں

16.6 اہم مصنفین

16.7 اکتسابی نتائج

16.8 کلیدی الفاظ

16.9 نمونۂ امتحانی سوالات

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

اردوادب میں جو چند ادبی تحریکیں رونما ہوئی ہیں ان میں سب سے کامیاب تحریک ترقی پسند تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے ادب کو زندگی کے حقائق سے قریب کیا۔1936 ء میں اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔اردو کے معروف شاعروں ، ادیبوں نے اس تحریک کی سر پر ستی کی۔اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر یہ تحریک کیا ہے؟ اس تحریک کا پس منظر کیا ہے؟ اور اس کے آغاز و ارتقا کے مراحل کیا رہے ہیں؟

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- ترقی پسند تحریک سے اپنی واقفیت کا اظہار کر سکیں۔
- اس کے پس منظر کے بارے میں بیان کر سکیں۔
- اس کے آغاز و ارتقا کے تعلق سے گفتگو کر سکیں۔

16.2 ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

تحریک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''کسی بات کو شروع کرنے '' کے ہیں۔ اصطلاحاً کسی مقصد کے حصول کے لیے جب افراد کا گروہ کوشش کرتا ہے تو اسے تحریک کہتے ہیں، خواہ اسے کسی بھی حد تک کامیابی حاصل ہو۔ ترقی پسند تحریک بھی ظاہر ہے کہ ایک تحریک ہے اور اس تحریک کے مخصوص مقاصد میں غریبوں کو ان کا حق دلانا، عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرنا، انسان دوستی اور آزادیٔ ہند کی کوشش شامل تھی۔ گو یا ادب کو گل و بلبل اور کنگھی چوٹی سے بالا تر کر کے اسے مقصد یت سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد لندن میں رکھی گئی۔ 1930 ء میں لندن میں چند ہندوستانی طالب علموں نے اپنے ملک کے سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی و جستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہند وستانیوں کو پستی ، غلامی ، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا عزم کیا۔ اس تحریک سے متعلق اور اس کے نظریوں سے اتفاق رکھنے والے ادیبو ں نے اپنی اپنی زبان کے ادب میں ترقی پسند خیالات کی تبلیغ و تشہیر کی اور اس طرح اس تحریک نے پورے ہندوستان میں اور ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کے وسیلے سے ''انسانیت کا نشاۃ ثانیہ'' تھا۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل 1936 ء میں لکھنؤ میں منعقدہ اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت شہرہ آفاق ادیب منشی پریم چند نے کی تھی۔ اردو کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی سر پرستی کی جن میں منشی پریم چند،مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی ، فراق گورکھپوری، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض ، ملک راج آنند، عزیز احمد وغیرہ شامل تھے۔ اس کانفرنس کے بعد ہی اس تحریک نے اپنی منظم صورت اختیار کی اور مختلف زبان کے ادیبوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ یہ تحریک اس دور میں اس حد تک اثر انداز ہوئی کہ پرانے اور تجربہ کار قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ہر نیا لکھنے والا اس تحریک سے خود کو وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں دہائی میں ترقی پسندی نے فیشن کی صورت اختیار کر لی تھی لیکن 1950 ء کے بعد تحریک میں ایک طرح کا جمود آگیا جو کہ آزادی ہند اور تقسیم ہند کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحریک میں

از سرنو زندگی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن اسے عروج نو حاصل نہ ہوا۔یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت سر اُبھارنے لگی تھی۔جدیدیت کی تحریک کو بھی اُردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

16.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہو گا کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا۔لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ان طلبہ کا گر چہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ہندوستان میں غریبوں اور مجبوروں پر ہونے والے مظالم کی خبریں ان تک پہنچتی رہتی تھیں اور ان میں برطانوی حکومت اور سر مایہ دار طبقہ کے خلاف غم وغصہ بڑھتا جاتا تھا۔لہٰذا ہندوستانی نوجوانوں نے جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند ، جیوتی گھوش ، محمد دین تاثیر اور پر مودسین گپتا وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں" انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن" قائم کی۔پھر اس کا اعلان نامہ تیار کیا گیا جس میں کہا گیا کہ:

> " ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجو ہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا ' بد حالی کا' ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔" (یعقوب یاور ' ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ص۔54-55)

اس کے علاوہ اسی اسوسی ایشن نے ایسی تجاویز بھی پیش کیں جن کی بنیاد پر ادیبوں کو اور اس اسوسی ایشن کو آگے کی کارروائی کرنی تھی۔مثلاً "ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا' ان انجمنوں کے درمیان جلسوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط و تعاون پیدا کرنا۔صوبوں کی ' مرکزی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان تعلق پیدا کرنا ' ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں' ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کر نا جو صحتمند اور توانا ہو' جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں' فکر و نظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا' ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا' عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں۔" وغیرہ۔(رسالہ ہنس' بنارس۔اکتوبر1935 ء)۔اس گروپ نے اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ لندن کے ایک چینی ریستوران " نان کنگ ریستوران" میں کی جس میں ملک راج آنند کو صدر منتخب کیا گیا۔یہ لوگ پیرس میں منعقدہ World congress of the writers for the defence of culture سے بھی کافی متاثر ہوئے۔ اس کانفرنس میں میکسم گورکی ' ویلڈوفرینک ' آندرے مارلو' برتول بریخت ' ای ایم فاسٹر 'لوئی آراگان ' بورس پاسترنک اور رومین رولاں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی اور انہوں نے جو تجاویز منظور کی تھیں ان میں انسانیت کی بالا دستی اور مظالم کی سر کوبی کے عزائم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔پوری دنیا کے ادیبوں کو متحد کرنے کی یہ ایک بہت بڑی اور کامیاب

کوشش تھی۔اس کانگریس سے انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن کے ارکان کو اپنے مقاصد کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملی اور انھوں نے اپنی کوشش لندن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شروع کردی۔اُنھوں نے اپنے ''اعلان نامے'' کو ہندوستان کے اہم ادیبوں تک پہنچایا۔پریم چند نے اس کی زبردست حمایت کرتے ہوئے اسے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کر دیا۔مجموعی طور پر پورے ملک میں اس اعلان نامے کا خیر مقدم کیا گیا۔1935 ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آ گئے۔انھوں نے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔اس سے پہلے'' انگارے'' کے افسانوں نے ماحول کو کافی گرم کر دیا تھا جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر ' احمد علی' محمود الظفراور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔ان میں سے موخرالذکر تین ادیبوں نے ہندوستان میں ترقی پسند نظریات کی تبلیغ سجاد ظہیر کی آمد سے پہلے ہی شروع کردی تھی۔اندرون ہندوستان اور لندن میں کی گئی تمام جدوجہد کا نقطہ عروج اپریل 1936 ء میں لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صورت میں سامنے آیا' جہاں ہندوستان کی تعمیروتشکیل اور صحت مند معاشرے کی رہنمائی کے لیے ادیبوں کی ذمہ داریوں پر کھل کر گفتگو ہوئی۔

اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا خمیر دو عوامل سے تیار ہوا۔اول تو لندن میں زیر تعلیم ہندوستانی نوجوانوں کی فکر اور دوم ہندوستان میں ''انگارے'' کی اشاعت۔یہ دو ایسے عوامل تھے جس نے ترقی پسند تحریک کی راہیں ہموار کیں۔اِن کے علاوہ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ ہندوستان میں بیداری کی تحریکیں ایک زمانے سے جاری تھیں۔شاہ محدث دہلوی کی تحریک' وہابی تحریک ' راجہ رام موہن رائے کی تحریک اور پھر سرسید کی علی گڑھ تحریک خاص طورپر قابل ذکر ہیں۔اِسی درمیان آزادی کی تحریک بھی شروع ہوگئی اور نہ صرف اندرون ہندوستان بلکہ پوری دُنیا سے اس کی حمایت کی جانے لگی۔دراصل ہندوستانی عوام میں ایک نئی صبح کی تلاش کی جستجو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔گرچہ ہندوستان میں انگریزوں نے ایسے کئی کام کیے جو ہندوستانیوں کے حق میں تھے اور سماجی سطح پر اُن کی اصلاح ہوئی۔اُنھوں نے مقامی حکومتوں کے تسلط کو کمزور کرایا' ستی اور اُس طرح کی اندھی عقیدت والی کئی رسومات کا خاتمہ کیا ' جوٹ کے مل اور سوت کا کارخانے لگائے جہاں ہزاروں مزدوروں کو روزی روٹی کا سہارا ملنے لگا مگر غلامی سے نجات کا لاوا پکتا گیا اور وہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ قومی بیداری کا جذبہ تیز ہوتا چلا گیا۔

ترقی پسند تحریک کے پس منظر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والی تمام سرگرمیوں اور پیش رفت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔1880 ء کے آس پاس ہندوستان کے ہرطبقے میں یہ احساس شدید ہوگیا تھا کہ برطانی حکومت ہندو ستان میں اپنا تسلط اور رعب و دبدبہ برقرار رکھنے کے لیے یہاں کے عوام کا استحصال کررہی ہے۔اُنھیں ہندوستانیوں سے یا ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے کسی بھی طرح کی ہمدردی نہیں ہے۔وہ یہاں خالصتاً بیرونی حکمراں کے طور پر مقیم رہنا چاہتے ہیں اور اپنی معیشت اور اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے

ہندوستان کی کسی بھی چیز کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے گرچہ ہندوستان پر قبضہ کرلیا ہے اور اپنی حکومت قائم کرلی ہے' لیکن اِس ملک کو اپنایا نہیں ہے۔ اُنہیں یہاں کے افراد یا سماج سے کسی طرح کی ہمدردی نہیں ہے۔ اِسے اپنا ملک نہیں بلکہ اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا غلام جس سے صرف کام لیا جاتا ہے' فائدہ اُٹھایا جاتا ہے ' اُس کے جذبات یا اُس کے بہتر مستقبل کی کوئی فکر نہیں کی جاتی ہے۔ کام لیتے ہوئے غلام کو جتنی بھی اذیت پہنچے ' اُسے جذباتی' نفسیاتی ' تہذیبی یا سماجی سطح پر جو بھی نقصان پہنچے' اُس کے بارے میں سوچنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں مختلف سطح پر ردعمل ظاہر ہونے لگا۔ ابتدا میں لوگ آپس میں باتیں کرتے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات پر تشویش کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُنہیں یہ احساس ہوچلا کہ اُنہیں اپنی لڑائی اب خود لڑنی ہے۔ گاؤں گاؤں ' قریہ قریہ انقلابی جذبات بیدار ہونے لگے۔ لوگ ذہنی طور پر کسی نامعلوم اور ناگہانی صورتِ حال کی تیاری کرنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ شروع کے دنوں میں "انقلاب" اور "مکمل آزادی" کے تصور کے بغیر ہی برطانوی حکومت کے خلاف لوگ متحد ہونے لگے تھے۔ سبھوں کو اندیشہ تھا کہ آنے والا وقت بہت برا ثابت ہوگا۔ اُن پر مظالم ڈھائے جائیں گے اور کسی طرح کی نرمی یا مروت نہیں کی جائے گی۔ لوگوں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں متحد ہوکراپنی اپنی سطح پر اور اپنے اپنے انداز میں اُن خطرات سے نپٹنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ منصوبہ بندی ہونے لگی۔ لاٹھی' بھالے' تلواراور بندوقیں بھی جمع کی جانے لگیں۔

دوسری طرف انگریز حکمرانوں اور اُن کے حامیوں کی اِس کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اُن کے مخبر اور افسران ڈائریوں اوررپورٹس کی شکل میں اپنے ارباب بالا کو صورتحال سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اُنہیں یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ ہندوستانیوں کو آزادی کا خیال آنے لگا ہے۔ وہ لوگ ہندوستان کی آزادی ' یعنی برطانی حکومت کے اخراج کا خواب دیکھنے لگے ہیں۔ اسی دوران ایک بہت تاریخی واقعہ پیش آیا جب 1885 ء ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ایلن اوکٹیوین ہیوم(Allan Octavian Hume) نے ممبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ گرچہ اس کانگریس کے قیام میں زیادہ ترہندوستانی ہی شامل تھے جن کا تعلق ممبئی' مدراس اور کلکتے سے تھا مگر کہا یہ جاتا ہے کہ اس کانگریس کے قیام کے پس پشت انگریزوں ہی کا دماغ تھا۔ اُن کا مقصد ہندوستانیوں کے دلوں میں ملک کے ساتھ ملک کے موجودہ حکمرانوں کے لیے ہمدردی پیدا کرنا تھا۔ شروع میں جب آنندموہن بوس ،حسرت موہانی اور دیگر لیڈروں نے "مکمل آزادی" کی تحریک چلانی چاہی تو مہاتما گاندھی نے ان کی مخالفت کی اور یہ کہتے رہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ کانگریس میں موجود رہنماؤں نے اکثر موقع پر انگریزوں کے ساتھ تعاون کا رویہ اختیار کیا۔ پہلی جنگ عظیم 1914ء میں بھی کانگریس برطانی حکومت کی تائید کرتی رہی بلکہ اُس کی حمایت میں قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔ 1918 ء میں جب جنگ کا اختتام ہوا تو گاندھی جی نے وائسرائے کو خط لکھ کر برطانی حکومت کو مبارکباد دی۔ اُنہیں لگتا تھا کہ ایسے خوش اخلاقانہ رویوں سے برطانی پگھل جائیں گے اور وہ ہندوستانیوں کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اُن کی سخت گیری اور جابرانہ رویے میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نتیجے

کے طور پر پورے ہندوستان' خاص طور پر بڑے شہروں میں احتجاج اور انقلاب کا بازار گرم ہونے لگا۔دیکھتے ہی دیکھتے اِس لہر نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں شروع ہی سے دو طرح کے نظریے کام کررہے تھے۔ایک گرم رویہ تھا اور دوسرا نرم۔گرم رویے والوں کا ماننا تھا کہ آزادی کسی بھی طرح سے حاصل کرلینی ہے۔اس کے لیے خون دینا بھی پڑسکتا ہے اور خون بہانا بھی پڑسکتاہے۔اس گروپ کے مشہورنام آربندو گھوش' بپن چندر پال'لالہ لاجپت رائے اور بال گنگا دھر تلک وغیرہ تھے۔نرم رویے والوں کا خیال تھا کہ آزادی ستیہ گرہ اور بھوک ہڑتال وغیرہ کے ذریعہ یعنی امن و امان سے تحریک چلاتے ہوئے حاصل کی جائے۔اس کا سب سے مضبوط طریقہ بات چیت اور افہام و تفہیم کو قرار دیا گیا۔گاندھی جی اس میں پیش پیش تھے۔بہرحال دونوں ہی نظریوں کا مقصد حصول آزادی تھا لہٰذا پورے ملک میں آزادی کی تمنا جاگ اُٹھی اور گاؤں گاؤں سے آزادی کی مانگ ہونے لگی۔کہیں ہندوستانی جھنڈے لگادیے جاتے تو کہیں برطانی جھنڈے جلادیے جاتے۔کہیں نعرے لگائے جاتے تو کہیں قومی گیت گائے جاتے۔غرض یہ کہ پورا ملک عملی یا نظری طور پر تحریک آزادی میں شریک ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم 1914 ء کا بھی اثر ہوا۔اِس تعلق سے ایک مضمون لکھنے پر بال گنگا دھر تلک کو چھ سال کی جیل ہوگئی۔ملک کے سوت کارخانوں میں ہڑتالیں ہونے لگیں۔اسی دوران جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آگیا جو ہندوستانیوں کو بہت گراں گزرا۔جنرل ڈائر نے ہزاروں نہتے ہندوستانیوں پر گولی چلوا دی۔1917 ء میں انقلاب روس نے بھی ہندوستانیوں کے جذبے کو مہمیز کیا اور لوگ ایک آزاد ملک کا خواب دیکھنے لگے۔قومی اورعالمی دونوں ہی سطحوں پر یہ دور شکست و ریخت اور کش مکش کا دور تھا۔ہندوستان کا ہر طبقہ اس سے متاثر تھا۔دانشور طبقہ اور ادیب حضرات بھی اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے۔اور پھر جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ لندن میں موجود ہندوستانی طلبہ نے میٹنگ کی اور بتدریج اُس آگ نے پورے ہندوستان کے ادیبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک کا مطالعہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس کی محرک وہ قوتیں ہیں جنہوں نے اُردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی کافی حد تک متاثر کیا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا اثر دنیا کی چھوٹی بڑی تمام زبانوں پر پڑا ہے۔تاریخ کے کسی زمانے میں کم ایسی عالمگیر قوتیں برسرکار آئی ہوں گی جن سے انسانی سرگرمی اور کارکردگی اتنی متاثر ہوئی ہو جتنی کہ اس ترقی پسند تحریک سے جو بحیثیت مجموعی اشتراکی نقطہ نظر کی تائید اور ترجمانی کرتی ہے۔
>
> ''اُردو ہندوستان کی سب سے نوعمر زبانوں میں ہے' اس اعتبار سے اس کا ترقی پسند ہونا فطری ہے لیکن اس کا ربط اور رشتہ بڑی قدیم اور وقیع زبانوں اور روایات سے بھی ہے اس لیے یہ قدیم کی بھی اتنی ہی گرفت میں ہے۔ایسی زبان پر ایک ایسی عالمگیر تحریک کا کیا اثر ہوگا اور اس کے کیا

نتائج ہوں گے بڑا اہم مطالعہ ہے۔"

(تعارف ' اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی)

ہندوستانی تناظر میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک بیک وقت ادبی اور سماجی دونوں سطحوں پر کام کر رہی تھی۔ادیبوں نے ادب کی ادبیت کو ہمیشہ اولیت دی ہے تاہم پہلے ادیب حضرات ادب کے ذریعے اخلاقی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ترقی پسند تحریک کے زیراثر قلمکاروں نے سماجی انصاف اور مساوات کے پیغام کو بھی عام کرنا شروع کر دیا۔ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اپنی معروف کتاب اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے "مقدمہ" کا آغاز اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

"علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس کے زیر اثر ہمارے ادب کو بعض بڑی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا۔جن لوگوں نے اُردو ادب کے مختلف شعبوں کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے اور زمانۂ حال کے ادبی رجحانات کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا ہے ' ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہماری زبان میں شعروادب کا ایک متعدبہ ذخیرہ اس تحریک کی پیداوار ہے۔ترقی پسند مصنفین کے نام سے ہمارے ملک میں جو تحریک 1935 ء میں شروع ہوئی اس کی یہ خصوصیت نظر میں رکھنے کی ہے کہ یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اتحاد و اشتراک کا ایک وسیلہ بن گئی۔ اُردو زبان میں اس تحریک کے نظریاتی ارتقا اور اس کے ادبی سرمائے کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے کو اپنا موضوع بنانا اُردو ادب کے ایک اہم دور کی تاریخ مرتب کرنا ہے۔"

ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے بیان کے دوران آپ کو "انگارے" کے بارے میں بھی علم ہوا۔ آیئے ہم یہ جانتے ہیں کہ "انگارے" میں وہ کیا بات تھی کہ اُس نے اُس عہد کے ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔لوگوں نے اُسے ایک انتہائی بے خوف آواز قرار دیا اور اُس نے بعد کے اُردو فکشن کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔"انگارے" کی اشاعت 1932 ء میں ہندوستان کے شہر لکھنوٴ میں عمل میں آئی۔اس میں چار افسانہ نگاروں کی 9 کہانیاں شامل تھیں۔پانچ کہانیاں سجاد ظہیر کی' دو احمد علی کی' ایک رشید جہاں اور ایک محمود الظفر کی۔آخر میں رشید جہاں کا ایک ڈرامہ بھی شامل کتاب تھا یعنی کتاب دس تخلیقات پر مشتمل تھی جس کے محرک' مرتب اور ناشر خود سجاد ظہیر تھے۔ممتاز ترقی پسند ادیب پروفیسر قمر رئیس نے اپنے مضمون "اُردو افسانہ میں انگارے کی روایت" (مشمولہ تلاش و توازن)میں لکھا ہے کہ :

> "اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ "انگارے" کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی۔بوسیدہ عقیدوں' فرسودہ اداروں'سماج دشمن طاقتوں اور مجہول سماجی و اخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئے انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔امیروں' حاکموں اور اہل اقتدار کے مقابلے میں زیردستوں'

نااداروں،مجبوروں اور محکوموں کی حمایت ادب میں ایک ایسے دور کی آمد کا اعلان تھی
جب تخلیقی ادب کی بنیادطبقاتی شعور اور اشتراکی انسان دوستی پر رکھی جانی تھی۔موضوع ،
مواد اور فن کے نئے تجربے تخلیقی اظہار کے ان بے شمارنئے سانچوں کی جستجو کی علامت
تھے جسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاتھوں نقطہ کمال تک پہنچنا تھا۔"

قمر رئیس نے انگارے کو ترقی پسند تحریک کی بشارت قرار دیا ہے یعنی اس مجموعے نے تحریک کے لیے پس منظر اور ماحول تیار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔یہ الگ بات ہے کہ"انگارے" کی زبان، بے باکانہ انداز، مواد ،حاکم طبقے پر راست حملے اور مذہب کے تعلق سے کھل کر بات کرنے کے سبب اِس پر کافی اعتراضات کیے گئے۔اس کے خلاف بے شمار مضامین لکھے گئے اور اسے ضبط کرلینے کی مانگ کی گئی۔نتیجے کے طور پر اگلے ہی سال کتاب پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ جہاں جہاں کتاب پہنچی تھی ،حتی الامکان وہاں سے اُٹھا لی گئی اور جہاں اس کا اسٹاک تھا وہاں اُسے نذر آتش کردیا گیا۔

انگارے سے کافی قبل جون 1908 ء میں ایک اور کتاب شائع ہوئی تھی جس نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔وہ کتاب پریم چند کا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" تھا۔اس مجموعے میں پانچ کہانیاں شامل تھیں۔دُنیا کا سب سے انمول رتن،شیخ مخمور،یہی میرا وطن ہے ، صلہ ماتم اور عشق دُنیا اور حُبِ وطن۔اِن کہانیوں کے ذریعے وہی پیغام دینے کی کوشش کی گئی تھی جس کو بعد میں منظم شدہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے اپنا لائحہ عمل بنایا۔اس مجموعے کے تعلق سے ایک اشتہار ملاحظہ کیجیے جو اُن دنوں منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں شائع ہونے والے اُردوکے ماہانہ رسالے "زمانہ" میں شائع ہوا کرتا تھا۔یہ اشتہار خود پریم چند کا تیار کردہ تھا:

"اُردو زبان میں حسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری،جنگ و جدل وغیرہ کی بہت
سی داستانیں موجود ہیں۔ان میں بعض بہت دلچسپ ہیں۔مگر ایسے قصے جن میں سوزِ وطن
کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے اس وقت تک معدوم ہیں۔اس
کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے ہیں اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ممکن نہیں
کہ انہیں پڑھ کرناظرین کے دل میں وطن کا پاک جذبہ موجزن نہ ہو جائے۔"

اِس اشتہار سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ ان پانچ کہانیوں کے مجموعے میں کس طرح کے موضوعات قلم بند کیے گئے تھے۔انجام یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعداُنہیں انگریزی حکومت کی طرف سے بلایا گیا۔کتاب کے مواد پر اعتراض کیا گیا اور حکم ہوا کہ ساری کتابیں حکومت کے پاس جمع کروادیں۔سرکار نے جمع شدہ کتابوں کونذرآتش کردیا۔اور اس کی مزید اشاعت پرپابندی عائدکردی۔گرچہ "سوزِ وطن" کی اشاعت کے وقت ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا لیکن اس میں اُسی طرح کا مواد پیش کیا گیا تھا جنہیں بعد میں تحریک نے بھی اختیار کیا۔لہٰذا اِس کتاب کو بھی ترقی پسندی کا پیش خیمہ کہا جا سکتا

ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے جو طلبا کے لیے جاننا بہت ضروری ہے کہ اِس کتاب پر پابندی کے ساتھ پریم چند پر یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ اب وہ جو کچھ بھی لکھیں گے ' اُسے حکومت سے اجازت لینے کے بعد ہی اشاعت کے لیے بھیجیں گے۔ ہر تحریر کی منظوری پریم چند کے لیے ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنا نام بدل لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ کتاب پریم چند کے پہلے نام "نواب رائے" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب اُنھوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کردیا۔ یعنی سوزِ وطن ہی کے سبب نواب رائے ' پریم چند بن گئے۔ یہ نام دیا نرائن نگم نے تجویز کی تھی۔

اُمید ہے کہ اب آپ ترقی پسند تحریک کے پس منظر سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ اب آگے آپ سے اس تحریک کے آغاز و ارتقا کے تعلق سے باتیں ہوں گی۔

16.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز و ارتقا

ترقی پسند تحریک کا با قاعدہ آغاز اپریل 1936ء کی اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض وغایت بیان کی ' ادیبوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو " ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ " قرار دیا۔ اس خطبے میں انھوں نے کہا کہ " ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہترین زندگی کی راہ دکھائے۔"

پریم چند نے ادیبوں اورفنکاروں کے لیے حسن و جمال کی بدلتی ہوئی معنویت ' بدلتے ہوئے حالات اور عصری حسیت کے تناظر میں ادب کی تعریف بھی پیش کی ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی' سید سجاد ظہیر' احمد علی' فراق گورکھپوری' محمود الظفر ' حسرت موہانی ' جوش ملیح آبادی ' ساغر نظامی اور بنگال ' مہاراشٹر ' گجرات اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔ اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔

ترقی پسند نظریات کے ادیبوں کی اس کانفرنس میں ایک اعلان نامہ بھی پیش کیا گیا تھا جس میں اِن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہمارے ادیب زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے ہیں لہٰذا ہمارے ادب میں روحانیت ' تخیل کی پروازوں اور تصورات کی دُنیا نے اپنی جگہ بنا لی ہے۔ ہماری تحریروں میں استدلالی اور عقلی باتیں کم اور خیالی دُنیا کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جبکہ ادیبوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ادب کو قدامت پسندی' فرسودگی' خیال آرائی اور عبارت آرائی سے آزادی دلا کر اُس میں مفید اور سودمند باتیں شامل کریں۔ اعلان نامے میں یہ بھی کہا گیا کہ ہم لوگ نہ صرف آرٹ اور لٹریچر میں اعلیٰ قدروں' ہندوستانی تہذیب و تمدن اور صحت مند موضوعات کا احاطہ کریں گے بلکہ اس کے برخلاف جو لوگ بھی تخلیقات پیش کریں گے' ہم اُن کی مخالفت کریں گے۔ اُنھیں ایسا ادب پیش کرنے کی ترغیب دیں گے جو ہم وطنوں کو نئی روشنی اور بہتر

زندگی عطا کرنے میں معاون ثابت ہو۔بے بسی ' بے عملی اور فرسودہ خیالات کی دُنیا سے باہر نکالنے کی راہیں ہموار کرے۔ اِس اعلان نامے کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا:

> "ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے اس لیے ہندوستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات اُبھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں پورا حصہ لیں۔"(نیا ادب' جنوری فروری 1941 ء)

لکھنؤ کانفرنس کی خاطرخواہ کامیابی کے بعد مختلف شہروں میں انجمن کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور اس کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔دہلی' ممبئی ' کلکتہ' بھیمڑی ' حیدرآباد' الہ 'آباد' لکھنو' جے پور'رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اور سمینار ہوتے رہے۔بے شمار شاعر وادیب اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔جس کے سبب اس تحریک نے تنظیمی و علمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی۔

لیکن جس طرح دن کے بعد رات اور شام کے بعد صبح ہونا فطری امر ہے اسی طرح عروج کے بعد زوال بھی لازمی ہے۔اس تحریک کا آغاز ہوا ' عروج ہوا۔اس نے نسلوں کو متاثر کیا۔ادب کی فضا پرآسمان کی طرح سایہ فگن ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہوگئی۔یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ 1947 ء کے بعد جو تحریکیں ' جو ادارے تعطل اور انتشار کے شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک بھی کافی اہم ہے۔اس تحریک کے روح رواںسید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔بعض ادیب و شاعر نہیں رہے اور اسی طرح چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔1948 ء کے بعد کمیونسٹ پارٹی جس داروگیر کا شکارہوئی اس کی وجہ سے بہت سے ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہوگئے۔آزادی کے بعد خود ترقی پسند مصنفین نے ایک نئے قرار داد کے ذریعے غیر کمیونسٹ ادیبوں پر انجمن کے دروازے بند کر دیے۔انجمن اور تحریک کو نقصان پہنچانے میںاس واقعہ نے سب سے اہم رول ادا کیا۔اس تحریک کو پر و پگنڈہ اور نعرے کا نا م بھی دیا گیا۔بعض ادیب و شاعروں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ تحریک پرو پگنڈہ بن گئی ہے اور اس سے ادب مجروح ہورہا ہے تو انہو ں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔اس طرح آٹھویں دہائی کے آتے آتے ترقی پسند تحریک تحلیل ہوچکی تھی اور جدید یت پوری طرح سے سرابھار چکی تھی۔واضح رہے کہ یہاں تحلیل کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ تحلیل ہونے والے مادے کا وجود گر چہ بظاہر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی کوئی نہ کوئی صورت اور اس کی اثر انگیزی باقی رہتی ہے۔یہ تحریک آج بھی زندہ ہے اور اس سے نظریاتی طور پر وابستہ ادیبوں کی خاصی تعداد بھی موجود ہے۔

یوں بھی انسان دوستی کا نظریہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ مظلوم و بے کس کی حمایت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ ظالموں اور استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز ہمیشہ اُٹھتی رہے گی۔ شاعر اور ادیب ہمارے سماج کا سب سے حساس طبقہ ہے۔ معاشرے میں ہونے والی کوئی ناانصافی اُنہیں پریشان کردیتی ہے اور اپنی پریشانی اور بے چینی کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ گرچہ آج ترقی پسند تحریک کی پہلے جیسی باقاعدہ شکل باقی نہیں ہے لیکن اُس کے پیغامات کو پھیلانے والے ادیب ہر دور میں موجود رہیں گے۔

16.5 افتتاحی کانفرنس کی اہم تقریریں

ترقی پسند تحریک کو سمجھنے کے لیے اپریل 1936ء میں منعقدہ افتتاحی کانفرنس میں پریم چند کی صدارتی تقریر کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اُسی موقع پر مولانا حسرت موہانی نے جو تقریر کی تھی اُسے بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان دو خطابات سے ہمیں اس تحریک کی روح تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ ذیل میں ان دونوں ادیبوں کی تقریریں آپ کے مطالعے کے لیے پیش کی جا رہی ہیں:

پریم چند کا صدارتی خطبہ:

حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طورپر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی تھی یہاں تک کہ اُردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات و جذبات پر اثرڈالنا نہیں بلکہ زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غورکریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف معراج کمال تھی اب اس قابل ہوگئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی' اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ ہم جس دور سے گزرے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بناکر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی' کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندرکانتا ستونتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلائو تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے'زندگی زندگی۔ دونوں متضاد

چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انہیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش یا نئی پرداز کا ہونا داد پانے کے لیے کافی تھا چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔

لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات او ر ان سے پیدا ہونے والے دردویاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو ہماری ذہنی اور جسمانی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانے کے لیے فخر کا باعث نہیں ہوسکتا اورنہ اس کے مذاق صحیح کی شہادت دے سکتا ہے۔جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس شکوۂ روزگاراور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود و انحطاط کا شکار ہوچکی ہے اور اس میں سعی و اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجات عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور مشاہدے کی قوت غائب ہوگئی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی ،معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے لیکن اگر اساڑھ میں آسمان پر شفق چھاجائے تو وہ خوشی کا باعث نہیں ہوسکتی کیوں کہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔

ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہماراآرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قایم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں،حسرتوں اور تمنائوں ،چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سرائوں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا،الفاظ کی ترکیبوں کا ، خیالات کی بندشوں کا،زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

ہماراآرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سردھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا ، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا تو اسے اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا:

دردشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آورا ے ہمت مردانہ

یا

چوموج ساز وجودم زسیل بے پرداست

گماں مبرکہ دریں بحرساحلے جویم"

یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہوجائے گی۔جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔وہ کسی خاص طبقہ تک محدود نہ ہوگا۔اس کی پرواز کے لیے محض باغ کی چاردیواری نہ ہوگی بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہو۔تب ہم بدمذاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لیے سینہ سپر ہوجائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کرسکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کرکے خاموش نہ ہوجائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق' خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔اس کا مرتبہ اتنا نہ گرایئے۔وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایسا کوئی علمی 'معاشی'تاریخی'اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو۔اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبعیت اور رواں قلم ہی ادب کے لیے کافی ہے۔ہماری ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑے گا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابل قدر خدمت کر سکے۔تاکہ جماعت میں اسے وہ درجہ ملے جو اس کا حق ہے۔تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے۔ہم دوسری زبانوں اور ادبوں کے دسترخوان کے جھوٹے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیے۔

ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہوسکے اور نشوونما پاسکے۔ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں ، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں جب بھی وہ فضا تیار ہوگی ، جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا۔ہم ہر صوبے میں 'ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں قائم کرناچاہتے ہیں تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔

یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات روزگار نے پہلے سے کر رکھی ہے۔جابجا اس کے انکھوے بھی نکلنے لگے ہیں۔اس کی آبیاری کرنا' اس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔

ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت 'ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی۔

حسرت موہانی کی تقریر:

ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہیے۔ اسے مزدوروں' کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرناچاہیے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ' ان کی بہترین خواہشوں اور تمنائوں کا اظہار اس طرح کرنا چاہیے، جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد و منظم ہو کر اپنی جدوجہد کو کامیاب بناسکیں۔

محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انہیں خیالات کی ترویج کرنا چاہیے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ جب میں ادیبوں کے سامنے یہ نصب العین پیش کر رہاہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی لیکن آپ کو اس کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر اسی لیے آیاہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرفداری اور حمایت کا اعلان کروں جو آپ نے اپنے اعلان نامے میں لکھے ہیں۔ میں چاہتاہوں کہ ہمارے ملک میں اسی قسم کے ادب کی تخلیق ہو۔ پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خو د اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا۔ (روشنائی، سجاد ظہیر ص112)

16.6 اہم مصنفین

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کے ادبی سرمائے سے واقفیت کے لیے اُن سے متعارف ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اہم شعرا اور فکشن نگاروں کے تعلق سے آپ آئندہ اکائی میں مطالعہ کریں گے مگر چند نام ابھی سے ذہن نشین کرلیجیے۔ ترقی پسند شعرا میں سلام مچھلی شہری' اخترانصاری' اسرار الحق مجاز' معین احسن جذبی' فراق گورکھپوری' فیض احمد فیض' مخدوم محی الدین' علی سردار جعفری' کیفی اعظمی' جاں نثار اختر' ساحر لدھیانوی' مجروح سلطانپوری اور اخترالایمان شامل ہیں۔ فکشن نگاروں میں پریم چند' کرشن چندر' حیات اللہ انصاری' سعادت حسن منٹو' راجندر سنگھ بیدی ' عصمت چغتائی' اپندرناتھ

اشک'عزیز احمد' اختراورینوی' احمدندیم قاسمی' دیوندرستیارتھی' خواجہ احمد عباس' ابراہیم جلیس' کنہیا لال کپور اور بلونت سنگھ وغیرہ اہم نام ہیں۔ آیئے یہاں ہم بعض دیگر ادیبوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سجاد ظہیرایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ ناقد ' ڈرامہ نگار یا ناول نگار سے کہیں زیادہ ایک جہد کار تھے۔اُن کے بارے میں آپ یہ جان چکے ہیں کہ وہ لندن میں زیرتعلیم اُن طلبا میں شامل تھے جنہوں نے وہیں سے ہندوستان کے لیے ترقی پسند تحریک کا خواب دیکھا تھا۔سجاد ظہیرکو ترقی پسند تحریک کے روح رواں بلکہ میرکارواں کی حیثیت حاصل ہے۔وہ اپنے بالکل ابتدائی دور ہی سے اشتراکی نظریے کے قائل تھے اور جیسے ہی اُنہیں موقع ملا عملی طور پر اُس میں حصہ لینے لگے۔اُن کا ناول "لندن کی ایک رات" بہت ہی اہم ناو ل تسلیم کیا جاتا ہے جس میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اور اُن نوجوانوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو ہندوستان سے بغرض تعلیم لندن جاتے ہیں اور وہاں کی ترقی و خوشحالی اُن کی آنکھیں خیرہ کردیتی ہے۔ساتھ ہی ان طالب علموں کو سرمایہ دارانہ نظام سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔چونکہ طلبا میں ہر طرح کے نوجوان ہوتے ہیں جن کے عادات و اطوار اور فکری میلان مختلف ہوتے ہیں لہٰذا ناول میں بھی ایسے ہی مختلف النوع طلبا موجود ہیں۔سجاد ظہیرکے ادبی سرمایے میں رپورتاژ "یادیں" اور ایک کتاب "ذکر حافظ" مشہور ہے۔اُنہوں نے کئی تنقیدی مضامین بھی لکھے لیکن اُن کی بنیادی شناخت ترقی پسند تحریک کے میرکارواں کی حیثیت سے قائم ہے۔آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کے رُکن بنے۔وہیں 1973 ء میں73 برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

"ادب اور زندگی " کے مصنف مجنوں گورکھپوری نے ترجمے کیے اور افسانے بھی لکھے لیکن وہ ایک ممتاز ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔نظریاتی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن اُن کی تنقید ابتدا میں تاثراتی نوعیت کی تھی اور بالکل آخری دور میں اُنہوں نے سائنٹفک تنقید کی۔وہ ترقی پسندی میں ضرورت سے زیادہ نعرے بازی اور پروپیگنڈے کو ناپسند کرتے تھے۔اُنہوں نے ادب میں ہمیشہ ادبی شان کی تلاش کی کوشش کی۔اُن کی دیگر معروف کتابوں میں غالب شخص اور شاعر' نکات مجنوں اور تنقیدی حاشیے شامل ہیں۔مجنوں گورکھپوری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے لیکن وہ بھی بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے جہاں 84 سال کی عمر میں 1988 ء میں کراچی میں انتقال کرگئے۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سید احتشام حسین ایک انتہائی اہم نام ہے۔وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر تھے۔وہ تاعمر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ' تنقیدیں لکھتے رہے اور جہاں کہیں تحریک ' انجمن یا اُس سے جڑی ہوئی کسی شخصیت پر کوئی سوال کھڑے کرتا ' اُس کے جواب دیتے رہے۔مارکسزم اُن کی زندگی کا حصہ تھاجس سے اُنہوں نے ذرہ بھر بھی روگردانی نہیں کی۔اُن کی باوقارشخصیت اور تحریر ' دونوں ہی نرمی و مروت' اخلاص و ہمدردی اور اعتدال سے عبارت تھی۔اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔گرچہ وہ اُردو کے اُستاد تھے لیکن فلسفہ' تاریخ' معاشیات اور عالمی شکست و ریخت پر

بھی اُن کی گہری نظر تھی۔اُنہیں فنون لطیفہ اور تہذیب و تمدن سے خصوصی لگاؤ تھا۔اُن کی تحریروں میں ان تمام شعبہ ہائے علم سے استفادہ ہوتا ہے۔پروفیسر احتشام حسین کے ادبی نظریے کو سمجھنے کے لیے اُن کے پہلے مجموعہ مضامین ”تنقیدی جائزے“ سے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

”آج کل ادب تعبیروں کی کثرت سے خواب پریشاں بُن رہا ہے۔غور و فکر کا زمانہ ہے۔آزادی رائے کو اہمیت دی جا رہی ہے۔علوم و فنون چند لوگوں کے ملک سمجھے جاتے تھے۔اب اس اجارہ داری کا دور ختم ہو رہا ہے اور ہر شخص سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔۔۔اصول اور بے اصولی، ترقی پسندی، مقصدیت اور لذت اندوزی کے تصورات میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔افسوس یہ ہے کہ یہ جنگ حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز سے ہٹ کر بعض حالتوں میں بالکل غیر علمی اور جذباتی بن گئی ہے۔۔۔میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔۔۔اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اسے اُبھارنے میں مدد ملتی ہے۔اس طرح عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔۔۔نہ قدیم ادب میں سب کچھ اچھا ہے اور نہ جدید میں سب کچھ برا۔نہ پرانے ادب میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں اور نہ نئے ادب کا ہر لفظ قابل تعریف بلکہ جس طرح پرانے ادب میں مواد اور صورت کے میل سے پرانے مرقعے تیار ہوئے ہیں اسی طرح نئے ادب میں بھی الفاظ اور خیالات کی مدد سے دل کی بات کہی جاتی ہے۔“

پروفیسر احتشام حسین کی بیشتر تحریروں میں اُن کے درج بالا خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔تنقیدی جائزے کے علاوہ اُن کی دیگر معروف کتابوں میں روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، ذوق ادب اور شعور، افکارومسائل، عکس اور آئینے، اعتبار نظر اور اُردو ادب کی تنقیدی تعریف شامل ہیں۔احتشام حسین 1912ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ 1972ء میں الہ آباد میں اُن کا انتقال ہوا۔

16.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ترقی پسند تحریک کی بنیادلندن میں رکھی گئی۔یہ 1930ء کی بات ہے۔اس وقت ہندوستان کے چند نوجوان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے ہوئے تھے۔
- ان نوجوانوں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پر مود سین گپتا، جیوتی گھوش تھے۔انہوں نے پہلی بار ملک کے سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی و جستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر اور تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہندوستانیوں کو پستی غلامی، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی۔

- اس گروہ نے انڈین پروگریسیورائٹر ز ایسوسی ایشن بنائی ' بعد میں مینی فیسٹو بنایا اور ہندوستا ن میں باقاعدہ ماحول تیار کیا۔اِس ماحول کا خمیر عالمی سطح پر ہونے والی شکست و ریخت سے بھی تیار ہوا جن میں انقلاب روس اور پہلی جنگ عظیم شامل ہیں۔
- ہندوستان میں انگریزوں کی ظلم و زیادتی اور ملک کی تحریک آزادی نے بھی ترقی پسند ذہن کو فروغ دیا۔
- 1932 ء میں سجاد ظہیر کے شائع کردہ دس تخلیقات پر مشتمل اُس مجموعے نے بھی ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی جس کا نام ''انگارے'' تھا۔اُس میں شامل 9 افسانے اور ایک ڈرامے نے ادیبوں کی ذہن سازی کی۔
- البتہ اپریل1936 ء میں اس تحریک کا باقاعدہ آغازایک یادگار اور تاریخی کانفرنس سے ہوا جس میں پریم چند نے صدارتی خطبہ دیا۔
- اس کانفرنس کے بعد ہی اس تحریک نے اپنی منظم صورت اختیار کی اور معروف شاعروں ' ادیبوں نے اس کی سرپرستی کی۔ان میں پریم چند ' مولوی عبدالحق ' حسرت موہانی ' جوش ' فراق' فیض ' سجادظہیر' محمد حسن' قمررئیس وغیرہ کے نام اہم ہیں۔
- الہٰ آباد، حیدرآباد' لکھنو'جے پور رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اور سیمنار ہوتے رہے۔اور اس طرح اس تحریک نے تنظیمی وعلمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی ،لیکن 1947 کے بعد یہ تحریک تعطل اور انتشار کی شکار ہوگئی اور آٹھویں دہائی کے آتے آتے یہ تحریک تحلیل ہوچکی تھی۔
- البتہ تحریک کے اثرات اور اُس کے پیغامات اب بھی باقی ہیں اور مختلف شعرا و ادبا کے توسط سے اُن کا اظہار ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

16.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
تحریک	:	کسی بات کو شروع کرنا
تحلیل	:	اپنی شکل کھودینا' گھل جانا
محاسبہ	:	حساب' تجزیہ
حقائق	:	حق کی جمع
اجتماعی	:	مل جل کر
عدم	:	نہیں
منظم	:	انتظام کے ساتھ' باقاعدہ

از سرنو	:	نئے سرے سے
تخلیق	:	خلق کی گئی، پیدا کی گئی
خمیر	:	مزاج، فطرت
توانا	:	طاقتور، مضبوط
تعطل	:	بیکار ہونا، بند ہو جانا یا رک جانا

16.9 نمونۂ امتحانی سوالات

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(a) محمد حسن (b) انور سدید (c) عتیق اللہ (d) خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ''انگارے'' کی اشاعت کب عمل میں آئی؟

(a) 1932 (b) 1930 (c) 1928 (d) 1925

3۔ روس میں انقلاب کس سنہ آیا؟

(a) 1915 (b) 1917 (c) 1919 (d) 1921

4۔ پہلی عالمی جنگ کب ہوئی؟

(a) 1900 (b) 1910 (c) 1914 (d) 1920

5۔ ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟

(a) 1936 (b) 1940 (c) 1945 (d) 1950

6۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرس کہاں منعقد ہوئی تھی؟

(a) لکھنؤ (b) الہٰ آباد (c) ممبئی (d) کلکتہ

7۔ " ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں۔" کس نے کہا؟

(a) سجاد ظہیر (b) احمد علی (c) پریم چند (d) محمود الظفر

8۔ "انگارے" میں سجاد ظہیر کے کتنے افسانے شامل تھے؟

(a) پانچ (b) چار (c) تین (d) دو

9۔ "ادب اور زندگی" کس کی تصنیف ہے؟

(a) آنند نارائن ملا (b)حسرت موہانی (c)مجنوں گورکھپوری (d)احتشام حسین

10۔ احتشام حسین کا تعلق کس تحریک سے تھا؟

(a)علی گڑھ تحریک (b)ترقی پسند تحریک (c)حلقہ اربابِ ذوق (d)رومانوی تحریک

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ آزادیٔ ہند کے بعد ترقی پسند تحریک کا محاسبہ کیجیے۔

3۔ "انگارے" کا تعارف کرائیے اور ترقی پسند تحریک پر اس کے اثرات کے تعلق سے گفتگو کیجیے۔

4۔ ترقی پسند تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کے صدارتی خطبے کا خلاصہ لکھیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک کے اہم مصنفین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

3۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی
2۔	ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری	یعقوب یاور
3۔	نیاز حیدر، شخصیت اور شاعری	ظفرالدین

16.9.1 کے جوابات: 1۔d 2۔a 3۔b 4۔c 5۔a

6۔a 7۔c 8۔a 9۔c 10۔b

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات : ۷۰ Marks: 70   وقت: 3 گھنٹے Time :3hours

ہدایات :

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات/خالی جگہ پُر کرنا/مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ہر سوال کے لیے 1نمبر مختص ہیں۔ **(1x10= 10Marks)**

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ہر سوال کے لیے 6نمبرات مختص ہیں۔ **(5x6=30 Marks)**

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ہر سوال کے لیے 10نمبرات مختص ہیں۔ **(3x10=30 Marks)**

حصہ اول

سوال : 1

(i) ’’اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام‘‘ کس کی تصنیف ہے؟

(a) مولوی عبدالحق (b) سرسید (c) سید عبداللہ (d) مالک رام

(ii) مشہور کتاب’’ پنچ تنتر‘‘ کا تعلق ذیل میں کس قسم کے ادب سے ہے ؟

(a) اخلاقی ادب (b) سائنسی ادب (c) قانونی ادب (d) مذہبی ادب

(iii) ’ہندوستانی لسانیات‘ کس کی تصنیف ہے؟

(a) مسعود حسین خاں (b) نصیرالدین ہاشمی (c) قادری زور (d) سید سلیمان ندوی

(iv) ’’اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے‘‘ یہ کس کا قول ہے؟

(a) میر امن (b) محمد حسین آزاد (c) حکیم شمس اللہ قادری (d) سرسید احمد خاں

(v) مغربی ہندی میں کتنی بولیاں شامل ہیں ؟

(a) پانچ (b) سات (c) تین (d) بارہ

(vi) دارالترجمہ کہاں قائم کیا گیا؟

(a) کلکتہ (b) حیدرآباد (c) دہلی (d) مدراس

(vii) اردو کی پہلی مثنوی کونسی ہے ؟

(a) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (b) قطب مشتری (c) مثنوی نوسرہار (d) گلشن عشق

(viii) ماسٹر رام چندر کا تعلق کس کالج سے تھا؟

(a) فورٹ ولیم کالج (b) عثمانیہ کالج (c) دہلی کالج (d) فورٹ سنٹ جارج کالج

(ix) "اصلاح زبان کی تحریک" کس نے شروع کی تھی؟

(a) ناسخ (b) آتش (c) مصحفی (d) انشاء

(x) فورٹ ولیم کالج کب کائم کیا گیا؟

(a) 1800 (b) 1600 (c) 1625 (d) 1825

حصہ دوم

2۔ اردو کے ہند آریائی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

3۔ قطب شاہی دور کے شعروادب پر اظہار خیال کیجیے۔

4۔ کسی دو شاعروں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1۔ حسن شوقی 2۔ شاہی 3۔ نصرتی 4۔ ہاشمی

5۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں فرق واضح کریں۔

6۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت کیوں ہے؟ بیان کیجیے۔

7۔ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

8۔ جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

9۔ مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال "پر مختصر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10۔ ارد وزبان کے آغاز کے بارے میں مسعود حسین خاں کے نظریے کا خلاصہ پیش کیجیے۔

11۔ شمالی ہند میں اردو ادب کے تہذیبی و سماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

12۔ اردوادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

13۔ ولیؔ کے حالات زندگی اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

14۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

اہم نکات